حیدر آباد
کا
عروج و زوال
Fazal
بدر شکیب

... اب ...
... دار سے ... زوال
کی ... مل تاریخ ہے لیکن
سقوط ... ر آباد کے واقعات
جس شرح و بسط کے ساتھ
اور جس بیباکانہ انداز میں
بیان کئے گئے ہیں وہ کسی
اور کتاب میں نہیں مل سکتے -
مصنف جن کا شمار اتحاد المسلمین
کے صف اول کے قائدین میں
تھا ... واقف حال اور
... حیثیت سے
... لل کو تفصیل
... ہے جو حیدرآباد
کی ... ہی کا باعث
ہوئے -

حیدر آباد کا سقوط اس
برصغیر کا ایک المیہ ہے -
حکومت برطانیہ کے یار وفادار
آصف سابع کی خوش فہمی
اور برسر اقتدار سیاسی قائدین
کی کج روی نے جس طرح
مل جل کر اس المیہ کو
اختتام تک پہنچایا وہ ایک
درس عبرت ہے آئندہ نسلوں
کے ... -

... توط حیدر آباد
پر ... دستاویز اور
... ایک بہترین
... -

... دشاہ حسین

حیدرآباد
کا
عروج و زوال

بدر شکیب
(ایڈوکیٹ)
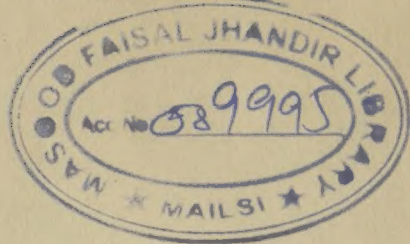
بار اول ۱۹۶۴ء
تعداد .... ایک ہزار
کتابت .... احمد ولی الدین حیدرآبادی
طباعت .... انجمن پریس لارنس روڈ کراچی

قیمت دس روپیئے

ناشران

عثمانیہ اکیڈمی

۱/۴۱۹ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی ۵

انتساب

حیدرآباد کے عروج و زوال کی داستان اس مردِ حق آگاہ کے نام معنون کی جاتی ہے جس نے دو سو سال قبل سلطنتِ آصفیہ کے قیام اور سقوط کی پیش گوئی کی تھی ۔

[جب آصف جاہ اول صوبہ داری پر مامور ہو کر آخری مرتبہ دکن آرہے تھے تو برہان پور اور خلدآباد کے درمیانی علاقہ میں ایک خدارسیدہ بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ اتفاقاً بھوک محسوس ہوئی، بزرگ نے انھیں کھانے کے لئے کلچے مرحمت فرمائے ۔ ابھی آصف جاہ ساتواں کلچہ ختم نہ کر پائے تھے کہ طبیعت سیر ہوگئی ۔ پانی پی کر جب یہ رخصت ہونے لگے تو بزرگ نے انھیں ایک ڈنڈا عطا کیا اور فرمایا کہ خاندانِ آصفجاہی میں بس سات پشت تک حکمرانی رہے گی ۔ کہا جاتا ہے کہ پرچم آصفی میں ڈنڈے اور کلچہ کا نشان اسی واقعہ کی یادگار تھا ۔]

بدر شکیب

— ★ —

نقشہ ریاست حیدرآباد
ریلوے
دریا
سڑکیں
علاقہ جات مفوضہ
پیمانہ ا" = ۶۴ میل
نظام آباد
آصف آباد
کریم نگر
ورنگل
حیدرآباد
نارکٹ پلی
محبوب نگر
ویلور
مسولی پٹم
خلیج بنگال
بحر ہند

اورنگ آباد
جالنہ
پربھنی
بیڑ
عثمان آباد
نلدرگ
بارسی
شولاپور
بیدر
ظہیرآباد
گلبرگہ
کرشنا
بلاری
اننت پور
صوبۂ بمبئی
بحیرۂ عرب

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!

اقبالؒ

فہرستِ مضامین

حصۂ دوم۔ اتحاد المسلمین کے صدور

ضمیمہ

دیباچہ

حیدرآباد کو ختم ہوئے پندرہ سال گذر گئے۔ اس طویل مدّت میں دلوں کے وہ سارے زخم بھی پُرانے ہو گئے جو ہندوستان کی اس عظیم الشان اسلامی سلطنت کے تباہ ہونے سے پہنچے تھے۔ غم و غصّہ، نفرت و حقارت اور انتقام کے وہ سارے جذبات جو تباہ کرنے اور تباہی کو دعوت دینے والوں کے خلاف دلوں میں موجزن تھے وہ بھی دب گئے۔ واقعات اور حقائق کی تصویر ساری آلائشوں سے پاک، وصاف آنکھوں کے سامنے ہے لیکن اپنے صحیح خط و خال میں ابھی تک منظرِ عام پر نہ آئی۔ سقوط کے بعد ہی کئی ذہنوں میں حیدرآباد کی تباہی کی داستان لکھنے کا خیال پیدا ہوا تھا لیکن یہ کوشش اس وجہ سے قبل از وقت سمجھی گئی کہ سقوط کے زمانہ کی سیاست میں حصّہ لینے والے بعض اہم کردار خصوصاً حیدرآباد کے آخری وزیر اعظم اور ان کی کابینہ کے وزرا انڈیا یونین کے حکم پر قید تھے اور قائد قوم سید محمد قاسم رضوی ایک تعزیری جرم میں سات سال قید بامشقت کی سزا کاٹ رہے تھے۔ بسنہ ۱۹۵۰ء میں میر لائق علی وزیر اعظم اور سنہ ۱۹۵۲ء تک ان کے ساتھی وزرا بخیر و خوبی کراچی پہنچ گئے اور کچھ عرصہ بعد قاسم رضوی نے بھی جیل سے رہا ہونے کے بعد پاکستان ہجرت کی۔ ان لوگوں سے یہ توقع تھی کہ وہ حیدرآباد کے سقوط کے واقعات پر روشنی ڈالیں گے اور دنیا کو ان کے نقطۂ نظر اور ان کی ناکامی کے اسباب سے واقف ہونے کا موقع ملیگا۔ جب یہ توقعات پوری ہوتی نظر نہیں آئیں تو میں نے ہمّت کی اور سنہ ۶۲ء کے

اوائل میں زیر نظر کتاب مکمل کرلی۔ اس کی اشاعت کی ابھی نوبت نہیں آئی تھی کہ ستمبر ۱۹۶۲ء میں حیدرآباد کے سابق وزیر اعظم میر لائق علی کی کتاب "ٹریجڈی آف حیدرآباد" کے نام سے شائع ہوئی۔

لائق علی کی کتاب درحقیقت حکومت حیدرآباد کے اُس موقف کو حق بجانب قرار دینے کی پہلی کوشش ہے جس کے نتیجہ میں حیدرآباد کا سقوط عمل میں آیا اور وہ حیدرآباد کے خاتمہ کے پورے پندرہ سال بعد زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس اثناء میں اس مسئلہ پر متعدد کتب ہندوستان اور انگلستان سے شائع ہوئیں جو یقیناً لائق علی کے مطالعہ میں آئی ہوں گی لیکن اُن کی کتاب پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب (ان کے بیان کے بموجب) ۱۹۵۰ء کے قبل ہی زمانہ نظربندی میں مکمل کرلی تھی اور بعض مصالح کی بنا پر اب تک شائع نہ کرپائے تھے یا یہ کہ دوسروں کے نقطۂ نظر اور استدلال کو انھوں نے درخور اعتنا ہی نہ سمجھا کہ ان کا جواب دیا جائے۔ موخرالذکر صورت میں لائق علی اپنے نقطۂ نظر میں اسی وقت حق بجانب ہوسکتے تھے جبکہ حیدرآباد کی حکومت کے خلاف کسی قسم کا الزام عائد ہی نہیں ہوتا اور حیدرآباد کے سقوط کے ذمہ دار نظام اور تنہا نظام ہوتے۔ آخر وقت تک جبکہ حیدرآباد کی تباہی میں کوئی کسر باقی نہ تھی نظام نے اپنی حکومت کی کسی تجویز کو نامنظور نہیں کیا۔ تاج برطانیہ کی طرح جو حکومت کا سربراہ تو ہوتا ہے لیکن اس پر حکومت کی غلطیوں کی کوئی ذمہ داری عاید نہیں کی جاسکتی نظام پر بھی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی کیونکہ بادشاہ کے متعلق یہ تصور ہے کہ وہ غلطی نہیں کرسکتا اگر لائق علی کی حکومت بادشاہ کے کسی عمل کو ملک کے اجتماعی مفاد کے منافی سمجھتی تھی تو اپنے آپ کو اس الزام سے بری قرار دینے کے لئے وہ بہت قبل استعفا پیش کرسکتی تھی جو نہیں کیا گیا۔ حیدرآباد میں شخصی حکومت ہونے کی وجہ سے

بظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ ساری ذمہ داری والیٔ ملک کی ہے۔ اس سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ واقعات اور حقائق سے دراصل ذمہ داری کا تعین ہوتا ہے بشرطیکہ یہ صحیح طور پر پیش ہوں۔

لائق علی کی کتاب سے یہ تاثر بھی پیدا ہوتا ہے کہ گفت و شنید کے معاملہ میں وہ پوری طرح آزاد تھے، بعض معاملات میں نظام یا اپنی کابینہ کے مشورہ کے بغیر وہ آگے بڑھے ہیں جیسے ذمہ دارانہ حکومت کا قیام اور استصواب رائے عامہ کا مسئلہ تھا اور بعد میں انھوں نے نظام اور اپنی کابینہ کو اپنا ہم خیال بھی بنا لیا اتنے سارے اختیارات حاصل ہونے کے بعد گفت و شنید کی ناکامی کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینا تعجب خیز معلوم ہوتا ہے۔ یہی ناکامی حیدرآباد کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ گفت و شنید کی حد تک حکومت اور قیادت میں ہم آہنگی تھی۔ ایسی صورت میں نظام پر تنہا حیدرآباد کی تباہی کی ذمہ داری کس طرح عائد ہو سکتی ہے؟

کسی واقعہ کو اس کے وقوع پذیر ہونے کے پندرہ سال بعد اگر بیان کرنے کی نوبت آئے تو واقعات اور حقائق کو بلا کم و کاست پیش ہونا چاہیئے ان کی پردہ پوشی کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کی جا سکتی۔ اتنے عرصہ کے بعد بھی لوگ اگر اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کو چھپا کر اپنے اعمال کے جواز پر اصرار کرنا ضروری سمجھیں تو وہ ایسے گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں جو معافی کے قابل نہیں بعض حلقوں کی جانب سے اس امر پر اصرار کیا جاتا ہے کہ حیدرآباد کی حکومت اور وہاں کی قیادت نے اپنی ساری توجہات اور صلاحیتیں حیدرآباد کی آزادی کے تحفظ میں صرف کی تھیں لیکن آخر زمانہ میں نظام کی غلط روش سے حکومت اپنے مقصدِ عظیم کے حصول میں ناکام ہوئی اور بالآخر اس کو مستعفی ہونا پڑا اس سے بڑھ کر غلط بیانی اور کیا ہو سکتی ہے۔

لائق علی کی کتاب کے بعد میں سمجھتا تھا کہ میری کتاب کی اشاعت کی ضرورت نہ ہوگی کیونکہ حیدرآباد کی سب سے ذمہ دار شخصیت کے قلم اٹھانے کے بعد کسی اور شخص کا اس مسئلہ پر لکھنا تضیع اوقات ہے۔ لیکن اس کتاب کے پڑھنے کے بعد میں نے اور حیدرآباد کے بعض اہل الرائے اصحاب نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ حیدرآباد کا مسئلہ سلجھنے کی بجائے اور بھی اُلجھ گیا۔ اسی لئے واقعات اور حقائق کی صحیح تصویر کی نقاب کشائی ضروری خیال کی گئی۔ زیرِ نظر کتاب میں اِسی چیز پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، واقعات کے پیش کرنے میں کسی سے بھی رعایت نہیں برتی گئی۔

حیدرآباد کی سیاست میں بہادر یار جنگ کے عروج کے زمانہ سے مجھے بھی ان کے ایک رفیق کی حیثیت سے حصہ لینے کی سعادت حاصل رہی ہے۔ بہادر یار جنگ، ابوالحسن سید علی اور مولانا مظہر علی کامل کے دورِ صدارت اتحاد المسلمین میں ان کی مجلسِ عاملہ میں مسلسل شریک رہنے اور اتحاد المسلمین کی پالیسیوں کی تشکیل میں اپنا حق ادا کرنے کا نہ صرف موقع ملتا رہا بلکہ آخر وقت تک اتحاد المسلمین کی مجلسِ شوریٰ کی رکنیت بھی قائم رہی۔ اس طرح حیدرآباد کی سیاست میں نہ صرف عملی حصہ لینے بلکہ اس زمانہ کی سیاست کے ہر نشیب و فراز سے ذاتی طور پر واقف ہونے اور قائدین اور ارکان حکومت سے گہرے روابط قائم رکھنے کا موقع بھی حاصل رہا۔ اس لحاظ سے مجھے حیدرآباد کے سقوط کی واردات کو ایک شاہد عینی کی حیثیت سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ چنانچہ ان ہی مشاہدات کو قلمبند کر کے زیرِ نظر کتاب کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

حیدرآباد کی تباہی میں جماعتیں اور شخصیتیں سب ہی یکساں شریک ہیں جس میں اتحاد المسلمین سب سے پیش پیش ہے۔ اس لحاظ سے اتحاد المسلمین کے سارے ارکان پر بھی اس کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے اس لئے اس الزام سے مصنفِ کتاب ہذا بھی اپنے آپ کو بری نہیں سمجھتا۔ اب چونکہ حیدرآباد کا مسئلہ باقی نہیں رہا اور

نہ اس نام کی مملکت دنیا کے نقشہ پر موجود ہے اس لئے ہر قسم کے تعصب اور جانبداری
کو الگ کر کے اصلی تصویر کو اس کے صحیح خط و خال میں پیش کرنا اور تاریخی نقطۂ نظر سے
حیدرآباد کی تباہی کے اسباب و علل کا پتہ لگانا ضروری ہے تاکہ آئندہ نسلیں رائے
قائم کرنے میں غلطی نہ کر سکیں حیدرآباد کے سقوط کی اس داستان میں اہل بصیرت
کے لئے بہت سبق پنہاں ہیں۔ اس کتاب میں جس نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا ہے وہ میرا
اپنا انفرادی ہے جس سے کسی جماعت یا اشخاص کا تعلق نہیں ہے۔ واقعات کے
تجزیہ کرنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے میں شخصیتوں سے بالعموم تعلق پیدا ہو ہی
جاتا ہے اور ان کے کردار و اعمال کو بیان کر کے ان کی غلطیوں یا ان کی غلط روش
کو آشکار کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جس کے بغیر حقیقت نگاری جو تاریخ نویسی کا
اہم جزو ہے، نا ممکن ہے۔ اس کتاب میں قائدین اور شخصیتوں سے بحث کرتے وقت
اور ان پر قوم کی غلط رہبری کی ذمہ داری عائد کرتے ہوئے حالات اور واقعات کو پوری
طرح پیش نظر رکھا گیا ہے اور اپنے ذاتی جذبے کو اثر انداز ہونے کا موقع نہیں دیا گیا۔
ان قائدین اور شخصیتوں کی عظمت و وقار کا دل پر آج بھی وہی نقش ہے جو حیدرآباد میں
تھا اور ان کی عزت و توقیر میں آج بھی میرے نزدیک کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ ان
ہستیوں کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا وہ بالکلیہ خلوص اور نیک نیتی پر مبنی ہیں۔

ایک عرصۂ دراز سے میں نے مواد جمع کرنا شروع کر دیا تھا اور اپنی یادداشتیں بھی
تازہ کر رہا تھا سقوطِ حیدرآباد کے موضوع پر جتنی بھی کتابیں ہندوستان اور انگلستان
میں شائع ہوئیں وہ سب کی سب میرے پیش نظر ہیں۔ کتاب لکھنے کو تو میں نے لکھ دی
لیکن لکھنے کے بعد اس شش و پنج میں مبتلا رہا کہ آیا اس کو فوری شائع کیا جائے یا چندے
انتظار کیا جائے۔ چنانچہ حیدرآباد کی سیاست پر گہری نظر رکھنے والے بعض اصحاب کو
جو اپنی اصابت رائے اور تبحر علمی کی وجہ سے بھی مشہور ہیں، مسودہ کے مطالعہ کی میں نے

زحمت دی تاکہ ان کے زریں آراء کی روشنی میں اشاعت کا فیصلہ کیا جائے جن پانچ سات حضرات نے مسودہ پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور اس کے ایک ایک لفظ کو پڑھا ہے اور اس کے بعد ان لوگوں نے جو رائے دی ہے وہی در اصل میری اس محنت کا ثمر ہے۔ اگر ان کی یہ حوصلہ افزائیاں میرے شریک حال نہ ہوتیں تو کتاب کبھی شائع نہ ہوتی۔

کتاب دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ حصّۂ اول اپنی جگہ مکمل ہے اور حیدرآباد کے سقوط تک سارے واقعات اس میں آگئے ہیں۔ حصۂ دوم میں اتحاد المسلمین اور اس کے چاروں صدور کے تفصیلی حالات پیش کئے گئے ہیں۔ چونکہ راقم الحروف کو اتحاد المسلمین کے احیاء جدید کے بعد پہلے تین صدور کی مجلس عاملہ میں مسلسل کام کرنے کا موقع ملا ہے اس لئے ذاتی علم اور قریب سے مشاہدہ حصہ دوم کے ماخذ ہیں ایک طرح یہ درون خانہ کی باتیں ہیں جن کے اظہار کے بغیر سارا پس منظر واضح نہیں ہوسکتا تھا۔ ایک باب اتحاد المسلمین کے وزراء پر ہے اس سے حکومت کے اندر مجلس کا مخصوص نقطہ نگاہ اور لائحہ عمل ظاہر ہوگا۔ اس باب میں انتہائی غیر جانبداری سے واقعات پیش کئے گئے ہیں، ممکن ہے کہیں کہیں حقائق تلخ ہو گئے ہوں اور میرے قدیم کرم فرما سابق وزراء کے طبائع پر گراں گذریں۔ میں پورے خلوص اور احترام کے ساتھ ان سے اپنی غیر ارادی صاف گوئی کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔

آخر میں ایک ضمیمہ "پیراموئنٹسی کے مظاہر" کے عنوان سے شامل ہے جس میں حیدرآباد رزیڈنسی اور حکومت ہند کے محکمہ سیاسیات کی مراسلت درج کی گئی ہے۔ اُسے کتاب کے باب دوم "حیدرآباد سے انگریزوں کے تعلقات" کا تتمہ سمجھنا چاہئے جس سے ہندوستانی ریاستوں پر برطانوی پیراموئنٹسی اور اس کے دائرہ عمل کے

مطالعہ میں بڑی مدد ملتی ہے۔ پیراموئنٹسی ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی انگریزوں نے اپنے دورِ اقتدار میں کبھی تعریف و تشریح کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور معاہدات اور عہد نامہ جات کے خلاف ریاستوں پر اپنی بالادستی کو اس طرح مسلّط کیا کہ کسی ریاست کو دم مارنے کا یارا نہ تھا۔ ہر ریاست کا رزیڈنٹ یا پولٹیکل ایجنٹ نہ صرف اس ریاست میں برطانوی مفادات کا محافظ اور نگہبان تھا بلکہ برطانوی اقتدار اعلیٰ کے کارندہ کی حیثیت سے والیٔ ملک پر اپنا بے پناہ اثر رکھتا تھا۔ وزراء اور کلیدی خدمات پر اس کی ایما اور مرضی کے بغیر کوئی تقرر نہیں کیا جا سکتا تھا جس کے باعث ریاست کے عہدہ داروں کے لئے والیٔ ریاست سے زیادہ رزیڈنٹ سے اپنی وفاداری کو وابستہ کرنے کی نہ صرف ضرورت پڑتی تھی بلکہ اپنے ذاتی اغراض کے حصول کے لئے ریاست کے مفادات کی پائمالی سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا تھا۔

پیراموئنٹسی پر ریاستوں میں کس طرح عمل ہوتا تھا، ایک دلچسپ موضوع ہے اور تفصیل طلب بھی ہے۔ ضمیمہ میں جو کچھ مواد پیش کیا جا رہا ہے وہ ۳۵-۱۹۳۸ء کے زمانہ سے متعلق ہے لیکن بیحد دلچسپ اور معلومات آفریں ہے۔ راز کی یہ نایاب چیزیں کہاں دستیاب ہوتی ہیں لیکن اتفاق سے ایک دوست کے ذریعہ ہمیں یہ کاغذات مل گئے جن کے اصلی ہونے میں ہمیں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہے۔

اس کتاب کے لکھنے میں میں نے جو محنت اٹھائی ہے اس کا احساس میرے احباب میں حبیب اللہ رشدی اور اکبر وفاقانی کو ہے۔ اول الذکر حیدرآباد کے قدیم صحافی اور ثانی الذکر اتحاد المسلمین کی مجلس شوریٰ کے آخر وقت تک رکن تھے۔ ایک اور

صائب الرائے دوست سید بادشاہ حسین ہیں جو حیدرآباد میں سرکاری عہدہ پر مامور تھے اور کراچی میں صحافی کی حیثیت سے کافی روشناس ہیں۔ ان تینوں کی امداد اور مشورہ شامل حال نہ ہوتا تو کتاب شائع بھی نہ ہوتی۔ میں ان تینوں کا ممنونِ احسان ہوں۔

بدر شکیب

مورخہ ۱۰؍ مارچ ۱۹۶۴ء

۲۱۹/۱ پیر الٰہی بخش کالونی کراچی۵

مقدمہ

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے خاتمہ کے بعد حیدرآباد مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی آخری یادگار تھی مسلمانوں کی تہذیب و تمدن، ثقافت و شائستگی، آئین و قوانین اور نظام حکمرانی کی ساری خصوصیتیں اور مغلیہ جاہ و جلال، شان و تمکنت اور دولت و امارت کی ساری روایات حیدرآباد میں محفوظ تھیں، ہندو مسلم اتحاد اور یگانگت کا حیدرآباد بہترین نمونہ تھا۔

مملکت حیدرآباد وسعت اور رقبہ کے لحاظ سے انگلستان کے برابر تھی۔ رقبہ ۸۲ ہزار مربع میل، جملہ آبادی ایک کروڑ ۶۴ لاکھ جس کے منجملہ مسلمان ۲۱ لاکھ پست اقوام ۳۰ لاکھ، ہندو، جین بشمول لنگایت ایک کروڑ، عیسائی ۲½ لاکھ بھیل گونڈ ۷ لاکھ اور سکھ و پارسی دس ہزار کے قریب تھے۔ ہندو اور مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۸۵ اور ۱۵ فیصد تھا۔ ۱۹۴۷ء میں حیدرآباد کی آمدنی ۲۶ کروڑ سالانہ سے زیادہ تھی۔

حیدرآباد کی مادی ترقی، قدرتی وسائل کی فراوانی اور معاشی ذرائع کی

کثرت نے اس کو صوبجات ہند اور ریاستوں میں ایک ممتاز حیثیت عطا کی تھی۔ غذائی معاملہ میں وہ خود مکتفی تھا اور بعض خام اشیاء کی حد تک دنیا کی مشہور منڈیوں میں اس کا شمار کیا جاتا تھا۔ ہندوستان کی ۱۵ فیصد کپاس اور ۴۰ فیصد روغنی اجناس حیدرآباد میں پیدا ہوتے تھے۔ دریاؤں سے نکالی ہوئی نہروں اور دیگر ذرائع آبپاشی کی بہتات کی وجہ سے لاکھوں ایکڑ اراضی سیراب ہوتی تھی۔ قدرتی ذرائع کی فراوانی کے سبب حیدرآباد میں چھوٹی اور بڑی صنعتیں کافی تعداد میں قائم ہوگئی تھیں جن میں سمنٹ، کاغذ اور شکر کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔

شہر حیدرآباد اور مستقرہائے اضلاع میں بڑی مادی ترقیاں عمل میں لائی گئی تھیں اور ملک کی معاشی اور سماجی حالت کی درستی اور مزارعین کی فلاح و بہبود پر حکومت کروڑوں روپیہ خرچ کر رہی تھی۔ شہر حیدرآباد اپنی وسیع سمنٹ کی سڑکوں، ڈرینیج، آبرسانی کے انتظام اور جدید زندگی کی ساری مادی آسائشوں کے اعتبار سے ہندوستان کے بڑے سے بڑے شہر کے مقابلہ میں ایک مثالی اہمیت کا حامل تھا۔ شہر کی آبادی ۱۲ لاکھ تھی جس میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا تناسب برابر تھا لیکن ریاست کے دارالخلافہ اور عہد مغلیہ کی یادگار ہونے کی وجہ سے اس پر اسلامی رنگ غالب تھا۔ اضلاع کی آبادی میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ اندرونی علاقوں اور مواضعات میں مسلمان اور ہندوؤں کے تمدن اور رسم و رواج میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔

حیدرآباد کا نظم و نسق اور نظام عدل گستری کا معیار برطانوی ہند سے بہتر تھا۔ ۱۹۲۲ء میں عدلیہ اور انتظامیہ کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا تھا ملک کے طول و عرض میں عدالتیں قائم تھیں جن پر عدالت العالیہ (ہائی کورٹ)

کا کنٹرول تھا۔ ملک کی اعلیٰ ترین عدالت جوڈیشل کمیٹی تھی جو والئ ملک کے مشیر کی حیثیت سے کام کرتی تھی جو اقتدار کا سرچشمہ تھے۔

حیدرآباد کی سرکاری زبان اردو تھی۔ سارے محکمہ جات سرکاری اور ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ عدالتوں کا کام اردو میں ہوتا تھا۔ حیدرآباد نے اُردو کی جو سرپرستی کی اور اردو کو جو یہاں فروغ حاصل ہوا اس کی ہندوستان میں کہیں مثال نہیں مل سکتی۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام حیدرآباد کا ایک عہدآفریں کارنامہ ہے جس نے اردو کو جامعاتی درجہ عطا کرکے ساری ہندوستان کی زبانوں میں ممتاز کردیا تھا۔ جامعہ کے ملحقہ اداروں میں دارالترجمہ نے دنیا کی مختلف زبانوں کی تقریباً چھ سو معیاری کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جس پر حیدرآباد نے دو کروڑ سے زیادہ رقم خرچ کی تھی۔ حیدرآباد کے نظام تعلیم کو بھی ایک مثالی اہمیت حاصل رہی ہے۔

حیدرآباد ایک اسلامی ریاست تھی اور اس حیثیت سے ہندوستان کی کوئی اسلامی جامعہ، درس گاہ یا ادارہ ایسا نہیں تھا جس نے حیدرآباد سے خوشہ چینی نہ کی ہو۔ ہندوستان کے بیشتر علماء اور فضلاء کو حیدرآباد سے ماہوار وظائف مقرر تھے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے اکثر و بیشتر اداروں کو حیدرآباد سے مالی امداد دی جاتی تھی۔

والئ ملک کے مسلمان ہونے کی وجہ سے مسلمان اقتدار کے حامل بھی تھے۔ بادشاہ کو مسلمان اپنے اقتدار کا مظہر سمجھتے تھے۔ اسی لئے سرکاری ملازمت عام مسلمانوں کا واحد ذریعہ معاش تھی اور ملک کے اکثر کلیدی عہدوں پر مسلمان فائز تھے۔

حیدرآباد کے (۸۲،۶۹۸) مربع میل رقبہ کے منجملہ تقریباً ثلث حصہ (۲۵،۶۲۹) مربع میل جاگیرات پر اور ایک عشر (یا ۱/۱۰) حصہ یعنی (۸۱۰۹) مربع میل صرفخاص پر

مشتمل تھا جو والئ مُلک کی ذاتی مِلک تصوّر کیا جاتا تھا اور جس کی سالانہ آمدنی (۲ ۱/۲) کروڑ تھی۔ جاگیرات اور صرفِ خاص کے یہ علاقے انتظامی نقطۂ نظر سے ریاست کے پست افتادہ علاقے تھے۔ زندگی کی معمولی ضروریات جیسے طبّی امداد، حفظانِ صحت اور تعلیم تک یہاں کی رعایا کو خاطر خواہ میسر نہ تھیں۔ ملک میں جاگیرداروں، معاشداروں، شکمیداروں اور حصّہ داروں کا ایک بڑا طبقہ موجود تھا جس کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہی ہوتا رہتا تھا۔ اس طبقہ کا ملک کی معیشت اور پیدائش دولت میں کوئی حصہ نہ تھا۔ ان کا ذریعہ معاش جاگیر کی آمدنی اور صرف جاگیر کی آمدنی تھا۔ بیکاری اور مفت خوری نے ان میں عیش پرستی، اسراف اور لہو ولعب کی ساری برائیاں پیدا کردی تھیں جو سوسائٹی کو گھن کی طرح کھا رہی تھیں۔ امراء، جاگیردار اور موروثی معاشداروں میں اخلاقی برائیاں پیدا ہوگئی تھیں اور اسراف کی وجہ سے بڑا سا بڑا جاگیردار حتیٰ یہ کہ والئ ملک کی اولاد والاشان تک ساہوکاروں اور مہاجنوں کے پنجوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ جاگیروں کی آمدنیاں تک ان کے پاس مکفول تھیں اور معمولی سی معمولی تقریب بھی مہاجن کے دستِ کرم کے بغیر انجام نہیں پا سکتی تھی۔

سرکاری ملازمتوں میں اعلیٰ ترین عہدوں پر بیس پچیس خاندانوں کا اجارہ تھا۔ ان ہی کی اولاد بالعموم سرکاری وظائف پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے یورپ اور انگلستان جاتی تھی اور وہاں کی زندگی کے طور طریقے سیکھنے کے بعد نئی تمنّاؤں اور ولولوں کے ساتھ حیدرآباد کی حکومت چلانے کے لئے واپس آتی تھی۔ اس میں شک نہیں جو صحیح قسم کے طلبا بیرونِ ملک جاسکے انھوں نے اکتسابِ علم کے بعد صحیح طور پر ملک کی خدمت بھی انجام دی۔ لیکن عام طور پر یورپ زدہ لوگوں میں ایک طبقہ واری احساس پیدا ہوگیا تھا۔ ان میں سے چند نے غیر ملکی عورتوں سے شادیاں بھی کی تھیں اور یہ عورتیں کہیں ترقی کا زینہ بنتی تھیں اور کہیں اسراف کا ذریعہ۔ حکومتی تنخواہیں تو کسی صورت

یں ان شاہ خرچیوں کی متحمل نہیں ہوسکتی تھیں اس لئے آمدنی کا تکملہ بعض صورتوں میں قرض اور رشوت سے کیا جاتا تھا۔

ان عہدیداروں کے مقابلہ میں سیویلینوں کی ایک نئی جماعت ملک میں پیدا ہوگئی تھی جو حیدرآباد سیول سروس کے امتحان مقابلہ کے ذریعہ منتخب ہوتی تھی، امتحان میں شرکت نامزدگی کی بنا پر عمل میں آتی تھی جس میں بطور خاص خاندانی وجاہت کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ انگریز ہندوستان میں انڈین سیول سروس کو اپنے شہنشاہی اغراض کی تکمیل کے لئے وجود میں لائے تھے تاکہ اعلیٰ تنخواہ یافتہ عہدیداروں کی یہ جماعت جن میں اکثریت انگریزوں کی ہوتی تھی ہندوستان کی عام آبادی سے اپنے آپ کو بلند و بالا قرار دے کر برطانوی امپریل پالسی کو کامیابی سے چلا سکے۔ حیدرآباد کے سیویلین طبقہ نے بھی انڈین سیول سروس کی ساری روایات کو اپنا لیا تھا اور عام سطح سے اپنے آپ کو بلند و بالا سمجھنے لگے تھے ان میں بعض اچھے نمونے بھی تھے جن کے دل میں ملک و قوم کی خدمت کا حقیقی جذبہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رعایا کے دلوں میں نظم و نسق کے تعلق سے اعتماد پیدا نہ ہوسکا اور حکومت اور عوام کے درمیان ایک خلیج حائل ہوگئی۔ ذیلی اعلیٰ خدمات کا تو کوئی معیار ہی نہ تھا ان کو اپنے بالاتر عہدیداروں کے احکام کی تعمیل کرنی پڑتی تھی۔ دفاتر کا عام عملہ مسلمانوں کی اکثریت پر مشتمل ضرور تھا لیکن ساتھ ہی معاشی اور اقتصادی مصائب کا بُری طرح شکار تھا۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد ملک کے طول و عرض میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کی سہولتیں پیدا ہوگئی تھیں اور جامعہ سے فارغ ہوکر جو پیداوار نکل رہی تھی اس میں ملک کی خدمت کے جذبہ کے ساتھ اخلاق و کردار کی صلاحیتیں بھی تھیں۔ جامعہ کے فرزند آہستہ آہستہ ملک کے نظم و نسق میں جذب ہو رہے تھے۔ اس طرح ملک میں ایک

متوسط طبقہ پیدا ہوگیا تھا جو ملک کی معاشی اور سماجی تعمیر نو میں نمایاں حصہ بھی لینے لگا تھا لیکن من حیث المجموع اس کی آواز میں ابھی قوت پیدا نہیں ہوئی تھی۔

جہاں تک مسلم سیاست کا تعلق ہے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ملک کے ذہین اور قابل ترین افراد ملازمتِ سرکاری میں منسلک تھے اور پبلک لائف میں کمتر صلاحیتیں بروئے کار تھیں۔ ۱۹۳۵ء کے قانونِ وفاق ہند کے نفاذ تک حیدرآباد کے مسلمانوں میں کوئی سیاسی شعور پیدا ہی نہیں ہوا تھا اور نہ مسلم اخبارات رائے عامہ کے ترجمان تھے۔ کانگریس کی ریشہ دوانیوں اور ہندوؤں کے مطالبات کی شدت نے بہادر یار جنگ جیسے مخلص اور بے لوث قائد کو میلاد کی محفلوں سے سیاست کی وادیٔ پُرخار میں دشت پیمائی کے لئے کھینچا اور ایک قلیل عرصہ میں انھوں نے اپنی بے مثل خطابت، جذبۂ ایمانی اور جوشِ عمل سے مسلمانوں کے اندر نئی زندگی پیدا کر دی۔ ذمہ دارانہ حکومت کے ہندو مطالبہ کے خلاف بہادر یار جنگ نے مجلس اتحاد المسلمین کے سربراہ کی حیثیت سے جو محاذ قائم کیا تھا وہ اُن حالات کے عین مطابق تھا جو ہندوستان میں وفاق کی تشکیل کو بروئے عمل لانے میں معاون ثابت ہو رہے تھے لیکن دوسری عالمگیر جنگ کے اختتام تک ہندوستان کے سیاسی حالات میں انقلاب انگیز تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ انگریزوں کا بین الاقوامی وقار ختم ہو گیا تھا اور ہندوستان کو آزادی عطا کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ کار باقی ہی نہ تھا۔ جنگ کے ختم ہونے کے قبل ہی ۱۹۴۴ء میں بہادر یار جنگ دنیائے فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان کے جانشینوں میں ابو الحسن سید علی نے ایک حد تک مسلم سیاست کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی لیکن مفاد پرست عناصر کے سامنے ان کی پیش نہیں گئی اور سیاست ہی سے انھیں کنارہ کش ہونا پڑا۔ اگر تقسیم ہند کے زمانہ میں بہادر یار جنگ بقیدِ حیات ہوتے تو متبدلہ حالات

سے وہ یقیناً ربط بقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے اور حیدرآباد کو اس ابتلاء اور آزمائش میں مبتلا نہ ہونا پڑتا جس کے نتیجہ میں اس کا سیاسی وجود ہی ختم ہو کر رہ گیا۔

مسلم سیاست کی طرح حیدرآباد کی مسلم صحافت بھی آخر زمانہ میں بے لگام ہو گئی تھی۔ رہبرِ دکن ملک کا کثیر الاشاعت روزنامہ تھا۔ اور مسلمانوں پر اس کا بے حد اثر تھا۔ اس کی طرز ہندوؤں کے تعلق سے کبھی مفاہمانہ نہ تھی۔ دوسرا اہم اخبار روزنامۂ وقت تھا جو کٹر قسم کا مسلم پرست تھا۔ اس کے مالک اور مدیر اتحاد المسلمین کی مجلسِ شوریٰ کے رکن اور قاسم رضوی کے مقابلہ میں دو مرتبہ اتحاد المسلمین کی صدارت کے امیدوار بھی تھے۔ میزان، نظام گزٹ، صبحِ دکن، جناح، اتحاد ملک کے قابلِ ذکر روزنامے تھے اور موخر الذکر تو اتحاد المسلمین کا آرگن تھا لیکن یہ سب قاسم رضوی کی لَے میں لَے ملاتے تھے۔ کسی اخبار نے بھی حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اختیار نہیں کیا تھا۔ اردو کے چند اور بھی روزنامے تھے جو قوم پرستانہ خیال کے حامل تھے یا ہندو ذہنیت کے آئینہ دار اور ان کا مسلمانوں پر کوئی اثر نہیں تھا۔ غرض مسلمانوں کو کسی سمت سے صحیح رہبری نہیں مل رہی تھی، ایک افراتفری کا عالم تھا۔

مسلمانوں کی ۱۵ فیصد آبادی کے مقابلہ میں ہندوؤں کی (۸۵) فیصد آبادی تھی جس پر ملک کی معیشت کا انحصار تھا۔ ان میں بھی پست افتادہ طبقات تھے لیکن بحیثیت مجموعی ملک کی ساری زراعت، تجارت اور پیدائش دولت کے سارے وسائل ان کے ہاتھ میں تھے۔ ذاتی اوصاف کے ساتھ ان میں کاروباری کردار بھی تھا اور حکمراں طبقہ کو خوش اور اقتصادی طور پر اپنا محکوم بنائے رکھنے کا گر بھی انھیں یاد تھا۔ ان کے قبضہ میں ہر چیز تھی۔ کمی صرف اتنی تھی کہ ملک کے اقتدار میں یہ شریک و سہیم نہیں تھے۔ ایک لحاظ سے انھیں اس کی

پرواہ بھی نہ ہوتی کیونکہ ان کی زندگی امن وچین اور خوشحالی میں بسر ہو رہی تھی اور حکومت کی سارے فلاحی منصوبوں کا براہِ راست فائدہ انھیں پہنچتا تھا لیکن جب سے ہندوستان میں انگریزوں کے ورود کے بعد جمہوریت کا چرچا شروع ہوا اور آبادی کی بنیاد پر حکومتی اداروں کی تشکیل عمل میں آنے لگی تو ہندوؤں کے سامنے اپنی ایک ہزار سالہ غلامی سے نجات حاصل کرنے کا راستہ کھل گیا۔ انگریزوں کی بہیمی فوجی قوت سے مقابلہ کی ہندوستانیوں میں سکت تو تھی نہیں اس لئے گاندھی جی کی قیادت میں حکومت کے مقابلہ کے لئے ستیاگرہ کا حربہ اختیار کیا گیا۔ یہ نسخہ کچھ اتنا کارگر ثابت ہوا اور بین الاقوامی حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ انگریزوں کو ہندوستان چھوڑتے ہی بنی۔ مسلمانوں نے قائدِ اعظم کی قیادت میں پاکستان کا مطالبہ کیا اور مسلم اکثریتی صوبوں میں ان کی آزاد حکومت قائم ہوگئی حیدرآباد میں مسلمانوں سے اقتدار چھیننے کے لئے ہندوؤں نے اسی آبادی کی بنیاد کو اپنا حربہ بنایا اور کامیابی حاصل کی۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان پر انگریزوں کے کامل تسلط اور ریاستوں پر ان کی بالادستی کے انطباق کے بعد حیدرآباد کی اسلامی سلطنت آصفیہ انگریزوں کی سنگینوں کے سایۂ عاطفت میں قائم تھی اور انگریزوں کے ہندوستان سے رفوچکر ہونے کے بعد حیدرآباد کی حکومت یا تو طاقت وقوت کے بل بوتے چل سکتی تھی یا پھر عامۃ النّاس کی مرضی پر قائم رہتی۔ طاقت وقوت کا مقابلہ اگر صرف حیدرآباد کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہوتا تو اپنے اجداد کی طرح مسلمان اس مرحلہ سے بھی عہدہ برآ ہو جاتے لیکن حیدرآباد کے ہندوؤں کی پشت پناہی پر انڈیا یونین کی مہیب فوجی قوت تھی جس کو انگریزوں نے برسوں کی محنت اور تربیت کے بعد اپنے شہنشاہی مفادات

کی حفاظت کے لئے تیار کیا تھا۔ اس فوج کو انگریزوں نے جدید ترین اسلحہ سے لیس کیا تھا جس کے قبضہ میں ایک زبردست ہوائی بیڑا تھا اور جو بلحاظ تعداد حیدرآباد کی فوج سے کئی گنا زیادہ بھی تھی۔ ایسی فوج سے مقابلہ تو صرف مجنونوں کی کوئی جماعت ہی کر سکتی تھی۔ لیکن حیدرآباد کے قائدین اور اربابِ اقتدار کی سیاسی بصیرت کا یہ حال تھا کہ اس فوج کو بزدل قرار دے کر دعوتِ مبارزت دیتے تھے اور اس خود فریبی میں مبتلا تھے کہ رضاکاروں کے ٹڈی دَل سے جنہیں معمولی بھرمار بندوقیں بھی پوری طرح میسّر نہ تھیں وہ ہندوستانی فوج کو شکست دے کر دہلی کے لال قلعہ پر پرچم آصفی لہرائیں گے دنیا میں حیدرآبادی قائدین کی طرح کسی قوم کے اربابِ سیاست نے حقائق سے اتنی چشم پوشی نہ برتی ہوگی۔ جب کسی قوم کی تباہی کا وقت قریب آتا ہے تو قدرت قوم کی سرکردگی ایسے لوگوں کے سپرد کرتی ہے جن سے مشیّتِ الٰہی کی تکمیل میں مدد ملتی ہے۔

آزادی ایک شریف ترین جذبہ ہے جس کے لئے انسان اپنی ہر متاعِ عزیز قربان کر دیتا ہے۔ الجزائر کے مسلمانوں نے فرانس کی زبردست فوجی قوت سے سات سال تک مقابلہ کیا اور آزادی حاصل کی۔ سوال یہ ہے کیا حیدرآباد کا مسلمان ہندوستان کی بہیمی قوت کا اسی طرح مقابلہ کر سکتا تھا؟ میرے نزدیک تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ اولاً اس لئے کہ حیدرآباد کے مسلمان میں سرفروشی کا جذبہ مفقود تھا البتہ قائدین اپنے تخیل کی پرواز کا لطف اٹھانے کے لئے اس کا نام ضرور لیتے تھے۔ دوسرے ملک کے جغرافیائی اور طبعی حالات مختلف تھے۔ پہاڑی سلسلوں اور ناقابلِ عبور و مرور علاقوں کی وجہ سے الجزائری مجاہدین کو گوریلا جنگ کرنے کے زیادہ مواقع حاصل رہے۔ تیسرے الجزائری مجاہدین

کا تعلق اکثریتی فرقہ سے تھا اور قدم قدم پر انھیں اپنے ہم وطنوں اور دینی بھائیوں سے مدد ملتی رہی۔ چوتھے یہ کہ الجزائر اور حیدر آباد میں کوئی مماثلت اس لئے بھی نہیں ہوسکتی کہ وہاں مسلمان اپنے اکثریتی حقوق کے منوانے کے لئے فرانس سے برسرپیکار تھے جو اقلیتی طبقہ کی حمایت میں آیا تھا۔ حیدر آباد میں مسلمان اقلیت میں تھے اور انڈیا یونین کی فوجیں اکثریتی فرقہ کی حمایت میں آئی تھیں۔ مماثلت صرف یہ تھی کہ حیدر آباد کے مسلمان اور الجزائر کی یورپی اقلیت کا مفاد ایک تھا، دونوں اقتدار سے چمٹے ہوئے تھے اور اپنے مطالبات میں انتہا پسند۔ اول الذکر سے اکثریتی فرقہ نے ہندوستانی فوج کی امداد سے چار روز کے اندر اقتدار چھینا اور ثانی الذکر کو فرانسیسی فوج کی بیمانہ امداد کے باوجود اکثریتی فرقہ کے مجاہدانہ عزم کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔

حیدر آباد میں مسلم رضاکاروں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ نہیں تھی جو حیدر آباد کے مستقر ہائے اضلاع اور تعلقات میں پھیلے ہوئے تھے۔ قواعد پریڈ کی شد بد کے سوا ان میں کسی قسم کی فوجی تنظیم نہ تھی۔ اسلحہ میں بجز بھرمار بندوقوں، برچھوں اور لاٹھیوں کے ان کے پاس کوئی ہتیار ہی نہ تھا۔ انڈیا یونین نے حیدر آباد سے دستوری گفت و شنید کے آغاز کے بعد ہی سے حیدر آباد پر فوجی حملہ کے منصوبہ کی تکمیل شروع کردی تھی اور حملہ کے جواز کے لئے اس کو کوئی معقول وجہ کی تلاش تھی تاکہ اقوام عالم کی نظروں میں اس کا پوزیشن گر نہ جائے۔ اس لئے ساری دنیا کے ممالک میں جہاں ہندوستانی سفارتخانے قائم تھے حیدر آباد کی رضاکار تحریک، اس کے لیڈر قاسم رضوی اور رضاکاروں کے عزائم اور مظالم کو الم نشرح کیا جانے لگا۔ اس خصوص میں انڈیا یونین نے

اپنے اخبارات سے زیادہ بیرونی پریس سے کام لیا۔

انڈیا یونین اور حیدرآباد میں آئندہ تعلقات کی اساس کے متعلق گفت وشنید کی ناکامی کی بڑی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ حیدرآباد کے ارباب حل وعقد رضاکاروں کی عالمی شہرت کو اپنا بڑا اثاثہ سمجھنے لگے تھے اور گفت وشنید کے ہر مرحلہ پر انڈیا یونین کی جانب سے رضاکاروں کی تحلیل پر اصرار کا یہ مطلب لیا جانے لگا تھا کہ ہندوستان رضاکاروں سے کتنا مرعوب ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آخر وقت تک حیدرآباد کے وفد نے اس تنظیم کی تحلیل سے انکار کے لئے تاویلات سے کام لیا۔

یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ گفت وشنید میں انڈیا یونین کی جانب سے مونٹ بیٹن، وی پی منن اور دوسرے ارکان نے جو حصہ لیا قابلیت، صلاحیت اور تجربے میں حیدرآبادی وفد کا ان سے کوئی مقابلہ نہیں ہوسکتا۔ حکومت برطانیہ نے تقسیم ہند کے مشکل مسائل سے نمٹنے کے لئے بطور خاص مونٹ بیٹن کا انتخاب کیا تھا اور اپنے عہدہ کے فرائض جس خوش اسلوبی سے اس نے انجام دئے اور برطانوی حکمت عملی کو کامیاب بنایا ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح وی پی منن محض اپنی قابلیت کی بناء پر کلرکی سے ترقی کرتے ہوئے تقسیم کے قبل انگریزوں کے زمانے میں حکومت ہند کا دستوری مشیر اور تقسیم کے بعد اسٹیٹس منسٹری کا معتمد مقرر ہوا تھا۔ کیمبل جانسن نے اپنی کتاب میں اس کی قابلیت اور اعلیٰ تسویدی صلاحیتوں کی غیرمعمولی تعریف کی ہے۔ معلوم نہیں لائق علی نے کس بناء پر یہ لکھدیا کہ یہ دس سطریں صحیح لکھنے پر قادر نہ تھا۔ حیدرآباد کی جانب سے سر والٹر مانکٹن اور سر سلطان احمد کو چھوڑکر وفد کا کوئی رکن بھی گفت وشنید کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا

بجز علی یاور جنگ کے جنھیں قاسم رضوی کے اعتماد میں نہ ہونے کی وجہ سے وفد کی رکنیت سے کچھ عرصہ بعد سبکدوش کر دیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گفت و شنید کی کسی نوبت پر حیدر آبادی وفد نے حیدر آباد کے مفاد میں کوئی چیز حاصل نہیں کی۔ نہ اپنی قابلیت وصلاحیت کا نقش بٹھایا نہ گفت وشنید کی ناکامی کا فریق مقابل کو ذمہ دار قرار دیا۔ جس وفد کے سر ناکامی کا سہرا ہے اس کے سربراہ لائق علی وزیر اعظم حیدر آباد تھے جنھیں نہ سیاست کا کوئی تجربہ تھا اور نہ دستوری مسائل سے لگاؤ تھا۔ وہ محض ایک صنعت کار تھے اور بخت و اتفاق نے انھیں صدارتِ عظمیٰ کی کرسی پر فائز کر دیا تھا۔ جن ابواب پر گفتگو ٹوٹی ہے وہ اتنے فروعی اور معمولی تھے کہ ان کے مضمرات پر نہ حیدر آباد کی کونسل (مجلسِ وزراء) نے کوئی توجہ کی اور نہ نظام نے اس پر اعتنا کیا۔ حیدر آباد کی آزادی کے بنیادی ابواب تو امور خارجہ، دفاع اور مواصلات تھے جنھیں حیدر آباد کے وفد نے انڈیا یونین کے تفویض کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ لیکن اس کو اصرار اس پر تھا کہ حیدر آباد کی معاشی اور مالیاتی آزادی اور سمندر پار کی تجارت اور برآمد کا حق تسلیم کیا جائے اور ثالثی کی دفعہ کا اضافہ کیا جائے یہ چیز ناقابلِ فہم ہے کہ ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کو منظور کرنے اور اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ میں سونپ دینے کے بعد حیدر آباد کی کس معاشی اور مالیاتی آزادی کے تحفظ کی کوشش کی جا رہی تھی خصوصاً جبکہ ابتدا ہی سے ملک کی ساری معیشت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ بظاہر اس میں بجز چند خود غرض مسلم عناصر کے مفاد کے تحفظ کے عام مسلمانوں کا کوئی فائدہ مضمر نہ تھا۔ اس کے باوجود یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ گفت وشنید حیدر آباد کی آزادی کے مسئلہ پر ٹوٹی ہے۔ دنیا اس فریب میں مبتلا نہیں ہو سکتی۔ ہم کو اپنی کوتاہیاں تسلیم کرنی چاہئیے۔

اقوام متحدہ میں حیدرآباد کے مسئلہ کو پیش کرنا ایک دوسری بڑی خود فریبی تھی۔ آج تک اس عالمی ادارہ نے قوی اور ضعیف کے معاملہ میں ضعیف کا ساتھ نہیں دیا لیکن حیدرآباد کے ارباب اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ صیانتی کونسل میں مسئلہ پیش ہوتے ہی حیدرآباد کے خلاف انڈیا یونین اپنے جارحانہ عزائم سے باز آجائے گی۔ لیکن اس کا نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔

پاکستان کے تعلق سے بھی یہ چیز ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ قائدِ اعظم نے کبھی ارباب حیدرآباد کو مغالطہ میں نہیں رکھا ہمیشہ یہی مشورہ دیا کہ حیدرآباد انڈیا یونین کے اندر رہ کر ایک باعزت مقام حاصل کرلے۔ ارباب حیدرآباد نے ہمیشہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ گفت و شنید کے آخری مرحلے تک حیدرآبادی وفد کو قائدِ اعظم کی رہنمائی حاصل تھی اور یہ کہ حیدرآباد پر ہندوستانی حملہ کی صورت میں پاکستان خاموش نہیں رہے گا۔ لیکن اربابِ حیدرآباد میں پاکستان کی مشکلات کو سمجھنے کی بصیرت نہیں تھی۔

حیدرآباد کا مسئلہ ختم ہوگیا، اس کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ اس واقعہ کو گذرے پندرہ سال بھی ہوگئے۔ لیکن ہم نے ابھی تک اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کا جائزہ نہیں لیا کہ اتنی بڑی مملکت کیسے چشم زدن میں ختم ہوگئی۔ اس کے کون ذمہ دار ہیں۔ ہر شخص اپنی ذمہ داری کو دوسرے پر عائد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ موجودہ سلطانیٔ جمہور کے دور میں اقلیت اپنی مرضی اکثریت پر مسلط نہیں کرسکتی اور حالات اور واقعات کے اعتبار سے اتحاد المسلمین کے زعماء کو حیدرآباد کے مستقبل کا تصفیہ پوری قوم کو اعتماد میں لے کر کرنا چاہیئے تھا۔ خود فریبیوں میں مبتلا رہ کر اور قوم کو ان میں مبتلا کرکے جن تباہیوں کو دعوت دی گئی ان سے ہزار درجہ بہتر یہ تھا کہ حکمت و تدبر سے کام لے کر مسلمانوں کی معاشی، اقتصادی

حیثیت سے زندہ رکھنے کے کوئی جتن کئے جاتے جس کے بغیر آج حیدرآباد کا مسلمان پست اقوام کے درجہ سے بھی نیچے گر گیا ہے۔ اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھ میں قیادت اور اقتدار کی باگ ڈور تھی۔

حیدرآباد کا عروج و زوال

۱
دکن کی تاریخ

دکن جس کو سنسکرت میں دکشنیا کے نام سے موسوم کیا گیا ہے وہ علاقہ ہے جو دریائے نربدا کے جنوب میں واقع ہے۔ بعض مورخین دریائے تنگبھدرا اور نربدا کے درمیانی علاقہ کو دکن کا نام دیتے ہیں۔ کوہ بندھیاچل اور ست پڑا دکن کے شمال میں واقع ہیں اور دکن کی اسی طرح حفاظت کرتے ہیں جیسے کوہِ ہمالیہ ہندوستان کی کرتا ہے۔ ان پہاڑی سلسلوں اور یہاں کی دریاؤں کے دشوار گذار راستوں نے دکن کو شمال سے بالکل علیحدہ کر رکھا ہے۔ ویسے ہندوستان کے شمالی اور جنوبی علاقوں میں آب و ہوا، موسم اور طبعی حالات کے لحاظ سے بھی بڑا فرق ہے جس کا اثر یہاں کی تہذیب و معاشرت، رسم و رواج مذہبی اعتقادات پر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

دکن کی قدیم تاریخ تاریکی میں ہے۔ شمالی ہند میں آریاؤں کی آمد کے بعد موریا خاندان کے راجہ بندوسارا کا دکن پر تسلّط قائم کرنا بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ امر مابہ النزاع ہے کہ دکن اس کے ماتحت تھا کہ نہیں۔ مگر تیسری صدی ق م میں اس کے فرزند اشوک کی وسیع سلطنت میں دکن ضرور شامل تھا جس کی تصدیق جدید برآمد شدہ کتبات سے بھی ہوتی ہے۔ اشوک کے بعد ستواہن خاندان کی دکن میں حکومت قائم ہوئی جس کو آندھرا سلطنت بھی کہتے ہیں۔ یہ پہلی صدی ق م کا زمانہ ہے

آندھرا سلطنت کے قیام کے بعد تین صدیوں تک دکن کی تاریخ پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے

اس کے بعد چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں دکن پر چلوکیہ خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ جو آٹھویں صدی عیسوی کے وسط تک جاری رہی۔ ان کے بعد راشٹراکت اور یلاوا خاندان دکن پر حکمراں ہوا۔ اسی راشٹراکت خاندان کے زمانے میں جس کا پایۂ تخت ملکھیڑ تھا مشہور مسلمان سیاح سلیمان نے ۸۵۱ء میں دکن کی سیاحت کی ہے۔

خلافتِ راشدہ کے زمانہ ہی سے مسلمان تجارت کی غرض سے جنوبی ہند کے ساحلوں پر آنے لگے تھے اور ساحل ملابار پر ان کی آبادیاں بھی قائم ہو گئی تھیں لیکن مسلمانوں کو ان علاقوں میں کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہ ہوئی۔

علاؤالدین خلجی کے حملہ کے وقت دکن میں تین خود مختار سلطنتیں قائم تھیں۔ مہاراشٹر، تلنگانہ اور کرناٹک۔ مہاراشٹر کا پایۂ تخت دیوگڑھ تھا جہاں یادو خاندان کا راجہ رام دیو حکمراں تھا۔ تلنگانہ کا مرکز ورنگل تھا جہاں کاکیتا خاندان کی ایک عورت رودرما دیوی حکمراں تھی۔ کرناٹک کے مرکز دوارقی پور پر بلال خاندان کا راجہ بیر بلال حکمراں تھا۔ یہ تینوں سلطنتیں بڑی متمول اور مالدار تھیں جن کی دولت مندی کے قصے سُن کر علاؤالدین خلجی کو دکن پر حملہ کرنے کا خیال ہوا۔

علاؤالدین خلجی نے ۱۲۹۴ء میں دکن پر حملہ کیا۔ اس کی فوج بالاگھاٹ سے ہوتی ہوئی ایلچپور پہنچی جو مہاراشٹر حکومت کی ایک بڑی فوجی چھاؤنی تھی۔ ایلچپور پر قبضہ کرنے کے بعد دیوگڑی کے قلعہ کا محاصرہ کیا گیا۔ راجہ رام دیو نے صلح کرلی۔ فرشتہ کے بیان کے بموجب اس صلحنامہ میں علاؤالدین کو چھ سو من سونا، سات من موتی، دو من جواہرات، ہزار من چاندی ریشمی تھان، گھوڑے، ہاتھی اور دیگر قیمتی سامان ہاتھ آیا۔ ایلچپور پر مستقل قبضہ رکھا گیا اور بہت سے صوفی اور درویش یہاں آباد بھی ہو گئے۔ دکن میں مسلم آبادکاری کی ابتدا اور اسلام کی اشاعت کا یہاں سے سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

دکن پر دوسرا حملہ ۱۳۰۶ء میں ہوا جبکہ دیوگڑی کے راجہ نے خراج دینا بند کردیا تھا

ملک کافور کی قیادت میں ایک فوج روانہ کی گئی اور راجہ نے بغیر لڑے اطاعت قبول کر لی اور دہلی جا کر ایک ماہ تک شاہی مہمان رہا۔ دربار سے اس کو رائے رایاں کا خطاب سرفراز کیا گیا اور سرخ چتر لگانے کی اجازت دی گئی۔

سنہ ۱۳۰۹ء میں تلنگانہ کے مرکز پر حملہ کیا گیا۔ راجہ نے صلح کر لی اور خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ یہاں جو نذرانہ اور تاوان وصول ہوا وہ ایک ہزار اونٹوں پر لاد کر دہلی روانہ کیا گیا۔ سنہ ۱۳۱۰ء میں مالابار پر حملہ کیا گیا اور مسلمان فوجیں بڑھتی ہوئیں رامیشور تک پہنچ گئیں جو انتہائی جنوب میں واقع ہے۔ یہاں پر ملک کافور نے یادگار کے طور پر ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔

علاؤ الدین خلجی کے بعد اس کے بیٹے مبارک خلجی کے زمانہ میں جو سنہ ۱۳۱۶ء میں تخت نشین ہوا دیوگڑی میں بغاوت ہو گئی جس کو فرو کر کے مہاراشٹرا کی اس سلطنت کو براہِ راست دہلی کے تحت کر کے ایک صوبہ قرار دیا گیا۔

خلجی دور کے بعد عہد تغلق میں ورنگل کی سلطنت فتح ہوئی اور مالابار تک کا علاقہ مسلمانوں کے تسلط میں آ گیا۔ اتنی وسیع سلطنت پر مرکزی حکومت کی گرفت مضبوط رکھنے کے لئے محمد بن تغلق نے بجائے دہلی کے دیوگڑی کو دارالسلطنت بنایا لیکن یہ تبدیلی استحکام سلطنت کے لئے مفید ثابت نہ ہوئی اور پھر دارالخلافہ دہلی واپس کیا گیا۔ اس ردوبدل سے دیوگڑی (دولت آباد) میں مسلمانوں کی ایک کافی تعداد آباد ہو گئی۔ سنہ ۱۳۵۱ء میں محمد بن تغلق فوت ہوا۔ اس کی زندگی میں ہی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا۔

دکن کے مسلمانوں نے سنہ ۱۳۴۵ء میں اپنی آزاد سلطنت قائم کر لی اور دو سال کے بعد سنہ ۱۳۴۷ میں علاؤ الدین حسن بہمن شاہ نے گلبرگہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ اس کی حکومت شمال میں برار، مشرق میں تلنگانہ اور جنوب و مغرب میں دریائے کرشنا اور سمندر تک وسیع ہو گئی تھی۔ یہ سلطنت چار صوبوں پر مشتمل تھی۔ برار، مرہٹواڑہ، کرناٹک اور تلنگانہ، آخر کار جب مرکز میں اضمحلال پیدا ہوا تو یہ چار صوبے اور پائے تخت بیدر خود مختار بن گئے

اوران پر علی الترتیب عماد شاہی، نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی خاندانوں کی حکومتیں قائم ہوگئیں۔

بہمنی سلطنت کے قیام سے کوئی دس سال پہلے ۱۳۳۶ء میں وجیانگر میں ایک ہندو سلطنت قائم ہوگئی تھی اور دریائے تنگبھدرا ہندو اور مسلمان حکومتوں میں حد فاصل کا کام دیتی تھی۔ مسلمان حکومت کے حصے بخرے اور ان کی آپس کی ریشہ دوانیوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے وجیانگر کی سلطنت نے اپنی فوجی قوت کو اتنا مستحکم کرلیا تھا کہ مسلمان سلطنتوں میں سے تنہا کوئی ایک اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ دکن میں مسلمانوں کے تسلط کو ختم کرنے کی یہ پہلی منظم کوشش تھی۔ چنانچہ اسی منصوبہ کی پیش رفت میں ہندوؤں نے احمد نگر پر حملہ کرکے ہزاروں مسلمانوں کو تہ تیغ کیا اور مسجدوں کو اصطبلوں میں تبدیل کردیا۔ لیکن حکومت وجیانگر کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا مسلمانوں کی غیرت وحمیت نے انھیں آپس میں متحد ہونے پر مجبور کردیا چنانچہ ۱۵۶۵ء میں ٹالیکوٹہ کے میدان کارزار میں وجیانگر سے فیصلہ کن مقابلہ ہوا۔ اس جنگ کا شمار دنیا کی اُن فیصلہ کن جنگوں میں کیا جاتا ہے جن سے قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ ہوا ہے۔ اگر اس جنگ میں مسلمان ناکام رہتے تو آج سے تین سو سال قبل ہی دکن سے اسلام کا نام ونشان مٹ جاتا۔ لیکن قضا وقدر کو یہ منظور نہ تھا۔ ٹالیکوٹہ کی جنگ میں وجیانگر کی اینٹ سے اینٹ بج کر رہ گئی اور پھر دکن میں مرہٹوں کے عروج تک ہندوؤں کی کوئی خود مختار سلطنت قائم نہ ہوسکی۔

یہ زمانہ شمالی ہند میں مغلیہ سلطنت کے عروج کا تھا۔ ٹالیکوٹ کے معرکۂ عظیم کے سر کرنے کے بعد دکن کی اسلامی حکومتوں میں پھر نفاق پیدا ہوا جس سے فائدہ اٹھا کر مغلوں نے دکن کی ان اسلامی سلطنتوں کو ایک ایک کرکے ختم کردیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں یعنی ۱۶۸۷ء میں دکن کی آخری سلطنت قطب شاہی کا خاتمہ ہوا اور پورا دکن مغلیہ سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔ جس کا صدر مقام اورنگ آباد قرار دیا گیا۔

گولکنڈہ پر عالمگیری افواج کے محاصرہ میں مغلیہ فوج کے ایک کمانڈر میر عابد خان تھے جن کا خطاب قلیج خان تھا۔ یہ آصف جاہ کے دادا تھے۔ معرکۂ دکن میں یہ میدان جنگ میں کام آئے اور نواح گولکنڈہ میں دفن ہوئے۔ ان کے فرزند میر شہاب الدین خان فیروز جنگ تھے اور ان کے فرزند میر قمر الدین خاں نظام الملک فتح جنگ آصفجاہ اول تھے۔ بچپن ہی سے انھوں نے دربار عالمگیری میں رسوخ پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔ چھ سال کی عمر میں انھیں دربار سے منصب عطا کی گئی تھی اور جب سولہ سال کی عمر میں انھوں نے شیر کا شکار کیا تو "بہادر" کے خطاب سے سرفراز کئے گئے۔ چھبیس[۲۶] سال کی عمر تک انھوں نے عالمگیر کا اتنا قرب حاصل کر لیا تھا کہ بیجاپور کی صوبیداری پر انھیں روانہ کیا گیا۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا اور جانشینی کے نزاعات نے سلطنت کی بنیاد کو متزلزل کر دیا۔ اسی زمانہ میں نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کر کے قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ آصف جاہ کے تدبر اور دانشمندی نے دہلی کو نادر شاہ کے مظالم سے بچا لیا۔ نادر شاہ تو واپس ہو گیا لیکن سلطنت میں جو ضعف پیدا ہو گیا تھا وہ دور نہ ہو سکا۔ دہلی کی ہنگامہ پرور فضا سے تنگ آ کر آصف جاہ نے اپنے لئے دکن کی صوبیداری کا انتخاب کیا اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

دکن کی صوبیداری پر مراجعت کے بعد آصف جاہ نے اپنی خود مختاری اور آزادی کو مستحکم کرنا شروع کیا۔ وہ سلطنت دہلی سے برائے نام وابستہ تھے اور دکن پر ان کی خود مختار حکومت قائم تھی۔ آصف جاہ کا انتقال ۱۷۴۸ء میں ہوا۔ اس وقت ان کی سلطنت کے حدود نربدا سے ترچناپلی تک اور کوکن سے مدراس تک پھیلے ہوئے تھے۔ آصف جاہ کی زندگی ہی میں انگریزوں سے ان کے تعلقات شروع ہو گئے تھے۔ جب فرانسیسیوں نے انگریزوں سے مدراس چھینا تو ایک فریادی کی حیثیت سے انگریزوں نے آصف جاہ سے امداد طلب کی جنہوں نے اپنے

کرناٹک کے گورنر کو انگریزوں کی دادرسی کا حکم دیا۔

آصف جاہ اول کی وفات کے وقت ان کے چار لڑکوں کے منجملہ ناصر جنگ صلابت جنگ، نظام علی خاں اور بسالت جنگ دکن میں ان کے ساتھ موجود تھے۔ البتہ فرزند اکبر غازی الدین خاں دہلی میں تھے باپ کی وفات کی خبر سنکر انہوں نے احمد شاہ بادشاہ سے صوبہ داری دکن کی سند حاصل کی اور دکن کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن اس کے قبل ہی آصف جاہ کی وفات کے بعد ناصر جنگ نے اپنی جانشینی کا اعلان کر دیا تھا۔ مشہور ہے کہ غازی الدین خاں کو ان کے دکن پہنچنے پر ناصر جنگ کی والدہ نے زہر دے دیا۔ اب ناصر جنگ ہی آصف جاہ کے سب سے بڑے بیٹے رہ گئے۔ ان کے مقابلہ میں بھائیوں میں سے کسی نے آواز نہیں اُٹھائی البتہ ان کے بھانجے مظفر جنگ نے نانا کے تخت کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ فرانسیسیوں نے اپنا اثر بڑھانے کے لئے ان کا ساتھ دیا جس کے جواب میں انگریزوں نے ناصر جنگ کی حمایت پہ کمر باندھی۔ کچھ ہی مدت میں مظفر جنگ اور ناصر جنگ کا پیمانۂ حیات لبریز ہوگیا اور ۱۷۵۱ء میں صلابت جنگ بے کھٹکے جانشین ہو گئے۔ فرانسیسیوں نے ان کا ساتھ دیا تھا لیکن یورپ کی سیاست کے مدنظر فرانسیسیوں کا اثر دربار سے زائل ہو گیا اور انگریزوں نے ان کی جگہ لے لی۔ تاہم ۱۷۶۱ء تک تقریباً بارہ سال صلابت جنگ نے حکومت کی جبکہ وزراءِ دربار نے انھیں نظر بند کر کے آصف جاہ کے چوتھے فرزند میر نظام علی خان کو تخت نشین کر دیا۔ اپنے بھائیوں میں یہ سب سے زیادہ ہوشیار اور ذی عقل تھے۔ یہ آصف جاہ ثانی کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ اسی سال ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی طاقت کا قلع قمع کیا جس سے فائدہ اٹھا کر نظام علی خان نے اپنی سلطنت کے وہ علاقے مرہٹوں سے واپس حاصل کر لیے جو ان کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔

۲

حیدرآباد اور انگریزوں کے تعلقات

ہندوستان میں یوں تو ڈیڑھ سو سال سے انگریزوں اور فرانسیسیوں کی تجارتی کمپنیاں کاروبار کر رہی تھیں لیکن مغلیہ سلطنت کے زوال پذیر حالات سے فائدہ اٹھا کر فرانسیسی کمپنی کے گورنر کو ہندوستان کی سیاسیات میں حصہ لینے اور ہندستان میں فرانسیسی اقتدار کو بڑھانے کا خیال پیدا ہوا۔ چونکہ یورپ میں انگریز اور فرانسیسی ایک عرصہ سے اقتدار کی کشمکش میں مبتلا تھے اس لئے انگریزوں نے ہندوستان میں فرانسیسی اقتدار کو روکنے کے لئے ان کے حریف کی حیثیت اختیار کی۔

آصف جاہ اول کے دور حکومت ہی سے حیدرآباد اور انگریزوں کے دوستانہ تعلقات کی ابتدا ہو گئی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی جانشینی کی نزاع کے زمانہ میں انگریز اور فرانسیسی دعویداران تخت کو ایک دوسرے کے خلاف امداد دینے کے حیلہ سے اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی کوشش میں مبتلا رہے۔ ناصر جنگ کی تائید میں انگریز تھے اور مظفر جنگ کے ساتھ فرانسیسی۔ ان دونوں کے بعد جب صلابت جنگ وارث تخت قرار پائے تو فرانسیسی ان کے دربار میں چھائے ہوئے تھے لیکن بعض مصالح کی بنا پر فرانسیسی گورنر نے اپنی فوجیں واپس بلالیں۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر انگریزوں نے فرانسیسی جاگیرات پر حملہ کر دیا۔ یہ چیز نواب صلابت جنگ کو بہت ناگوار گذری اور انھوں نے انگریزوں کی تادیب کے لئے فوج کشی کا ارادہ کیا۔ لیکن

انگریزوں نے پیش قدمی کر کے صلح کی درخواست کی اور ۱۷۵۹ء میں پہلا عہد نامہ مرتب ہوا جس کی رو سے صلابت جاہ نے انگریزوں کو مچھلی بندر اور نظام پٹن بطور انعام حوالہ کئے اور فوجی امداد کا وعدہ لیا۔ اس طرح فرانسیسیوں سے آصف جاہی تعلقات منقطع ہوئے۔

اس عہد نامہ پر ابھی عملدرآمد نہ ہوا تھا کہ انگریزوں نے ۱۷۶۵ء میں قانون کے بالکل خلاف بالا بالا شاہ دہلی سے شمالی سرکاروں کی سند حاصل کر لی حالانکہ دو سال پہلے معاہدہ پیرس میں اس علاقہ کو نظام کی ملک تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ قانون بین الملل کی ایک کھلی ہوئی خلاف ورزی تھی۔ نواب نظام علی خان آصفجاہ ثانی کو یہ چیز سخت ناگوار گذری۔ نواب کے بگڑے ہوئے تیور دیکھکر انگریز خائف ہوگئے۔ ان میں اتنے بڑے فرمانروا سے لڑنے کی ہمت نہ تھی۔ انگریزوں نے صلح کی درخواست کی اور ۱۷۶۶ء میں ایک جدید عہد نامہ مرتب ہوا جس کی رو سے انگریزوں نے شمالی سرکاروں کی سند ان کے قانونی مالک سے حاصل کی۔ اور راجندری، سیکاکول، ایلورا اور مصطفیٰ نگر کی سرکاروں کے عوض سات لاکھ روپیہ سالانہ خراج دینا قبول کیا۔ مصطفیٰ نگر (سرکار گنتور) کے متعلق یہ طے ہوا کہ بسالت جاہ (آصفجاہ ثانی کے چھوٹے بھائی) کی زندگی میں یہ علاقہ ان کے زیر تصرف رہے گا بعد میں وہ بھی انگریزوں کو مل جائے گا اس کے عوض انگریز ۲ لاکھ خراج ادا کریں گے۔

انگریزوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ ہر ضرورت کے موقع پر سرکار نظام کی مدد کے لئے ایک فوج مستعد رکھیں گے۔ اس فوجی امداد کا خرچ اگر شمالی سرکاروں کے خراج سے کم ہوگا تو اسے رقم خراج میں سے وضع کر کے باقی ماندہ رقم سرکار میں داخل کی جائے گی اور اگر خراج سے زیادہ ہوگا تو زائد رقم کی ذمہ دار خود کمپنی ہوگی۔ یہ فوجی خدمات کا پہلا دام تھا جس میں نظامِ دکن کو پھانسا گیا۔ اس عہدنامہ کے مطابق نظام دکن کی خدمت کے لئے ایک مستقل فوج حیدرآباد میں رکھنا انگریزوں کا فرض تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد جب حیدرعلی کی قوت سے انگریزی مقبوضات کو خطرہ لاحق ہوا تو یہ فوج ۱۷۶۶ء میں حیدرآباد سے

واپس بلالی گئی اور اسے انگریزی مقبوضات کی حفاظت پر لگا دیا گیا۔ انگریزوں کی اس بدعہدی سے نظام ناراض ہو گئے اور ان کی مدد سے انکار کر دیا۔ اسی زمانہ میں حیدر علی نے آصفجاہ سے ملاقات کی اور جب نواب بازدید کے لئے اس سے ملنے گئے تو ان کی خدمت میں نذریں پیش کی گئیں اور چبوترۂ زر پر نظام کو بٹھایا گیا۔ یہ ایسا موقع تھا کہ اگر سلطنت دکن اور ریاست میسور کا دائمی اتحاد ہو جاتا تو کم از کم جنوبی ہند پر اسلامی سلطنت از سر نو مستحکم ہو جاتی مگر مشیتِ الٰہی کو کچھ اور منظور تھا۔ اس اتحاد سے انگریز خائف ہو گئے اور اپنے پٹھو محمد علی خاں والیٔ کرناٹک کو بیچ میں ڈالا جس نے آصفجاہ کو پھر حیدر علی سے منحرف اور انگریزوں کی جانب منعطف کر دیا۔ اس کے بعد ہی ۱۷۶۸ء میں ایک عہد نامہ مرتب ہوا جس کی رو سے نواب آصفجاہ نے کرناٹک کی دیوانی سات لاکھ روپیہ سالانہ خراج کے عوض انگریزوں کے سپرد کر دی۔ اور انگریزوں نے عہد کیا کہ وہ ایک فوج نواب کی خدمت میں دیں گے جس کا خرچ نواب کو دینا ہوگا مگر یہ فوج ایسی طاقتوں کے خلاف استعمال نہ کی جائے گی جن سے انگریزی کمپنی کی دوستی ہو۔ یہ Subsidiary Alliance کی بنیاد تھی جس نے رفتہ رفتہ ریاست کی جڑوں ہی کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔

سرکار گنتور پر انگریزوں نے بسالت جاہ کے انتقال کے قبل ہی شہزادہ کو حیدر علی کے خطرہ سے ڈرا کر ۱۷۷۹ء پر قبضہ کر لیا اور اسے نواب کرناٹک کو دس سال کے پٹہ پر بھی دیدیا یہ ایک صریح بدعہدی تھی۔ نظام نے احتجاج کیا اور فرانسیسی فوج کو پھر ملازم رکھ لیا۔ کمپنی کے گورنر نے ایک طویل معذرت نامہ لکھا سرکار گنتور نظام کو واپس کیا گیا اور گورنر مدراس کو اس کی کونسل کے ارکان سمیت برطرف کیا گیا۔ موقع کی نزاکت کے لحاظ سے انگریزوں نے سرکار گنتور واپس تو کر دیا لیکن اس کو دوبارہ حاصل کرنے کی ٹوہ میں رہے۔ چنانچہ بسالت جاہ کے انتقال کے بعد ۱۷۸۴ء میں گنتور کی واپسی کے لئے مسٹر جانسن کو وکیل بنا کر حیدرآباد بھیجا گیا۔ اس زمانہ میں نواب کو اپنی پہلی غلطی کا احساس ہو چکا تھا اس لئے انھوں نے تجویز

پیش کی کہ کمپنی شمالی سرکاروں کو واپس کردے اور اس کے عوض سرکار نظام نہ صرف پیشکش کا بقایا معاف کردے گی بلکہ ایک کروڑ روپیہ نقد بھی کمپنی کو دے گی۔ اس کے ساتھ کرناٹک کی واپسی کے لئے ایسی ہی تجاویز پیش ہوئیں۔ انگریز وکیل نے ان تجاویز کو پسند کیا اور سپریم گورنمنٹ کو ان کی منظوری کے لئے لکھا لیکن وہاں سے سختی کے ساتھ انھیں رد کردیا گیا اور جانسن کو منصب وکالت سے برطرف بھی کردیا گیا۔

۱۷۸۸ء میں لارڈ کارنوالس نے کپتن کنوے کو پہلی مرتبہ رزیڈنٹ بناکر حیدرآباد بھیجا اس مرتبہ سرکار گنتور کی تفویض کا مطالبہ صرف زبانی ہی نہیں پیش کیا گیا بلکہ سلطنت آصفیہ کی سرحدوں پر فوج کا اجتماع بھی کیا گیا۔ اس طرح گنتور انگریزوں کو واپس کرنا پڑا اور شمالی سرکار کی واپسی سے دست کشی اختیار کی گئی۔ اس سال میر عالم کی سرکردگی میں ایک سفارت کلکتہ روانہ کی گئی جس کی گفت و شنید سے ایک اور عہد نامہ عمل میں آیا جو لارڈ کارنوالس کے ایک خط کی صورت میں ہے۔ اس میں یہ تصریح کی گئی کہ جو فوج نواب آصفجاہ کے خرچ پر رکھی گئی ہے وہ ہر ایسے موقع پر ان کی خدمت کے لئے حاضر رہے گی جبکہ وہ اسے طلب کریں لیکن اسے مرہٹوں، نواب ارکاٹ اور ٹراونکور کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ یہ فوج صرف ٹیپو سلطان کے مقابلہ کے لئے رکھی گئی تھی۔ اس خط میں یہ بھی درج تھا کہ آئندہ شمالی سرکاروں کے مسئلہ کو چھیڑنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اس معاہدہ کے بعد دو تین موقعے ایسے آئے جبکہ نظام کو اس فوج کی ضرورت پیش آئی مگر اسے بھیجنے سے انکار کیا گیا۔ کمپنی کی ان بدعہدیوں سے تنگ آکر نظام نے ایک فرنچ افسر موسیو ریمو کو ملازم رکھا جس کے تحت دیسی اور یوروپین فوجوں کے دستے مرتب کئے گئے۔

ان افواج کی تربیت کو ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ ۱۷۹۵ء میں مرہٹوں سے جنگ چھڑ گئی۔ مقام کھرڈہ پر نظام کو شکست ہوئی۔ چھتیس لاکھ کا ملک، دو کروڑ نقد اور ارسطوجاہ کو یرغمال کے طور پر سپرد کرنے کی شرائط پر صلح ہوئی۔

جنگ کھڑلہ کے بعد نظام نے انگریزی پلٹنوں کو برطرفی کا حکم دے دیا اور موسیوریموں کی جمعیت کو ترقی دینا شروع کی۔ ایک جنگی کارخانہ بھی حیدرآباد میں قائم کیا گیا۔ اس مرتبہ انگریزوں نے سازش کے ہتیار سے کام لیا اور شہزادہ عالیجاہ کو باپ کے خلاف بغاوت پر ابھارا۔ نظام دوبارہ کمپنی سے امداد طلب کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے باوجود فرانسیسی فوج کا اثر باقی تھا اس زمانہ میں ٹیپو سلطان نے بھی انگریزوں کے خلاف ایک جہاد عام میں شرکت کی دعوت دی اور ایک طویل خط لکھا۔ قریب تھا کہ نظام کے تعلقات کمپنی سے منقطع ہو جاتے لیکن عین وقت پر سیاسی فریب کاری نے کمپنی کی دستگیری کی۔ رزیڈنٹ نے نظام اور ٹیپو کے درمیان کرنول کا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ میر عالم نے اس کام میں رزیڈنٹ کی امداد کی اور نظام کو بڑے وثوق سے باور کرایا کہ ٹیپو نے کرنول پر قبضہ کرنے کا پورا سامان کر لیا ہے۔ ٹیپو کے وکلا ناکام و نامراد واپس گئے اور انگریز فوجوں کی واپسی کا حکم واپس لیا گیا۔

۱۷۹۸ء میں ایک جدید عہد نامہ مرتب ہوا جس کی رو سے انگریزوں کی ضمانتی فوج (Subsidiary Force) کو مستقل کر دیا گیا جس کے خرچ کا بار نظام کے خزانہ پر عائد کیا گیا۔ اس کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ یہ نظام کی ذات اور ان کی سلطنت کی حفاظت کریگی اور اس سے چھوٹے چھوٹے کام نہیں لئے جائیں گے۔ اس کے عوض نظام نے فرانسیسی فوجوں کو منتشر کرنے اور آئندہ کسی یوروپین کی خدمات کمپنی کی رضامندی کے بغیر حاصل نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ معاہدہ انگریزی ڈپلومسی کی عظیم الشان فتح تھا۔

اس معاہدہ کے بعد ہی ۱۷۹۹ء میں میسور سے جنگ چھیڑ دی گئی جس میں ٹیپو سلطان کی شہادت عمل میں آئی اور کمپنی کو جنوبی ہند پر پوری طرح تسلط حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ میسور کی جنگوں میں امداد دینے کے صلہ میں مقبوضہ علاقے مساویانہ طور پر نظام اور کمپنی کے درمیان تقسیم ہونا چاہئے تھا لیکن لارڈ ولزلی نے میسور کی ریاست راجگان میسور کے قدیم خاندان کے سپرد کر دی کیونکہ انگریزوں کو اندیشہ تھا کہ نظام کی طاقت وقوت میں اضافہ

ہوجائے گا۔ تاہم مال غنیمت میں جو علاقے ملے ان میں صرف بلاری اور کڑپہ کی آمدنی ایک کروڑ سالانہ سے زیادہ تھی۔ یہ بھی انگریزوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ چنانچہ سنہ ۱۸۰۰ء میں حیدرآباد کو ان علاقوں سے محروم کرنے کے لئے ایک جدید عہد نامہ مرتب کیا گیا جس کی رو سے دونوں سلطنتوں نے وعدہ کیا کہ اگر تیسری طاقت ان میں سے کسی ایک پر حملہ آور ہوگی تو دونوں مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔ انگریز اپنے علاقوں کی طرح نظام کی قلمرو کی بھی حفاظت کریں گے۔ جس کے لئے سابقہ امدادی فوج میں مزید اضافہ کیا جائے گا۔ اس فوج کے مصارف ادا کرنے کے لئے نظام نے وہ تمام ملک کمپنی کے حوالہ کردیا جو میسور کی جنگوں میں اس کو ملا تھا اور جس کی آمدنی ۶۳ لاکھ سالانہ تھی۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ کمپنی کی رضامندی کے بغیر نظام کسی دوسری طاقت سے کسی قسم کے تعلقات نہیں رکھیں گے۔ اور کمپنی حیدرآباد کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دے گی۔ دوسری طاقتوں سے نظام کی نزاع ہونے کی صورت میں کمپنی کو ثالث کی حیثیت سے قطعی فیصلہ کا اختیار حاصل ہوگا۔ اس طرح حیدرآباد کی خارجی آزادی پر پہلی اور آخری ضرب کاری لگائی گئی جس کے بعد حیدرآباد کی آزاد حیثیت ہمیشہ کے لئے ختم ہوکر رہ گئی۔ اس کو سنہ ۱۸۰۰ء کا عہد معاونت کہتے ہیں۔

سنہ ۱۸۰۳ء میں میر نظام علی خاں فوت ہوئے اور ان کی جگہ سکندر جاہ تخت پر بیٹھے۔ سنہ ۱۸۰۴ء میں مدارالمہام سلطنت ارسطو جاہ کے انتقال کے بعد انگریزوں نے ان کی جگہ میر عالم کو مسلط کردیا۔ جس نے دکن میں انگریزی اثر کی ترقی کے لئے سب سے زیادہ کوشش کی تھی۔ اس کے بعد انگریزوں کو حیدرآباد میں اپنا اثر بڑھانے کا اور بھی زیادہ موقع مل گیا۔ میر عالم نے مہاراجہ چندو لعل کو اپنا پیشکار بنایا جو انگریز دوستی میں میر عالم سے بھی کہیں آگے تھا اور جس نے ملک کے مفاد کو بیحد نقصان پہنچایا۔ سنہ ۱۸۰۸ء میں میر عالم کے انتقال کے بعد منصب وزارت کے دو امیدوار تھے شمس الامرا اور منیر الملک جو میر عالم کے داماد تھے۔ موخرالذکر کو اس شرط پر کمپنی نے وزارت دلائی کہ وہ اپنے سارے اختیارات چندو لعل کے سپرد کردیں گے۔ چنانچہ اسی کے

موافق عملدرآمد ہوا۔

انگریزوں نے ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل دے کر نظم ونسق کو اتنا ابتر کر دیا تھا کہ ریاست کا مالی توازن باقی نہ رہا اور قرض لیکر خسارہ کو پورا کیا جانے لگا۔ اس زمانہ میں ایک انگریز ولیم پامر نے حیدرآباد میں ساہوکارہ کی ایک دکان کھول رکھی تھی۔ جس سے ۲۴ فیصد تک بھاری شرح سود پر قرض لیا جاتا تھا۔ اس طرح ۱۸۲۳ء تک ریاست ایک کروڑ سولہ لاکھ کی مقروض ہوگئی جسے بھگتانے کی یہ صورت اختیار کی گئی کہ شمالی سرکار کا پیش کش سات لاکھ روپیہ سالانہ انگریزی حکومت کو ہمیشہ کے لئے معاف کیا گیا اور اس کے عوض یہ قرض اس نے اپنے ذمہ لے لیا۔ اس کے بعد دوسرے مہاجنوں سے قرض لینے کا سلسلہ جاری رہا۔ سکندرجاہ نے اپنی زندگی میں ریاست کو ایک کروڑ روپیہ دیا اور ان کے بعد ناصرالدولہ نے ۸۰ لاکھ دئے لیکن اس کے باوجود ریاست کی قرضداری کا یہ حال تھا کہ جب ۱۸۴۳ء میں چندولعل نے استعفا دیا تو تمام قرضوں کو ادا کرنے کے لئے دو کروڑ کی ضرورت تھی۔

اس بدانتظامی اور کمزوری نے ریاست کے سیاسی مرتبہ کو سخت نقصان پہنچایا۔ نظام علی خاں کے عہد میں ریاست کی بنیادیں جب مضبوط تھیں تو انگریزی حکومت نہ صرف ان کے شاہانہ خودمختاری کا پورا احترام ملحوظ رکھتی تھی بلکہ اندرونی معاملات میں دخل دینے سے کامل اجتناب کرتی تھی۔ سفارتی تعلقات میں دونوں سلطنتوں کے درمیان کامل مساوات تھی بلکہ ایک باجگذار حکومت ہونے کی حیثیت سے انگریزی حکومت کے لئے ایسے آداب مقرر تھے جو کمتر درجہ کے حلیف کے لئے موزوں ہوتے ہیں لیکن نظام علی خاں کی آنکھ بند ہوتے ہی جب ریاست کو گھن لگنا شروع ہوا اور اس کی اندرونی طاقت مضمحل ہونے لگی تو انگریزی حکومت کا رویہ بھی بدلنے لگا۔

دونوں سلطنتوں میں برابر کے سفارتی تعلقات تھے حیدرآباد میں رزیڈنٹ اور کلکتہ

میں ایلچی۔ ان کے انتقال کے بعد ۱۸۰۵ء میں جب ایک نئے ایلچی کو بھیجا گیا تو گورنر جنرل نے اس کو پسند نہیں کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اسے واپس کر دیا۔ اس کے بعد سفارت ہی موقوف ہو گئی اور حیدر آباد کے رزیڈنٹ کے اندر دونوں عہدے جمع ہو گئے۔

نظام علی خاں کے عہد تک رزیڈنٹ کو ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کی جرأت نہ ہوتی تھی مگر ان کے بعد سکندر جاہ کے زمانہ میں پہلے دیوان و پیشکار کے تقرر کے مسئلہ میں رزیڈنٹ نے علانیہ مداخلت کی پھر رفتہ رفتہ ملک کے انتظامی معاملات میں اس کا دخل بڑھتا گیا یہاں تک کہ مالگذاری کے بندوبست اور عہدہ داران کے تقرر تک میں رزیڈنٹ کا حکم بالاتر رہنے لگا اور بادشاہ کے خلاف خود اس کے ملازموں کی حمایت کرنا انگریزی حکومت کی پالیسی کا مستقل جزو بن گیا۔ حد یہ ہے کہ نظام سے یہاں تک کہدیا گیا جس کو فریزر نے اپنے Memoirs میں ان الفاظ میں قلمبند کیا ہے:-

"مہاراجہ چندو لعل کی علیحدگی سے دونوں سلطنتوں کے تعلقات میں فرق آجائے گا...... اگر ہز ہائی نس کے معاملات کا انصرام کسی ایسے وزیر کے سپرد کیا گیا جس پر برٹش گورنمنٹ بھروسہ نہ کر سکتی ہو تو ممکن ہے کہ برٹش گورنمنٹ کے لئے یہ ناگزیر ہو جائے کہ وہ اپنے مفاد کی نگہبانی کسی دوسرے ڈھنگ سے کرے بجائے اس طریقہ کے جو اب تک پایا گیا ہے"

اس ریاست میں جو ابتری پھیلی اس کا بیان خود انگریزی رزیڈنٹ کرنل اسٹورٹ کی زبان سے سننا چاہیئے جو اس نے ۱۸۳۲ء میں حکومت ہند کو لکھا تھا۔

"جو لوگ اس دربار میں (۳۰) سال سے ہماری پالیسی کو دیکھ رہے ہیں جنہوں نے دیکھا ہے کہ ہم کس طرح خود اپنے بنائے ہوئے آدمیوں کو وزارت دلواتے ہیں اور خود ان کے بادشاہ کے خلاف ان کی حمایت کرتے ہیں۔ کس طرح ہم نے کار آمد فوج پر قبضہ حاصل کر لیا ہے اور کس طرح ہم ملک کے دیوانی انتظام پر حاوی ہو گئے

ہیں وہ اس حقیقت میں مشکل سے کوئی شک کر سکتے ہیں اور سب سے کم
خود نظام کو اس میں کوئی شک ہو سکتا ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو اس ملک کا واقعی
حکمراں سمجھ لیا ہے۔ بہت سی خرابیاں جو ریاست میں موجود ہیں بلا ریب ہماری
بے ضابطہ مداخلت کے ناگزیر نتائج ہیں اس لئے یہ بات مشکل ہی سے درست
ہو سکتی ہے کہ نظام اور ان کے دیوان کو جس حال میں وہ آج کل ہیں، ان
خرابیوں کا ذمہ دار قرار دیا جائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ ان کو درست کرنے کی
قدرت رکھتے ہیں۔ درحقیقت زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہم خود ان خرابیوں کے
ذمہ دار قرار دئے جائیں کیونکہ انھیں دفع کرنے کی قدرت ہم اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں"

سکندرجاہ کے زمانہ تک ظاہری ادب آداب بدستور باقی تھے۔ گورنر جنرل اپنے آپ کو سرکاری مراسلت میں "نیازمند" لکھتا تھا اور نظام اپنے لئے "مابدولت" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ ۱۸۲۹ء میں جب ان کا انتقال ہوا اور ناصرالدولہ ان کی جگہ مسندنشین ہوئے تو ان کے ساتھ مساویانہ خط و کتابت شروع ہو گئی میر عالم کے زمانہ میں دیوان ریاست سے گورنر جنرل کی خط و کتابت برابر کے دوستوں کی سی ہوتی تھی مگر ۱۸۴۷ء میں جب سراج الملک نے ان ہی آداب والقاب کو استعمال کیا تو انھیں سختی سے منع کیا گیا اور صاف لکھدیا گیا:-

"ہندوستان کے گورنر جنرل اور حیدرآباد کے دیوان کی اعتباری حیثیت
کو دیکھتے ہوئے اب کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ برٹش گورنمنٹ کے
نمائندے کو اس طریقہ سے خطاب کیا جائے جو ایک زیر حمایت اور امداد
پانے والی ریاست کے وزیر کے ساتھ مساوات کو پہونچتا ہو"

اس کے بعد رفتہ رفتہ رزیڈنٹ نے بھی ادب آداب کو رخصت کرنا شروع کیا۔ ناصرالدولہ کے ابتدائی زمانہ میں جنرل فریزر شکایت کرتا ہے کہ یہاں کے آداب بہت تکلیف دہ ہیں مگر ان ہی کے آخری زمانہ میں جب کرنل لو رزیڈنٹ ہو کر جاتا ہے تو وہ دربار میں نہایت گستاخانہ طرزعمل

اختیار کرتا ہے۔

سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدہ میں سرکش زمینداروں اور باغیوں کی سرکوبی کے لئے انگریزی فوج سے امداد حاصل کرنے کی شرط رکھی گئی تھی لیکن فوج کو ضرورت کے وقت بھیجنے میں حیلہ و حجت سے کام لیا جاتا تھا۔ سنہ ۱۸۰۲ء میں گورنر جنرل نے ان ہی اغراض کے لئے ایک نئی فوج قائم کرنے پر اصرار کیا جس کو نظام نے قبول نہیں کیا۔ بالآخر رزیڈنٹ اور چندولعل پیشکار نے باہمی اتفاق سے ایک فوج دو ہزار سواروں کی قائم کرلی جس کے اخراجات کے سلئے چالیس لاکھ سالانہ کا بار ریاست کے خزانہ پر ڈالا گیا۔ یہی فوج حیدرآباد کنٹنجنٹ کہلائی اس فوج کے قیام کا یہ مقصد بتایا گیا تھا کہ صیانتی فوج کمپنی کے زیر اثر ہے اس لئے ایک فوج خود ریاست کے زیر حکم رہنا چاہیئے۔ لیکن یہ فوج بالکلیہ رزیڈنٹ کے ماتحت تھی۔ اس فوج کے مصارف کا بار ریاست کے خزانہ سے بمشکل پورا ہوتا تھا۔ چندولعل پہلے ولیم پامر کی کمپنی سے قرض لے کر اس کو پورا کرتے تھے پھر جب یہ کمپنی ٹوٹ گئی تو ملکی ساہوکاروں کا سہارا ڈھونڈا گیا اور جب ریاست کی ساکھ بالکل ہی بگڑ گئی تو اس رقم کا ادا کرنا مشکل ہوگیا۔ فوج کی تنخواہ بقایا میں رہنے لگی اور جب چندولعل نے استعفا دیا تو چھ مہینے کی تنخواہ بقایا میں تھی جو رزیڈنسی کے خزانہ سے ادا کی گئی۔ سنہ ۱۸۴۳ء تک یہ رقم اڑتیس لاکھ تک پہنچ گئی

چندولعل کی علٰحدگی کے بعد ناصرالدولہ نے دیوانی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے۔ یہ چیز انگریزوں کو پسند نہ تھی۔ وہ ایک ایسے دیوان کے تقرر پر مصر تھے جو ان کے زیر اثر ہو اور جب ان کے تقاضوں کا کوئی اثر نہ ہوا تو سنہ ۱۸۴۵ء میں گورنر جنرل نے نظام کو ایک خط لکھا جس میں ریاست کی بدانتظامی پر سخت نکتہ چینی کی گئی اور صاف کہدیا گیا کہ اگر ہمارے "دوستانہ نصائح" پر توجہ نہ کی گئی تو نتائج خطرناک ہوں گے۔ رزیڈنٹ نے طرح طرح کی مشکلات پیدا کرنی شروع کیں۔ مجبوراً نظام کو آمادہ ہونا پڑا اور ان کی مرضی کے خلاف سراج الملک کا تقرر کرایا گیا۔ سراج الملک سارا کاروبار سلطنت

رزیڈنٹ کے مشورے سے انجام دینے لگے۔ قرض کا مطالبہ بھی ان کے تقرر کے بعد بند
کر دیا گیا۔ فوجی معاملات کے سلسلہ میں انگریزی مفاد کی سب سے بڑی خدمت جو سراج الملک
نے کی وہ یہ تھی کہ ان دیسی فوجوں کو جن کا ایک بڑا حصہ عربوں اور پٹھانوں پر مشتمل تھا جو کلیتہً
نظام کے زیر اختیار تھیں اور جن پر کسی خطرے کے وقت نظام اپنی حفاظت کے لئے بھروسہ
کر سکتے تھے، موقوف کرنا شروع کر دیا۔ موسیو ریموں کی جمعیت کے منتشر ہونے کے بعد بھی
ایسی فوج رہ گئی تھی جس پر نظام کی ساری جنگی طاقت کا انحصار تھا اور اسی فوج کا وجود
انگریزی حکومت کو کھٹک رہا تھا۔ ناصر الدولہ کے زمانہ میں اس فوج کی کل تعداد ۳۵ ہزار
کے قریب تھی۔ سراج الملک کی اس انگریز دوستی سے تنگ آکر نظام نے رزیڈنٹ کو بلاکر اپنی
اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ وہ سراج الملک کو مدار المہامی سے الگ کر دینا چاہتے ہیں۔ اس کے
ساتھ ہی نظام کو یہ باور کرایا گیا کہ ان کے اس عمل سے گورنر جنرل ناراض ہو جائیں گے اور
اس کا انجام بہت برا ہوگا۔ نظام نے اس تنبیہ کی کوئی پرواہ نہ کی۔ سراج الملک ۱۸۴۸ء میں
علیٰحدہ کئے گئے جس کے ساتھ ہی قرض اور اس کے سود کے مطالبہ میں شدت کی جانے لگی اور
اس کی بے باقی کے لئے ۳۱ دسمبر ۱۸۵۰ء کی تاریخ مقرر کر دی گئی معینہ مدت گذر گئی اور قرض
ادا نہ ہو سکا۔ اس وقت قرض کی تعداد (۷۰) لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی

اسی زمانہ میں برار کو جسے ارض موعود سمجھا جا رہا تھا انگریزی تسلّط کے لئے تیار کرنے
کی تدبیریں شروع کر دی گئیں۔ ۱۸۵۲ء تک قرض کی ادائی کا کوئی انتظام نہ ہو سکا۔ نظام
اتنے بے بس ہو گئے تھے کہ انھوں نے مجبوراً پھر سراج الملک کو مدار المہام بنا لیا لیکن اس سے
بھی قرض کا تقاضہ بند نہ ہوا۔ لارڈ ڈلہوزی نے قرض کی واپسی کو ایک بہانہ بنایا تھا اس کے
پیش نظر تو صرف برار حاصل کرنا تھا۔ ۱۸۵۲ء میں ایک جدید معاہدہ کی گفت و شنید کے لئے
رزیڈنٹ کو خاص ہدایات وصول ہوئیں اور اس کے ساتھ مجوزہ معاہدہ کا مسودہ بھی روانہ
کیا گیا جس میں کنٹنجنٹ کی تنخواہوں کے لئے ۳۶ لاکھ روپیہ سالانہ کی ملک دوامی برٹش گورنمنٹ

کو تفویض کرنے کی تجویز کی گئی تھی۔ سراج الملک نے تو اس کی تائید کی لیکن ناصر الدولہ نے اس کو اپنی تذلیل قرار دیا۔ نظام نے چار ماہ کے اندر قرض ادا کرنے کی پیشکش کی لیکن مہلت نہیں دی گئی بلکہ اسسٹنٹ رزیڈنٹ نے سراج الملک کو یہ خط لکھا کہ حیدرآباد پر چڑھائی کرنے کے لئے پونہ میں فوج کو تیار رہنے کے احکام پہنچ گئے ہیں اور فوجی کارروائی صرف اضلاع برار تک محدود نہیں رہے گی! فوجی حملہ کی دھمکی کے بعد مقاومت بیکار سمجھی گئی اور مئی ۱۸۵۳ء میں تفویض برار کے معاہدہ پر نظام نے دستخط کر دئے۔

واقعات سے ظاہر ہے کہ نظام اس دستاویز پر دستخط کرنے کے لئے بالکل راضی نہ تھے، انھوں نے آخر وقت تک اسے قبول کرنے سے انکار کیا اور صرف اس وقت اس کی توثیق کی جب انھیں یقین دلایا گیا کہ مزید انکار کی پاداش میں ان کی سلطنت اور ان کی جان تک کی خیر نہیں ہے۔ اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی معاہدہ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک کھلا ہوا استحصال بالجبر تھا اور ساری کارروائی از اول تا آخر ناجائز تھی۔

تفویض برار کے عہد نامہ پر دستخط ہونے کے پانچ روز بعد سراج الملک کا انتقال ہو گیا ان کے بعد ان کے بھتیجے سالار جنگ مدارالمہام بنائے گئے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں ناصر الدولہ کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ افضل الدولہ مسند نشین ہوئے۔ اسی زمانہ میں ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی برپا ہوئی۔ حیدرآباد کی ریاست کو انگریزوں نے اپنے ناجائز استحصال کی وجہ سے اتنا بے دست و پا کر دیا تھا کہ حیدرآباد میں انگریزوں کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات برانگیختہ تھے لیکن اس کے باوجود حیدرآباد نے اپنی پوری قوت انگریزوں کی امداد اور اعانت میں صرف کر دی۔ گورنر بمبئی نے تو حیدرآباد کے رزیڈنٹ کو یہ تار دیا تھا If the Nizam goes all is lost اگر نظام گئے تو سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا۔

انگریزوں نے اس وفاداری کا حیدرآباد کو یہ صلہ دیا کہ نظام کو دس ہزار پونڈ کے

اور سالارجنگ کو تین ہزار پونڈ کے تحائف روانہ کئے۔ شوراپور کا علاقہ جس کی آمدنی ۳ لاکھ ۲۰ ہزار سالانہ تھی اور جو پہلے حیدرآباد کا علاقہ تھا، نظام کے کامل شاہی اختیارات میں دیا گیا۔ کنٹنجنٹ کے سلسلہ میں جو ۵۰ لاکھ کا قرض واجب الادا تھا اس کو معاف کر دیا۔ اس معافی کو کسی صورت میں انعام سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ معاہدہ برار کی رو سے برار کے مفوضہ علاقہ کی آمدنی اور خرچ کا حساب ہر سال پیش کرنا رزیڈنٹ پر لازم تھا۔ ۱۸۵۳ء تا ۱۸۶۰ء تک کوئی حساب پیش نہیں کیا گیا اور ساری آمدنی انگریزی حکومت نے خود ہی خرچ کر ڈالی حالانکہ نظم ونسق کا خرچ ۱۷ لاکھ سالانہ سے زیادہ نہ تھا اور آمدنی ۴۵ لاکھ تھی۔ اس انعام کے پہلے حکومت برطانیہ اس قرض کو معاف کرنے تیار تھی بشرطیکہ گذشتہ سات سالہ حساب طلب نہ کیا جائے۔ ۱۸۶۰ء میں انگریزی حکومت نے ایک اور معاہدہ کے ذریعہ سالانہ حسابات کے پیش کرنے کی ذمہ داری سے سبکدوشی حاصل کر لی اور برار کی آمدنی سے جو بچت ہوگی وہ حیدرآباد کو ادا کرنے کا وعدہ کیا۔

مدارالمہامی پر فائز ہوتے ہی سالارجنگ نے برار کی واپسی کے مسئلہ پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ وہ اپنے خاندان کی پیشانی سے اس داغ کو دھونا چاہتے تھے جو ان کے چچا سراج الملک نے برار تفویض کر کے لگایا تھا۔ سالارجنگ کے اس خلاف توقع مطالبہ سے برطانوی حلقوں میں اضطراب کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ پہلے تو مطالبہ کو بے بنیاد قرار دینے کی کوشش کی گئی اور جب سالارجنگ نے اصرار کیا تو انھیں متنبہ کیا گیا اور ان کی درخواستوں کو وزیر ہند تک بھیجنے سے پہلو تہی کی جانے لگی۔ اس غرض کے لئے سالارجنگ نے انگلستان جانے کا ارادہ کیا تو انھیں اس شرط پر اجازت دی گئی کہ برار کے متعلق وزیر ہند سے کوئی گفتگو نہ کی جائے۔ اس کے بعد سالارجنگ کے خلاف رزیڈنٹ نے سازشیں شروع کیں۔ سالارجنگ کے متعلق انگریزی حکومت کا یہ حکم تھا کہ

ان کا نام "غدر" کے وفاداروں کی فہرست میں سب سے اوپر رکھا جائے یا انھیں اب برطانوی مفاد کا سب سے بڑا دشمن سمجھا جانے لگا۔ حکومت برطانیہ میں سالار جنگ کے مدلل دعاوی کو کلیتہً رد کرنے کی جرأت نہ تھی چنانچہ وزیر ہند نے یہ لکھکر مسئلہ کو التواء میں ڈال دیا کہ نظام میر محبوب علی خاں ابھی نابالغ ہیں۔ اگر ہز ہائی نس امور سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد یہ خواہش کریں گے تو ایسی درخواست پر غور کیا جائے گا۔ ابھی نظام کی تخت نشینی میں ایک سال باقی تھا کہ ۱۸۸۳ء میں سالار جنگ کا انتقال ہوگیا اور انگریزی حکومت کے کارندے اس کوشش میں لگ گئے کہ تخت نشینی سے پہلے برار کے تصفیہ کا ہمیشہ کے لئے قابل اطمینان فیصلہ کر لیا جائے لیکن اتفاق سے اس زمانہ میں ایک شریف ذہنیت رکھنے والا وائسرائے لارڈ رپن تھا جس کے زمانہ میں ایسی صریح بے ایمانی ممکن نہ تھی اس طرح برار کا مسئلہ مزید بیس سال کے لئے ملتوی ہوگیا۔

مسند آرائی کے بعد نظام نے استرداد برار کے مسئلہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور انگریزی حکومت کے ساتھ غائت درجہ کی وفاداری کا اظہار کرتے رہے۔ ان کی مسئلہ سے بے اعتنائی کا یہ انعام ملا کہ ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے خود مسئلہ برار کو چھیڑا اور یہ تجویز پیش کی کہ برٹش گورنمنٹ کو برار کا دوامی پٹہ اس شرط پر دیدیا جائیگا کہ وہ جس طرح چاہے اس کا انتظام کرے اور اس کے عوض ۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ کا مستقل خراج حیدرآباد کو دے۔ نظام نے اس کو قبول کرنے سے انکار کیا لیکن بعد میں انھیں اس کو قبول کرنا پڑا۔ عام شہرت تو یہ ہے کہ حالت نشہ میں معاہدہ پر ان سے دستخط لئے گئے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ لارڈ کرزن نے قصداً نظام سے تنہائی میں یہ معاملہ طے کیا۔ مدارالمہام یا کسی مشیر تک کو ساتھ رکھنے کی اجازت نہ دی اور تخویف اور داب ناجائز کے حربوں سے کام لیکر دوامی پٹہ کی دستاویز پر دستخط حاصل کرالی۔ قانون کی نظر میں یہ معاہدہ بھی ناجائز قرار پاتا ہے۔

۱۹۱۱ء میں میر محبوب علی خاں کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ آخری نظام

میر عثمان علی خاں مسند آرائے سلطنت ہوئے تین ہی سال بعد پہلی جنگِ عظیم شروع ہوگئی جس میں انگریزی حکومت کے لئے زندگی اور موت کا سوال درپیش ہوگیا۔ اس نازک وقت میں مسلمانوں کے لئے سلطنت برطانیہ کا وفادار رہنا سب سے زیادہ مشکل تھا کیونکہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت جس کے بادشاہ کو تمام مسلمان اپنا امام سمجھتے تھے برطانیہ کے خلاف برسرِپیکار تھی۔ نظام نے اس اخلاقی و روحانی اثر کو استعمال کر کے جو تمام ہندوستان کے مسلمانوں پر انھیں حاصل تھا یہ تلقین کی کہ مسلمان برطانیہ کی وفاداری پر ثابت قدم رہیں۔ دوسری طرف اپنی سلطنت کے تمام ذرائع دولت برطانیہ کے لئے وقف کر دیئے اس سلسلہ میں جو خاص مالی امداد دی گئی وہ چھ کروڑ سے زیادہ تھی[1]۔ ڈی یف کراکا نے اپنی کتاب "فابولس مغل" میں جنگی امداد کی تفصیل حسب ذیل بتلائی ہے :۔

۳۰ کروڑ بطور جنگی امداد

۳۰ کروڑ بطور قرضۂ جنگ

۲ کروڑ صرف خاص سے

جملہ ۶۲ کروڑ مساوی ۴۱٫۷ ملین اسٹرلنگ پونڈ[2]

ان گرانقدر احسانات کا بدلہ حکومت برطانیہ نے اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ دیا کہ نظام کو "یارِ وفادار سلطنت برطانیہ Faithful Ally of the British Govt" کے القاب سے سرفراز کیا اور رؤسائے ہند کے ہز ہائی نس کے مقابلہ میں ہز اگزالٹیڈ ہائی نس کے خطاب سے مفتخر کیا۔

جنگِ عظیم کے کامیاب اختتام کے بعد ہندوستان میں ستیا گرہ، خلافت اور

---

[1] دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ۔

[2] ممکن ہے۔ ولیکن جنگ عظیم کی یہ مجموعی امداد ہو لیکن کراکا نے اپنی کتاب میں اس کی کوئی صراحت نہیں کی۔ مصنف

ترک موالات کی تحریکیں شروع ہوگئیں اور جب ان کا زور کم ہوا تو ۱۹۲۳ء میں نظام نے برار کی واپسی کا مطالبہ کیا اور ایک طویل یادداشت لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند کے نام روانہ کی۔ ڈیڑھ سال تک دہلی اور لندن میں اس پر غور و خوض ہوتا رہا۔ بالآخر مارچ ۱۹۲۵ء میں اس کا ایک طویل جواب دیا گیا اس میں بنیادی مسائل سے اعراض کرنے کی وہی پرانی پالیسی اختیار کی گئی، اصول کو چھوڑ کر تمام تر غیر متعلق اور فروعی باتوں تک جواب کو محدود رکھا گیا۔ علاوہ ازیں اس جواب کو "فیصلہ" کا رنگ دیا گیا اور نہ صرف اسپرٹ سے بلکہ الفاظ سے بھی یہ ظاہر کیا گیا کہ یہ "فیصلہ" قطعی ہے۔ یہ غیر معقول پوزیشن کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لئے نظام نے ایک اور خط لکھا اور اس مسئلہ پر خصوصیت کے ساتھ بحث کی کہ ایسے مسائل میں جو دو حلیف طاقتوں کے درمیان متنازعہ فیہ ہوں کسی فریق کو آخری فیصلہ کرنے کا کہاں تک حق حاصل ہے؟

نظام نے لارڈ ریڈنگ کے تمام دلائل کا لفظ بہ لفظ جواب دے کر آخر میں تصفیہ کی یہ صورت پیش کی تھی کہ اس مسئلہ کا تصفیہ ایک کمیشن کے سپرد کیا جائے جس کا صدر وزیرِ ہند کا نامزد کردہ کوئی برطانوی جنٹلمین ہو۔ صدر کے علاوہ چھ ارکان میں دو حکومت ہند کے دو حیدرآباد کے نامزد کردہ ارکان ہوں اور دو اہلِ برار کے نمائندے ہوں۔ اس کا جواب لارڈ ریڈنگ نے اپنے ۲۷ر مارچ ۱۹۲۶ء کے اس مشہور خط میں دیا جس کے ذریعہ پہلی مرتبہ حیدرآباد پر علی الاعلان اقتدارِ اعلیٰ (پیراماونٹسی) کے نظریہ کو مسلط کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس خط کے جستہ جستہ حصے نقل کئے جاتے ہیں۔

> "میں یور اگزالٹیڈ ہائی نس کی پیروی میں اس قضیہ کی تاریخی تفصیلات پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ جیسا کہ میں آپ کو اپنے پہلے خط میں اطلاع دے چکا ہوں آپ کے پیش کردہ امور کی پوری توجہ کے ساتھ تحقیق و تفتیش کی گئی ہے اور اب جو کچھ آپ فرماتے ہیں ان میں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی جو میری

گورنمنٹ اور وزیر ہند کے اخذ کردہ نتائج پر اثر انداز ہوئی ہو۔

آپ نے بیان کیا ہے کہ حیدرآباد کے داخلی امور میں آپ فرمانروائے ریاست حیدرآباد ہونے کی حیثیت سے وہی درجہ رکھتے ہیں جو برٹش گورنمنٹ کو جہاں تک برطانوی ہند کے داخلی امور کا تعلق ہے، ہندوستان میں حاصل ہے یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ یور اگزالٹیڈ ہائی نس اپنے اور دولت عالیہ (Paramount Power) کے تعلقات کے متعلق ایک غلط تصور رکھتے ہیں جسے دور کرنا ہز امپریل مجسٹی کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے مجھ پر لازم ہے کیونکہ اس وقت ایک ایسے مسئلہ میں میری خاموشی کو ممکن ہے بعد میں اس دعوی کو تسلیم کر لینے کا ہم معنی قرار دیا جائے جسے آپ نے پیش کیا ہے۔ تاج برطانیہ کی سیادت ہندوستان میں سب سے برتر ہے اور اس بناء پر کوئی والئ ریاست برٹش گورنمنٹ کے ساتھ مساویانہ طریق پر گفت و شنید کرنے کا دعوی کرنے میں حق بجانب نہیں ہو سکتا۔ تاج کی برتری صرف معاہدات اور عہد ناموں ہی پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ ان سے بے نیاز ہو کر بھی قائم ہے خارجی دول اور سیاست سے تعلق رکھنے والے معاملات میں اس کے خصوصی اختیارات سے قطع نظر برٹش گورنمنٹ کا حق اور فرض ہے کہ بجزم و احتیاط ان تمام عہود و مواثیق کا احترام کرتے ہوئے جو ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ کئے گئے ہیں ہندوستان کے طول و عرض میں امن اور حسن انتظام کو برقرار رکھے اس سے جو نتائج نکلتے ہیں وہ اتنے معروف ہیں، اور دوسرے والیانِ ریاست کی طرح یور اگزالٹیڈ ہائی نس پر بھی ان کا اطلاق اتنا روشن ہے کہ ان کو بیان کرنا مشکل ہی سے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اگر توضیح کی ضرورت ہو تو میں یور اگزالٹیڈ ہائی نس کو یاد دلاؤنگا کہ ۱۸۶۲ء میں دوسرے والیان ریاست کی طرح فرمانروائے حیدرآباد کو بھی

ایک سند دی گئی تھی جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ برٹش گورنمنٹ ان کے خاندان اور
ان کی حکومت کی بقا کی خواہشمند ہے بشرطیکہ وہ تاج کے وفادار رہیں اور یہ کہ مسند
حیدرآباد پر کسی کی جانشینی اس وقت تک جائز نہ ہوگی جب تک ہز مجسٹی شہنشاہ
معظم اس کو منظور نہ کرلیں۔ نیز جانشینی کے مسئلہ میں اگر کوئی نزاع برپا ہو تو برٹش
گورنمنٹ تنہا اس کا فیصلہ کرے گی۔"

"دیسی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں برٹش گورنمنٹ کا حقِ مداخلت
ان نتائج کی دوسری مثال ہے جو برطانوی تاج کی برتری کو لازمی طور پر متضمن کرتے
ہیں - فی الواقع برٹش گورنمنٹ نے بارہا اس بات کا اظہار کیا ہے کہ وہ شدید
وجوہ کے بغیر اس حق کو استعمال کرنے کی کوئی خواہش نہیں رکھتی مگر وہ داخلی اور
خارجی تحفظ جس سے والیانِ ریاست متمتع ہوتے ہیں انجام کار برٹش گورنمنٹ
ہی کی محافظ قوت کے باعث انھیں حاصل ہے اور جہاں کہیں شاہی مفاد کا
تعلق ہو کسی ریاست کے طرزِ عمل سے اس کے باشندوں کی فلاح و بہبود پر واقعی
اور شدید مضرت رساں اثر پڑ رہا ہو تو حسبِ ضرورت اس کا تدارک کرنے کی
ذمہ داری آخر میں بالاتر قوت ہی پر عائد ہونی چاہیئے۔ اندرونی حاکمیت Sovereignty
کے وہ تمام مدارج جن سے والیان ریاست متمتع ہوتے ہیں سب کے سب بالاتر
قوت ہی کی جانب سے اس ذمہ داری کی مناسب انجام دہی کے ساتھ مقید ہیں۔
اس پر ایسی ہی دوسری مثالوں کا اضافہ کیا جاسکتا جو مذکورۂ بالا مثالوں سے
کچھ کم آپ کی اس رائے کی تغلیط نہیں کرتیں کہ باستثنائے امور متعلق بہ دول و
سیاسیات خارجیہ یور اگزالٹیڈ ہائی نس کی حکومت اور برٹش گورنمنٹ ایک ہی
درجہ مساوات پر قائم ہیں۔ مگر میں اس موضوع پر کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں
سمجھتا۔ میں صرف یہ اضافہ کروں گا کہ یور اگزالٹیڈ ہائی نس کو جو "یار وفادار"

کا خطاب حاصل ہے اس کا یہ اثر نہیں ہے کہ تاج برطانیہ کی سیادت میں آپ کی گورنمنٹ کو دوسری ریاستوں سے کوئی جداگانہ حیثیت حاصل ہو۔"

" آپ نے حیدر آباد اور دولت عالیہ کے تعلقات کے متعلق اپنے موجودہ تصور کی توضیح کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ ہز مجسٹی کی گورنمنٹ جن نتائج پر پہنچی ہے ان کو لفظ "فیصلہ" سے تعبیر کرنے میں میں نے غلطی کی ہے نیز یہ کہ قاعدہ "امر فیصل شدہ" کا اطلاق حیدر آباد اور حکومت ہند کے مابین نزاعی امور میں درست نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں یور اگزالٹیڈ ہائی نس کی اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ آپ کے پیش کردہ امور کے متعلق وزیر ہند کے احکام ایک "فیصلہ" کی حد تک نہیں پہنچتے۔ یہ دولت عالیہ کا حق اور امتیازی حق ہے کہ وہ ان تمام نزاعات کا فیصلہ کرے جو دو ریاستوں کے درمیان یا خود اس کے اور کسی ریاست کے درمیان پیدا ہوں۔ اگرچہ خاص خاص حالات میں ایک عدالت ثالثی بھی مقرر کی جا سکتی ہے مگر اس عدالت کا کام بھی اتنا ہی ہے کہ حکومت ہند کو آزادانہ مشورہ دے۔ باقی رہا فیصلہ تو اس کا حق حکومت ہند کو حاصل رہے گا۔"

" اب سے تھوڑے عرصہ پہلے حکومت ہند نے ایسے مسائل میں جن میں کوئی ریاست حکومت ہند کے فیصلہ سے مطمئن نہ ہو، عدالت ثالثی مقرر کرنے کے لئے ایک خاص قاعدہ مقرر کیا ہے۔ لیکن اگر آپ اس تحریر کو ملاحظہ کریں گے جو اس جدید انتظام پر مشتمل ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں کوئی ایسی دفعہ نہیں رکھی گئی ہے جس کی رو سے ایسے مقدمات میں بھی عدالت ثالثی مقرر کی جا سکتی ہو جن میں خود ہز مجسٹی کی گورنمنٹ نے فیصلہ صادر کیا ہو۔ نیز میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ ایک ایسے مقدمہ جیسا کہ یہ ہے جس میں ایک پرانی نزاع کا خاتمہ ایک سمجھوتہ کے ذریعہ کیا جا چکا ہے اور وہ سمجھوتہ بھی پورے غور و خوض کے بعد ایسی شرائط پر

ہوا ہے جو ابہام سے پاک ہیں، ثالثی کی غرض سے پیش کرنے کے لئے موزوں ہو سکتا ہے۔"

اس خط کو پڑھنے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ لارڈ ریڈنگ نے برار کے اصلی مقدمہ کو اس کے تمام قانونی اور واقعاتی نکات سمیت نظر انداز کر کے صرف اس امر پر زور دیا ہے کہ برٹش گورنمنٹ بالادست ہے اور دولتِ آصفیہ زیر دست، اس لئے اگر بالادست نے زیر دست کا ملک جبر سے یا حیلہ سے یا کسی طرح چھین لیا تو اب زیر دست کو یہ حق باقی نہیں رہا کہ اس سے کسی دلیل و حجت کا مطالبہ کرے یا اپنے دعویٰ استحقاق کو پیش کر کے اس پر بحث کرے یا کسی عدالت ثالثی کے ذریعے انصاف کرانے کی کوشش کرے۔ بالادست کو حق ہے کہ بلا دلیل اپنی تائید میں خود فیصلہ صادر کر دے اور زیر دست کا فرض ہے کہ خواہ وہ مطمئن ہو یا نہ ہو، ہر صورت میں اس کو قبول کر لے۔

دولتِ آصفیہ کو ایک ماتحت حکومت ثابت کرنے کے لئے لارڈ ریڈنگ کو تمام معاہدات وعہد ناموجات میں سے صرف ایک ۱۸۶۲ء کی سند مل سکی ہے جس کو کھینچ تان کر مشکل یہ معنی پہنائے جا سکتے ہیں کہ داخلی امور میں بھی دولتِ آصفیہ سلطنتِ برطانیہ کی تابع ہے حالانکہ ۱۸۰۰ء کا معاہدہ جس پر دولتین کے موجودہ تعلقات قائم ہیں اس کی صاف تردید کر رہا ہے۔ اگر بفرضِ محال یہ درست ہے کہ دولت آصفیہ حکومت برطانیہ کے مقابلہ میں ایک تابعانہ حیثیت رکھتی ہے تب بھی اس کی تابعیت برطانوی ہند کے رعایا سے زیادہ ادنیٰ تو نہیں ہے جنہیں حکومت کے خلاف عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹانے کا حق ہے۔ کیا سلطنت آصفیہ کا تاجدار برطانوی رعایا کے معمولی افراد سے بھی گیا گزرا کہ اس کو ایک آزاد اور غیر جانبدار کمیشن کے ذریعہ ان نکات کے متعلق تحقیقات کرانے کا حق بھی نہیں مل سکتا؟ یہ طریقہ برسرِ جنگ دشمنوں کے ساتھ اختیار کیا جائے تو چنداں قابلِ تعجب نہیں ہے مگر دوستوں کے ساتھ اور دوست بھی وہ جو مصیبت کے وقت جان کی جگہ جان اور روپے کی جگہ روپیہ قربان کرنے میں دریغ نہ کرتے ہوں اسے استعمال کرنا حق و انصاف ہی کا نہیں بلکہ انسانیت و شرافت کا بھی خون کرنا ہے

۱۹۳۵ء کے قانون وفاق ہند کے بعد ۱۹۳۶ء میں سلطنت برطانیہ کو نظام سے ایک جدید معاہدہ کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ برار کو وسط ہند کے چند صوبوں سے مربوط کر کے صوبجات متوسط و برار کے نام سے ایک نئے صوبہ کی تشکیل عمل میں لائی جاسکے۔ اس جدید صوبہ کے گورنر کے تقرر میں حیدرآباد کے مشورہ اور حیدرآباد کی جانب سے اس صوبہ میں ایجنٹ کا تقرر منظور کیا گیا۔ یہ معاہدہ در اصل ۱۹۰۲ء کے معاہدہ کا نعم البدل ہے اور وفاق ہند کے قیام کے سلسلہ میں قانونی جواز پیدا کرنے کے لئے علاقہ برار پر نظام کی حاکمیت کا دوبارہ اقرار و اعادہ کر کے اس کو ہمیشہ کے لئے برطانوی ہند میں مدغم کر لیا گیا۔ ولیعہد حیدرآباد کو پرنس آف برار کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ لیکن ظاہری اور نمائشی حاکمیت کے سوا برار پر حیدرآباد کا کسی قسم کا کوئی حق باقی نہ رہا۔

بہرکیف آصف جاہ اول سے آصف سابع تک ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے بعد تاج برطانیہ سے حیدرآباد کے تعلقات کی یہ روداد تھی جس سے یہ چیز ظاہر ہوتی ہے کہ جہاں تک معاہدات اور عہد ناموں کا تعلق ہے برٹش گورنمنٹ اور حیدرآباد کے تعلقات کی اساس مساوات پر قائم ہے۔ داخلی امور میں حیدرآباد کی آزاد حیثیت مسلمہ ہے لیکن خارجی تعلقات اور دفاع خود حیدرآباد کی غفلت اور انگریزوں کی ریاکاری اور فریب کارانہ سیاست کی وجہ سے انگریزوں کے قبضہ میں آگئے۔ اگست ۱۹۴۷ء تک جبکہ انگریزوں نے ہندوستان کی حکمرانی سے دستبرداری کر لی، تاج برطانیہ اور حیدرآباد کے تعلقات میں فرق نہ آیا۔

جہاں تک عملدرآمد کا تعلق ہے ان تعلقات کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ داخلی امور میں بڑی حد تک برطانوی مداخلت رزیڈنٹ کے ذریعہ قائم تھی۔ وزیر اعظم کا تقرر بالکلیہ وائسرائے کی نامزدگی کی بنا پر عمل میں آتا تھا لیکن دیگر وزراء اور کلیدی عہدوں کے تقررات بھی رزیڈنٹ کے ایما اور اشارہ کے بغیر نہیں ہوسکتے تھے۔ اس کے علاوہ کونسل (مجلس وزراء) میں مالگذاری کا سب سے اہم قلمدان انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ معتمدی مالگذاری، صدر نظامت

کوتوالی اضلاع اور چند اہم خدمات پر بھی انگریز ہی فائز تھے۔ حیدرآباد میں رزیڈنٹ کی ریشہ دوانیوں اور حکومتِ ہند کے محکمۂ سیاسیات کی کارستانیوں کو کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس کا مواد انتہائی راز کی مراسلت سے ماخوذ ہے۔

۱۸۶۰ء میں جبکہ تاج برطانیہ نے کمپنی کے پورے مقبوضات اور اختیارات کو اپنے حق میں سلب کر کے ہندوستان پر برطانوی شہنشاہیت کا اعلان کیا اُسوقت ہندوستان میں انگریزوں کی مدِمقابل کوئی قوت باقی نہ رہی تھی۔ اب تک انھوں نے ہندوستان کی برسراقتدار قوتوں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا اور یکے بعد دیگرے ان سب کو ختم کر دیا تھا۔ آخر میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اہلِ ہند کی ناکامی کے بعد مغلیہ سلطنت کے ٹمٹماتے چراغ کو بھی انگریزوں نے ہمیشہ کے لئے گُل کر دیا۔ اب ہندوستان کے طول و عرض میں صرف انگریزوں کی حکمرانی تھی جس کا سلسلہ ماہ اگست ۱۹۴۷ء تک جاری رہا جس کے بعد ہندوستان میں برطانوی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ انگریزوں کا ہندوستان میں ڈیڑھ سو سالہ دورِ حکومت فرنگی چالبازیوں کا ایک ایسا شرمناک مرقع ہے جس کی مثال تاریخ نہیں پیش کر سکتی۔

نوٹ:- اس باب کا ابتدائی حصہ "دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ" سے ماخوذ و ملخص ہے۔

۳

آصفِ سابع

نواب میر عثمان علی خان آصف سابع کا دورِ حکومت بیک وقت حیدرآباد کے عروج وزوال کی متضاد کیفیات کا حامل رہا ہے۔ مسند آرائی کی تاریخ ۲۸ اگست ۱۹۱۱ء سے ۱۸ ستمبر ۱۹۴۸ء تک جو حیدرآباد کے سقوط کی تاریخ ہے پورا زمانہ حیدرآباد کی مادّی ترقیوں، معاشی و اقتصادی بہبودیوں علمی اور تعلیمی سرگرمیوں کا بہترین زمانہ قرار دیا جاتا ہے۔ اسی عروج میں انحطاط و زوال کی قوتیں بھی مملکت کی جڑوں کو کھوکلی کرتی رہیں تا اینکہ دکن میں مسلم اقتدار ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔

حضرت غفران مکانؒ نواب میر محبوب علیخان کا دور گو سیاسی اعتبار سے کسی اہمیت کا حامل نہ تھا لیکن والیٔ ملک کی سیرچشمی، جود و سخا اور پاک طینتی نے ملک میں خوشحالی، اتحاد و یگانگت اور راعی و رعایا میں خلوص و محبت کی ایسی فضا پیدا کردی تھی جو نئے تاجدار کے دورِ حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی مفقود ہونے لگی تھی۔

ایامِ شہزادگی ہی سے آصف سابع حُبِ زر میں مبتلا تھے اور تخت نشینی نے سمندناز پر ایک اور تازیانہ کا کام کیا۔ حالات ملک سے واقفیت حاصل کرنے کے بلند بانگ مقصد کے تحت سارے اضلاع ممالک محروسہ سرکار عالی کا دورہ اختیار کیا گیا اور ہر جگہ "نذرانے" وصول کرنے کی منظم کوشش کی گئی۔ جس عہدہ دار کی سعی و جستجو سے زیادہ نذر وصول ہوتی تھی وہ الطاف شاہانہ کا زیادہ سے زیادہ مستحق قرار پاتا تھا۔ عہدہ داروں نے بادشاہ کے نام سے

رعایا کو لوٹنا شروع کیا جس سے نظم ونسق میں ابتری پیدا ہوگئی۔ اعلیٰ اور اوسط خدمات پر راست فرمان کے ذریعہ تقررات کئے جانے لگے جس سے سررشتہ جات کے افسران بالا کے اختیارات تقرر عملاً سلب ہو کر رہ گئے۔ خدمات کی نوعیت کے لحاظ سے فرمان کی قیمت مقرر تھی۔ اس طریقۂ عمل سے ملک میں تقرر اور ترقی کا کوئی معیار باقی نہ رہا اور عہدہ داروں میں صلاحیت اور اہلیت ختم ہو کر رہ گئی فرمان سے مقرر ہونے والے ہر عہدہ دار نے رشوت اور جلب منفعت کو اپنا مقصد اولین قرار دیا جس کی وجہ سے سارا ماتحت عملہ اسی رنگ میں رنگ گیا۔

آصف سابع عین عنفوانِ شباب میں جبکہ ان کی عمر ۲۷ سال تھی سریر آرائے تخت آصفی ہوئے تھے۔ اس عمر میں زمانہ کے نشیب وفراز کا انھیں کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ خود اپنی ولیعہدی کے خلاف سازشوں کو نشوونما پاتا انھوں نے دیکھا تھا۔ عمائدین سلطنت مصاحبین دربار اور اعلیٰ عہدہ داروں کے کردار واطوار سے وہ بڑی حد تک واقف تھے ان کی تعلیم وتربیت پر بھی کافی توجہ صرف کی گئی تھی۔ غرض عنانِ حکومت ہاتھ میں آنے کے بعد انھیں کسی رہبر کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ سابقہ روایات سے انحراف کرتے ہوئے تخت نشینی کے تین سال بعد ۱۹۱۴ء میں وزارت عظمیٰ کے عہدہ کو ختم کر کے آصف سابع نے اس عہدہ کو بہ نفس نفیس خود سنبھال لیا اور پانچ سال تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ یہ ان کا بڑا استبدادی دور تھا اور مطلق العنان حاکم کی ساری خصوصیات ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ فرمانروائے ملک کی حیثیت سے وہ ایک طرف اقتدار کا سرچشمہ تھے اور دوسری طرف وزیر اعظم کی حیثیت سے حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں تھی۔ کریلا اور اس پر نیم چڑھا۔ چنانچہ ان کی حکمرانی کا یہ دور اہل ملک کے لئے انتہائی تلخ رہا۔

مسند آرائی کے یہ ابتدائی چند سال حیدرآباد پر اتنے صبر آزما گذرے ہیں کہ ۱۹۱۹ء میں برطانوی حکومت کو حیدرآباد کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنی پڑی

اور اس کے منشاء کے مطابق حیدر آباد میں کونسل (مجلسِ وزراء) کا قیام عمل میں آیا اور
وائسرائے ہند کے انتخاب کی بنا پر سر علی امام کا صدارتِ عظمیٰ پر تقرر منظور کیا گیا۔

سر علی امام کو برطانوی ہند کے نظم و نسق کا بڑا وسیع تجربہ تھا۔ ہندوستان کے چوٹی
کے وکلاء میں ان کا شمار کیا جاتا تھا اور وہ حکومت ہند میں وزیر قانون رہ چکے تھے۔
برطانوی حکومت پر ان کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ انھوں نے حیدر آباد میں بڑی اچھی ابتداء
بھی کی۔ انتظامی خرابیوں اور رشوت ستانی کا قلع قمع کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ
نا اہل اور بد دیانت عہدہ داروں کو ان کی ملازمتوں سے سبکدوش کیا۔ عدلیہ کو عاملہ سے
علٰحدہ کرکے پورے برصغیر ہند میں ایک قابل تقلید مثال قائم کردی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے
متوسط خاندانوں کے لڑکوں کو حکومت کے وظیفوں پر یورپ اور انگلستان روانہ کیا۔
مسلمانوں کے مستقبل کو درخشندہ بنانے کے لئے اُنھوں نے ان کی تناسب آبادی میں اضافہ
کرنے کے لئے ایک نو آبادیاتی اسکیم منظور کی جو اگر کامیاب ہوجاتی تو بڑے دور رس نتائج
کی حامل رہتی اور مسلمان (۱۵) فیصدی اقلیت میں رہ کر اقتدار کی جنگ نہ ہارتے۔ چونکہ اس
اسکیم کا آغاز ملابار کے موپلاؤں کی آبادکاری سے ہو رہا تھا جو اپنی انگریز دشمنی کے لئے
مشہور تھے اس لئے رزیڈنسی نے مخالفت شروع کی اور ادھر ہندوؤں نے بھی اپنے مستقبل
کے لئے خطرہ محسوس کیا۔ نظام کو سر علی امام سے نجات حاصل کرنے کا موقع مل گیا جس کی وہ تاک
میں تھے۔ درباری سازشوں سے تنگ آکر اواخر ۲۳ء میں سر علی مستعفی ہو کر حیدر آباد سے
چلے گئے۔ نظم و نسق میں پھر ابتری پھیلنے لگی اور دو تین سال کے عرصہ میں حالات اتنے
ناگفتہ بہ ہوگئے کہ سر ولیم بارٹن رزیڈنٹ نے حیدر آباد کے اندرونی معاملات میں وائسرائے
ہند کو مداخلت کرنے پر آمادہ کرلیا۔ صدر المہامی مال جیسا وقیع قلمدان کوتوالی کے ساتھ ایک
انگریز عہدہ دار کے تفویض کیا گیا۔ معتمدی مالگذاری، صدر نظامت کوتوالی اور بعض اہم
کلیدی عہدوں پر انگریز لائے گئے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان انگریز

عہدہ داروں کی آمد کے بعد نظم ونسق میں ایسی اصلاح ہوئی جس کا حیدرآباد نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا تھا۔ بد دیانت اور نا اہل عہدہ دار ختم ہو گئے۔ تقررات میں دربار کا اثر کم ہو گیا اور قابلیت وصلاحیت ترقی کا معیار قرار پائے۔ لیکن اس کے باوجود اُن کارروائیوں میں جو محتاج منظوریٔ خسروی ہوتی تھیں نذر ونیاز کا سلسلہ آخر وقت تک قائم رہا۔

حیدرآباد کے ۸۲ ہزار مربع میل کے رقبہ کے منجملہ تقریباً ایک عُشر یعنی (۸،۱۰۹) مربع میل صرفخاص کا علاقہ تھا جس کو والیٔ ملک کی خانگی ملک تصور کیا جاتا تھا۔ اس کی آمدنی ڈھائی کروڑ سالانہ تھی۔ اس کے محکمہ جات مال، عدالت، پولس وغیرہ علیحدہ تھے۔ اس کا ایک علیحدہ صدرالمہام ہوتا تھا جو صرف والیٔ ملک کے سامنے ذمہ دار تھا۔ بالعموم علاقہ دیوانی کے وظیفہ یاب عہدہ داروں کو یہاں مامور کیا جاتا تھا جو عمر طبعی کو پہنچنے کی وجہ سے دیوانی میں ازکار رفتہ قرار پاتے تھے لیکن صرفخاص میں ان کو اہل اور کارآمد تصور کیا جاتا تھا۔ صرفخاص کا علاقہ بلحاظ نظم ونسق دیوانی علاقہ سے بہت پست تھا۔ یہاں کسی قسم کی ترقیاتی اسکیم کو روبہ عمل نہیں لایا گیا تھا، تعلیم اور حفظان صحت کی حالت ناقص تھی اور عدالتی اور انتظامی سررشتہ جات کا معیار بہت پست تھا۔ ملازمین کی تنخواہیں بہت کم تھیں اور وقت پر کبھی تقسیم بھی نہ ہوتی تھیں۔ غرض جو علاقہ والیٔ ملک کے قبضہ اور ملکیت میں تھا اس کی یہ حالت تھی۔

دیوانی علاقہ وہ تھا جس کی آمدنی سے حکومت کی مشنری چلتی تھی۔ ممالک محروسہ کے کل رقبہ کا یہ حصہ دو ثلث تھا گویا ایک ثلث صرفخاص اور جاگیری علاقوں پر مشتمل تھا۔ حیدرآباد کی ساری ترقی دیوانی علاقہ کی آمدنی کی رہین منت ہے۔ مادی نقطۂ نظر سے حیدرآباد ایک نمونہ کی ریاست تھی اس کا نظم ونسق، عدلیہ، نظام تعلیم کا معیار متصلہ صوبجات سے کافی بلند تھا۔

اندرون ملک رعایا اور مزارعین کی فلاح وبہبود کے لئے بڑے بڑے پراجکٹ تعمیر

تعمیر کیے گئے تھے جس سے لاکھوں ایکڑ اراضی سیراب ہوتی تھی۔ ملک کی صنعتی ترقی کے لئے کئی کروڑ پر مشتمل ایک فنڈ قائم تھا اور صنعتوں کی حکومت کی جانب سے سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ شکر، کاغذ، سمنٹ اور کوئلہ میں حیدرآباد خود مکتفی تھا بلکہ ہندوستان کے اکثر صوبجات کو یہ چیزیں برآمد کی جاتی تھیں۔ اسی طرح ملک میں معاشی اور سماجی بہبود کے بہت سے ادارے تھے۔ غرض حیدرآباد مادی آسائشوں کے اعتبار سے ایک ترقی یافتہ مملکت تھی اور اس کی یہ ساری ترقی عہد عثمانی کی پیداوار تھیں۔

حیدرآباد کو ہمیشہ سازشوں کے اکھاڑہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے حقیقت بھی یہ ہے کہ جس ملک میں مختلف قوتیں برسرکار ہوں اور ہر ایک کا نقطۂ نظر دوسرے سے مختلف ہو وہاں سازش کا نشو و نما پانا بعید از قیاس بھی نہیں ہوسکتا۔ دربار، مجلس وزراء اور رزیڈنسی یہ اُس مثلث کے تین زاویے تھے جس کو حیدرآباد کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دربار ہمیشہ اپنے آپ کو سرچشمۂ اقتدار قرار دے کر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔ مجلس وزراء اپنے وجود کے لئے دربار اور رزیڈنسی دونوں کے رحم و کرم کی محتاج تھی اور رزیڈنسی چور دروازہ سے حیدرآباد کی سیاست کو برطانوی اغراض کے تابع رکھنے کی طرف مائل رہتی تھی۔ ان تینوں کے تصادم کو روکنے کے لئے سازش ہی کے حربہ سے کام لیا جاسکتا تھا۔ دربار کے پیش نظر ملک سے زیادہ شخصی اور خاندانی اقتدار کی بحالی کا سوال رہتا تھا۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ساری سازشوں کی ابتداء دربار سے ہوتی تھی اور ان کو ہوا دینے کے لئے ایک سے بڑھکر ایک مصاحبین وہاں موجود تھے۔

حیدرآباد میں دربار کی سیاست کے علاوہ عامۃ الناس میں پہلی گول میز کانفرنس تک کوئی سیاسی بیداری نہیں تھی۔ وفاق ہند کے قیام کے امکانات جب روشن ہونے لگے اور کانگریس نے پہلی مرتبہ ریاستی معاملات میں مداخلت کی پالیسی منظور کی تو حیدرآباد میں ذمہ دارانہ حکومت کا علی الاعلان مطالبہ ہونے لگا۔ مسلمان جب اپنے حقوق کی حفاظت کے

لے بیدار ہوئے تو شاہی اقتدار کے تحفظ کی دربار میں سازشیں شروع ہوگئیں۔ بہادر یار جنگ ایک جاگیردار اور متوسل شاہی ہونے کی وجہ سے بڑے شاہ پرست تھے لیکن ان کی شاہ پرستی مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر تھی۔ اپنے ان خیالات کا بارہا انھوں نے پلیٹ فارم سے اظہار کیا۔ ان کے اس سیاسی کلمہ کو کہ تخت و تاج آصفی مسلمانوں کے اقتدار سیاسی کا مظہر ہے اور مسلمان اس اقتدار کے شریک و سہیم ہیں' غلط رنگ دے کر بہادر یار جنگ پر "انا الملک" کا بیہودہ الزام تراشا گیا جس میں پیش پیش علمائے دکن تھے اور اشارہ دربار کا تھا بہادر یار جنگ کے قائدانہ عروج کو توڑنے کے لئے ابوالحسن سید علی کو دربار میں باریاب کیا جانے لگا اور ان کی اخباروں میں تعریف کی جانے لگی۔ بہادر یار جنگ کی موت میں بھی جو اچانک حقہ کا ایک کش لینے کے بعد واقع ہوئی تھی بعض حلقوں کی جانب سے دربار کو ملوث کیا جاتا ہے لیکن حقیقت حال کیا ہے کسی کو نہیں معلوم اور نہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی۔

ابوالحسن سید علی نے اتحاد المسلمین کے صدر کی حیثیت سے اپنی مجلس عاملہ کو اعتماد میں لئے بغیر ہندو زعما سے مصالحت کر کے باب حکومت میں چند عوامی وزرا کو لئے جانے اور بعض مخصوص شاہی اختیارات بجٹ اور پبلک اخراجات کو مجلس مقننہ کی منظوری کا محتاج قرار دینے کے لئے سمجھوتہ کیا تو ملک میں ایک ہڑبونگ مچ گئی جس میں سب سے زیادہ پیش پیش دربار اور یہاں کے مصاحب تھے۔ شاہی اقتدار کی کشتی کو عوامی طوفان کا خطرہ لاحق ہوگیا تھا۔ ابوالحسن سید علی کی صدارت کا تختہ الٹنے کی سازش کی گئی۔ اتحاد المسلمین کی عاملہ کے ارکان کو دربار میں باریابی کی عزت سے مفخر کیا جانے لگا۔ یوں دیکھا جائے تو دربار اور حکومت حیدرآباد نے سازش کر کے ابوالحسن سید علی کو اتحاد المسلمین کی صدارت سے نکلوایا تھا۔

نظام اپنی ریاست میں انگریزوں کے عمل دخل کو پسند نہیں کرتے تھے اور حکومتی عہدوں پر انگریز عہدہ داران کی آنکھوں میں کھٹکتے تھے لیکن اس میں جو جذبہ کار فرما تھا وہ قومی مفاد

کی بقا کی خاطر نہ تھا بلکہ اپنی مطلق العنانی کی بحالی مقصود تھی لیکن برطانوی پیراموئنٹسی کی گرفت
کچھ اتنی مضبوط تھی کہ وہ کچھ کر نہیں پاتے تھے ۔ انگریزوں کے پاس حیدرآباد کو اس وقت
تک بڑی اہمیت حاصل رہی جب تک ان کے دل میں ہندوستان سے دامن جھٹک کر
چلے جانے کا خیال پیدا نہیں ہوا لیکن جوں ہی ہندوستان چھوڑنے کا انھوں نے فیصلہ
کیا ۔ حیدرآباد، اس کے سارے احسانات، اس کی دوستی اور وفادارانہ خدمات کو
فراموش کر دیا اس کے سوا وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے ۔ انھیں ہندوستان کی نئی قومی
حکومت سے اپنے معاشی اور تجارتی تعلقات قائم کرنے تھے تاکہ یہاں کی سیاست سے
کنارہ کش ہونے کے بعد ہندوستان کو برطانیہ کا معاشی اور اقتصادی حیثیت سے
دست نگر کیا جا سکے ۔ اپنے اس مفاد کی خاطر وہ نظام حیدرآباد اور کسی والئ ریاست
کے ساتھ مخصوص سلوک کرنے کے موقف میں نہیں تھے ۔

ہندوستان سے انگریزوں کی مراجعت کے بعد نظام اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے
تھے کہ حیدرآباد کے دیرینہ وفادارانہ خدمات کا برطانوی حکومت ضرور لحاظ کرے گی اور برطانوی
دولت عامہ میں حیدرآباد کو شرکت کا موقع دیا جائے گا ۔ چنانچہ تقسیم ہند کی معینہ تاریخ
کے قبل ۹ر اگست ۱۹۴۷ء کو نظام نے لارڈ مونٹ بیٹن کے نام نمائندہ تاج کی حیثیت
میں قانون حکومت ہند کی دفعہ ۷ کی تدوین پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا تھا کہ انگریزوں
نے حیدرآباد سے کئے ہوئے سارے عہد ناموں کو یکطرفہ حیدرآباد سے استمزاج
کئے بغیر منسوخ اور حیدرآباد کو برطانوی دولت عامہ کے جزو بننے سے محروم کر دیا ۔ ایک سو سال
کے وفادارانہ اشتراک کے بعد نظام کو یقین تھا کہ انگریز کسی نہ کسی طرح دولت عامہ میں حیدرآباد
کے لئے گنجائش نکالیں گے ۔ لیکن مذکورہ دفعہ میں ایسی کوئی صورت رکھی ہی نہیں گئی
تھی اور ہندوستان اور پاکستان کی دونوں جدید مملکتوں میں سے کسی ایک میں شریک
ہوئے بغیر دولت عامہ کے جزو بننے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ نظام کو امید تھی کہ حیدرآباد

کی خاطر قانون میں ترمیم کی جائے گی۔ لیکن نظام کا یہ خط حکومت برطانیہ کو ارسال تک نہیں کیا گیا اور نو ماہ کی طویل مدت کے بعد جب اس کے جواب پر اصرار کیا گیا تو مونٹ بیٹن نے دفتری غلطی کی بنا پر خط ملکِ معظم کی حکومت کو روانہ نہ ہو سکنے کا عذر کیا۔ انگریزوں کے پاس اس خط کا جواب ہی کیا تھا۔ ہندوستان سے دامن جھٹکنے کے بعد انھیں حیدرآباد سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ انڈیا یونین سے گفت وشنید کو طول دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نظام آخر وقت تک اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ انگریز ان کا ساتھ دیں گے۔ انگریزوں کی طوطاچشمی کا انھیں بہت بعد میں احساس ہوا۔

سر والٹر مانکٹن ایک عرصہ سے نظام کے مشیر دستوری تھے۔ انگلستان کے ایک مسلمہ بیرسٹر تھے، حکومت برطانیہ پر ان کا کافی اثر تھا اور مونٹ بیٹن کے یہ شخصی دوست بھی تھے حیدرآباد کے دستوری مسائل، اس کے مخصوص حالات، روایات اور تاج برطانیہ سے اس کے تعلقات کی نوعیت سے بخوبی واقف تھے۔ ان کی حیثیت ایک وکیل کی تھی اور اپنے وکیلانہ فرائض سے عہدہ برآ ہونے میں انھوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مونٹ بیٹن کا بھی انھیں اعتماد حاصل تھا۔ اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لاکر حیدرآباد کے مسئلہ کو جس حد تک سلجھایا جا سکتا تھا انھوں نے پوری سعی کی لیکن حیدرآباد کی مجلس وزراء اور قاسم رضوی کی ناعاقبت اندیش اور غیر مفاہمانہ روش اور نظام کے تذبذب نے انڈیا یونین سے ایک باعزت سمجھوتہ کی صورت پیدا نہ ہونے دی[1]

یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نظام قاسم رضوی اور ان کی رضاکارانہ جمعیت سے مرعوب تھے۔ وہ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ پولس اور فوج ان کے ساتھ نہیں ہے اور مسلمانوں کی مرضی

---

[1] سر والٹر مانکٹن انگلستان کے ایک مسلمہ بیرسٹر تھے اور برطانوی حکومت میں ان کا کافی اثر و رسوخ تھا۔ یہ شاہ ایڈورڈ ہشتم کے مشیر قانون بھی رہ چکے ہیں اور ان کے تخت سے دست کشی کے وقت جو دست برداری نامہ پیش ہوا اور جس نے ساری دنیا میں شہرت حاصل کی اس کا مسودہ سر والٹر مانکٹن نے کیا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد کے زمانہ میں یہ برطانیہ کی لیبر حکومت میں وزیر بھی مقرر ہوئے تھے

کے خلاف وہ کوئی جرائت مندانہ اقدام نہیں کر سکتے۔ یہ خدشات ایک حد تک اپنی جگہ صحیح بھی تھے لیکن والئِ ملک کی حیثیت سے وہ ان سے بہت آسانی سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے۔ لیکن ایک طرف ان کا جذبۂ آزادی تھا جس کی خاطر وہ اپنی حکومت کی ہر من مانی تجویز کو قبول کرتے رہے دوسری طرف تخت وتاج اور خانوادۂ آصفی کی بقا اور اپنی بے دریغ شخصی دولت کی حفاظت کے تصور نے سر مرزا اسمٰعیل کے توسط سے انڈیا یونین سے مصالحت کرنے کی انھوں نے ناکام کوشش کی۔

انڈیا یونین سے مفاہمت کا دروازہ بند ہونے کے بعد جب حالات نے انتہائی سنگین صورت اختیار کرلی تو وہ بوکھلا گئے۔ اپنی حکومت کا آخر وقت تک ساتھ دینے کا جب کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تو نظام نے ہندوستانی ایجنٹ جنرل کے یم منشی سے مجلسِ وزراء کی تحلیل اور ایک جدید مجلس مشاورۃ کی تشکیل کا تصفیہ کیا اور موخرالذکر نے جون ۴۸ء کے مسودہ معاہدہ کی بنیاد پر انڈیا یونین اور حیدرآباد میں سمجھوتہ کرانے کا وعدہ کیا لیکن پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ انڈیا یونین نے حیدرآباد پر فوج کشی کردی تھی اور حیدرآباد سے ایک مفتوحہ ملک سے زیادہ وہ کسی قسم کی رعایت کی قائل نہ تھی چنانچہ کے یم منشی کی تحریر کردہ اُس تقریر کے باوجود جو نظام نے ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے پہلی مرتبہ نشر کی تھی اور مجلس مشاورۃ کے ارکان کے نام کا اعلان کیا تھا، اُس سمجھوتہ کو اس کی سیاہی خشک ہونے کے قبل ہی انڈیا یونین نے طاق نسیاں کردیا۔ کے یم منشی علالت کے عذر پر حیدرآباد سے جو غائب ہوئے تو پھر ادھر کا رخ نہ کیا۔ حیدرآباد کا نظم ونسق ملٹری گورنر کے سپرد کیا گیا اور پورے ملک میں مارشل لا کا نفاذ عمل میں آیا۔

نظام نے بجز اس سمجھوتہ کے جو انھوں نے کے یم منشی سے کیا تھا اور مفاہمت کی اُس غیر نتیجہ خیز کوشش کے جو سر مرزا کے ذریعہ کی گئی تھی اپنی حکومت اور اسکی پالسیوں کے خلاف کوئی معاندانہ روش اختیار نہیں کی بلکہ آخر وقت تک اپنی حکومت کا ساتھ ہی دیا۔

حیدرآباد پر فوجی حملہ اور حیدرآباد کے ہتیار ڈالنے کے بعد نظام کی حیثیت انڈیا یونین کے ہاتھ میں ایک قیدی سے زیادہ نہ تھی۔ وہ ملٹری گورنر کے ربر اسٹامپ میں تبدیل ہوگئے تھے۔ حیدرآباد پر ملٹری گورنر کی حکومت قائم تھی اور نظام اس کے آلۂ کار تھے۔ فوجی حکومت کے زمانہ میں نظام نہ اپنی آزاد مرضی کے مالک تھے اور نہ ان کا کوئی عمل خود ان کا عمل تھا۔

انڈیا یونین نے حیدرآباد پر قبضہ کرنے کے بعد اس کو جبراً ہندوستانی علاقہ میں شامل کرلیا اور اپنا دستور یہاں نافذ کردیا۔ ریاستوں کے انضمام کی اسکیم کے تحت نظام کے ساتھ عام ہندوستانی رؤسا کی طرح سلوک کیا گیا۔ ان کے خاندانی خطابات اور اعزازات کو باقی رکھکر ان کے اور ان کے خاندان کے لئے ایک وظیفہ مقرر کردیا گیا۔ لیکن نہ مجلس دستور ساز قائم کی اور نہ استصواب رائے کی ضرورت محسوس کی حالانکہ ادارۂ اقوام متحدہ کے سامنے یہ سارے مواعید کئے گئے تھے۔ ابتداء میں نظام کو راج پرمکھ کی حیثیت دی گئی تھی لیکن صوبہ آندھرا کے قیام اور حیدرآبادی علاقوں کی تقسیم کے بعد ان کی یہ حیثیت بھی ختم ہوگئی۔ اب اپنے ملک میں ان کی حیثیت ایک معزز شہری سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

نہم

حیدرآباد کا اعلانِ آزادی

پیراموئنٹسی یا نظریۂ اقتدار اعلیٰ ہندوستانی ریاستوں سے کئے ہوئے معاہدات اور عہد ناموں کے خلاف ان کی اندرونی آزادی کو سلب کرنے کا ایک حربہ تھا جو برطانوی حکومت نے اپنے طور پر گھڑ لیا تھا اور قانوناً اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ خود انگریزوں نے اس کی کبھی تعریف یا تشریح نہیں کی اور ہمیشہ اس کو ایک تلوار کی طرح رؤسا کے سروں پر لٹکائے رکھا۔ حیدرآباد کے آخری رزیڈنٹ نے اپنی کتاب میں جو تقسیم ہند کے بعد شائع ہوئی پیراموئنٹسی کی حسب ذیل تعریف کی ہے:۔

"پیراموئنٹسی کا تصور بہت آسان ہے کیونکہ یہ وہ اقتدار ہے جو نسبتاً ایک بڑی اور طاقتور مملکت جائز طور پر اُن چھوٹی مملکتوں پر استعمال کرتی ہے جو کسی طرح اس کے تابع ہوں۔ ہندوستانی ریاستوں کے معاملہ میں برطانوی حکومت ان کے دفاع اور خارجی معاملات کی ذمہ دار تھی اور اس لئے عملاً اس کی بالادستی (پیراموئنٹسی) کے مفہوم میں وہ سارے باہمی حقوق اور واجبات شامل ہیں جو امتداد زمانہ کے ساتھ اس ذمہ داری کی انجام دہی کے لئے ضروری سمجھے گئے۔ لہٰذا فریقین کے واقعاتی تعلقات کے نتیجہ کو پیراموئنٹسی کا نام دیا جاتا ہے اور جو بجائے خود کوئی استحقاق نہیں ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہ کوئی قابل انتقال حق نہ تھا جو برطانوی حکومت اپنے کسی جانشین کو منتقل کرتی بلکہ وہ ایک ایسی شئے

تھی جو آنیوالی حکومتیں رفتہ رفتہ ریاستوں سے اپنے جدید تعلقات کی بنا پر خود حاصل کرتیں۔

علاوہ ازیں ایک مملکت اور دوسری مملکت کے درمیان اس کے عملی اظہار کے طریقے مختلف معاشی یا جغرافی حالات کی بناء پر متنوع تھے۔ مثال کے طور پر سمندر سے متصل مملکت کے ساتھ وہی سلوک روا نہیں رکھا جاسکتا جو ایسی مملکت کیساتھ جائز سمجھا جاتا ہے جو ارضی طور پر چاروں طرف سے گھری ہوئی ہو۔ لیکن عمل پیرائی کا اصول ہمیشہ ایک ہی تھا کہ دوسری حکومت کے معاملات میں برطانوی حکومت اپنے عام اختیارات کی انجام دہی کے ضمن میں کم سے کم مداخلت کرے۔ جب ہندوستان اور پاکستان کی جدید مملکتیں وجود میں آئیں تو وہ قدیم معاہدات جو برطانوی بالادستی کے مختلف مظاہر کا سرچشمہ تھے، ختم ہوگئے اور بادی النظر میں ان دونوں مملکتوں سے ریاستوں کے تعلقات کی صورتگری کی ازسرنو ضرورت درپیش ہوگئی کیونکہ نئی مملکتیں بلحاظ وسعت اور اقتدار برطانوی حکومت کی ہمسر نہیں قرار دی جاسکتی تھیں اور اس لئے اُن واجبات کی تکمیل کے موقف میں نہیں تھیں جو برطانوی حکومت اب تک انجام دیتی رہی ہے[لے]"

کانگریس کا ابتداء سے یہ ادعا تھا کہ ہندوستان کو آزادی حاصل ہونے کے بعد ہندوستان کی جدید حکومت ہر معاملہ میں برطانوی حکومت کی جانشین ہوگی اور ریاستوں کے اندرونی معاملات میں اس کو پیرامونٹسی کے وہی اختیارات حاصل ہوں گے جو برطانوی حکومت کو حاصل تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۰ء میں گاندھی جی نے بھی ان خیالات کا اظہار کیا تھا جس کا سر سی پی راماسوامی ایر دیوان ٹراونکور نے یہ جواب دیا تھا کہ بہت سی ریاستوں بشمول حیدرآباد اور ٹراونکور کو برطانوی حکومت نے فتح نہیں کیا اور صدیوں سے ان کی خودمختارانہ حیثیت مسلمہ ہے۔ اور یہ کہ اگر انگریز ہندوستان سے دستبردار ہوجائیں تو ہندوستانی ریاستیں اس حیثیت پر عود کر آئیں گی جو برطانوی حکومت سے معاہدات

Kingdoms of Yesterday by Sir Arthur Lothian. لے

کے قبل انھیں حاصل تھی۔ اس کا جواب الجواب گاندھی جی کے اخبار "ہریجن" میں پیارے لعل نائر کے ایک مضمون میں دیا گیا تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ برطانوی حکومت نے ریاستوں سے جو معاہدات کئے تھے ان کی اساس مساوات کی بنیاد پر قائم نہیں ہے جن میں تاج برطانیہ کی جانب سے یکطرفہ طور پر تنسیخ یا ان میں تبدیلی نہ کی جا سکتی ہو۔ علاوہ ازیں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان معاہدات کی ابتدائی شرائط کے قطع نظر گذشتہ نصف صدی کے عملدرآمد نے تمام ریاستوں کو خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی تاج کے تعلق سے "محکومانہ اشتراک" کے درجہ میں منتقل کر دیا تھا۔ اس کی تائید میں لارڈ ریڈنگ کے اس خط کا حوالہ دیا گیا تھا جو نظام دکن کو لکھا گیا تھا اور جس میں مرقوم تھا:۔

"کوئی والیٔ ریاست برٹش گورنمنٹ کے ساتھ مساویانہ طریق پر گفت و شنید کرنے کا دعویٰ کرنے میں حق بجانب نہیں ہو سکتا۔ تاج کی برتری صرف معاہدات اور عہد نامہ جات ہی پر مبنی نہیں ہے بلکہ ان سے بے نیاز ہو کر بھی قائم ہے"۔

اخبار ہریجن کے اس مضمون میں بٹلر کمیٹی کی رپورٹ کے اس جزو کا حوالہ بھی دیا گیا تھا جس میں ریاستوں کی خود مختارانہ حیثیت کو اس طرح بیان کیا گیا تھا:۔

"یہ امر تاریخی حقائق کے مغائر ہے کہ برطانوی اقتدار سے تعلق پیدا کرتے وقت ہندوستانی ریاستیں خود مختار تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی ریاست کو کبھی بین الاقوامی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ تقریباً ساری ریاستیں مغلیہ شہنشاہیت، مرہٹہ اقتدار یا سکھ شاہی کے تابع یا ان کی باجگذار اور محکوم تھیں جن میں سے چند کو باقی رکھا گیا اور بعض کو انگریزوں نے قائم کیا"۔

مضمون کے آخر میں کانگریس کے عزائم کا ان الفاظ میں اظہار کیا گیا کہ:

"موجودہ جمہوری دور میں ریاستوں کے اس ادعا پر عمل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تاریخ کے ڈیڑھ سو سال کے دھارے کو جو سیاسی ترقیوں کا مصروف

عہد ہے اس طرح نقش بر آب نہیں کیا جا سکتا اور نہ عملاً یہ ممکن ہے۔ موجودہ دور میں کسی ریاست کی پوری آبادی ان کی مرضی کے بغیر گرو یا رہن کے طور پر استعمال نہیں کی جا سکتی۔"

بہر کیف یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی کہ کانگریس برطانوی اقتدار کے خاتمے کے بعد اپنے آپ کو برطانوی اقتدار اعلیٰ کا نہ صرف جانشین بلکہ پیرامونٹسی کے استعمال کا بھی اپنے آپ کو اتنا ہی مستحق سمجھتی تھی جتنا کہ برطانوی حکومت کو اپنے دورِ حکمرانی میں استحقاق تھا۔ پیرامونٹسی کی نوعیت خواہ کچھ ہو لیکن تاج برطانیہ اور ہندوستانی ریاستوں کے تعلقات کی اساس وہ عہد نامہ جات اور معاہدات ہیں جو دونوں کے مابین طے پائے تھے اور دونوں پر ان کی پابندی اور احترام لازم تھا۔ یہ کتنی شرمناک بات ہے کہ ہندوستان کی سیاست میں جب انگریزوں کے اقتدار کی کشتی ہچکولے کھانے لگی اور ہندوستان سے دست کش ہونے کا انگریزوں نے فیصلہ کیا تو ریاستوں سے کئے ہوئے سارے معاہدات کو ان سے استمزاج کے بغیر یکطرفہ طور پر انگریزوں نے طاق نسیاں کر کے ہندوستان کی جدید حکومت سے معاملہ کر لیا۔ پیرامونٹسی کے اختتام کا برائے نام اعلان تو کیا گیا لیکن عملاً ریاستوں کو ہندوستان کی جدید حکومت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

برطانوی کابینہ مشن نے ۱۲ رمئی ۱۹۴۶ء کو رؤسائے ہند کو اطلاع دی کہ جب برطانوی حکومت ہندوستان کا تسلط چھوڑے گی تو پیرامونٹسی جو اس کو ریاستوں پر حاصل ہے وہ اس کی جانشین حکومت یا حکومتوں کو منتقل نہیں کی جائے گی بلکہ ختم ہو جائے گی اور ریاستیں اس حالت پر عود کر آئیں گی جو معاہدات کے قبل انھیں حاصل تھی۔

کابینی مشن کے اس وعدہ کو برطانوی حکومت نے قانون آزادیٔ ہند کی دفعہ ۷ میں مدوّن کیا جس کے اثرات پر ۱۲ر جولائی ۱۹۴۷ء کو برطانوی وزیر اعظم نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا :-

---

Status of Indian Princes. ۵

"ہندوستانی ریاستوں پر پیراموئنٹسی اور پیراموئنٹسی کے تحت سیاسی مواعید اور تاج اور ریاستوں کے باہمی حقوق واجبات جو ان سے پیدا ہوئے ہیں وہ ختم ہوجائیں گے۔ صلح نامہ جات اور معاہدات کے اختتام پر ریاستیں اپنی آزادی حاصل کریں گی۔.... ملک معظم کی حکومت یہ توقع رکھتی ہے کہ تمام ریاستیں بتدریج برطانوی دولت عامہ کے تحت ایک یا دوسری مملکت میں اپنا جائز مقام حاصل کرلیں گی۔ لیکن جدید مملکتوں کے دساتیر کی تدوین تک جن میں ریاستوں کے لئے شرکاء رضامند کی حیثیت سے شمولیت کی گنجائش رکھی جائے گی لازمی طور پر آپس کے تعلقات اتنے پیوست نہ ہوسکیں گے اور تفصیلی طریقۂ عمل مرتب ہونے تک ایک عرصہ لگ جائے گا۔"

اٹارنی جنرل نے بھی پارلیمنٹ کے مباحث میں حصّہ لیتے ہوئے ۱۵ جولائی ۱۹۴۷ء کو بیان کیا:-

"ملک معظم کی حکومت کو یقین ہے کہ ریاستوں کا مستقبل ناگزیر طور پر برطانوی ہند سے اشتراک پر مبنی ہے جس کے علاقوں سے خود ان کے علاقے متصل و پیوست ہیں لیکن اس خصوص میں ریاستیں جو فیصلہ کریں گی وہ ان کا اپنا فیصلہ ہوگا اور ہم ان پر کسی قسم کا دباؤ ڈالنا نہیں چاہتے .... ہمیں امید ہے جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ ریاستیں جدید مملکتوں میں سے کسی ایک سے اشتراک وفاقی یا معاہداتی بنیاد پر مناسب شرائط کے ساتھ باہمی گفت وشنید سے طے کریں گی۔"

لارڈ لسٹوول سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند نے ۱۰ جولائی کو مسودہ قانون آزادئ ہند کی دوسری خواندگی کے وقت دارالامراء میں بیان کیا:-

"معزز ارکان کو یاد ہوگا کہ کابینی مشن نے اپنی یادداشت مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۴۶ء میں ریاستوں کو مطلع کیا تھا کہ ملک معظم کی حکومت کسی صورت میں کسی ہندوستانی حکومت کو پیراموئنٹسی منتقل نہیں کرے گی۔ اس وعدہ پر ہم سختی سے قائم ہیں۔ جس

تاریخ سے نئی مملکتیں قائم ہوں گی وہ سارے عہد نامہ جات اور معاہدات جن کی رو
سے ریاستوں پر ہمیں حاکمیت حاصل ہوئی تھی کالعدم ہو جائیں گے۔ اس وقت سے
نمائندہ تاج اور اس کے عہدہ داروں کے تقررات اور ان کا کام ختم ہو جائے گا۔
اور ریاستیں اپنی قسمت کی مالک بن جائیں گی۔ انھیں اس وقت بالکلیہ اس امر
کی آزادی ہوگی کہ جدید مملکتوں میں سے کسی ایک سے اشتراک کریں یا اُن سے
علیحدہ رہیں اور ملک معظم کی حکومت دیسی ریاستوں کے اس اہم ترین اور رضا جویانہ
فیصلہ کو متاثر کرنے کے لئے ذرا بھی دباؤ نہیں ڈالے گی۔ ... جدید مملکتوں اور
ریاستوں کے آئندہ تعلقات کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو لیکن قطعی فیصلہ کے لئے
طویل مباحث اور سوچ بچار کی ضرورت ہوگی "

جس طرح حکومتِ برطانیہ نے ریاستوں سے استمزاج کے بغیر ان پر پیرامونٹسی مسلّط
کر دی تھی اسی طرح ان سے کئے ہوئے سارے معاہدات کو جن کے متعلق اصراراً یہ بیان کیا
جاتا تھا کہ وہ ناقابلِ خلاف ورزی (inviolate) اور ناقابلِ تنسیخ inviolable
ہیں، ان کو یکطرفہ ریاستوں کی ایما کے بغیر دفعۂ قانون آزادیٔ ہند کے ذریعہ ختم کر دیا گیا۔
حیدرآباد سے کئے ہوئے معاہدات کی نوعیت دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں مختلف تھی لیکن
نظامِ دکن یا ان کے نمائندوں کو قبل از قبل اس تنسیخ کی اطلاع نہیں دی گئی۔ چنانچہ ۹ جولائی
۱۹۴۷ء کو نظام نے نمائندہ تاج برطانیہ کے نام ایک سخت خط لکھا جس میں حیدرآباد کو
نوآبادیاتی درجہ عطا کرنے کے مطالبہ کا اعادہ کیا گیا۔ بجز خط کی وصولی کے اس کا کوئی جواب
نہیں دیا گیا اور مسلسل یاد دہانیوں پر آٹھ ماہ کے طویل عرصہ کے بعد کہا گیا کہ دفتر کی غلطی کی بنا
پر یہ خط ملکِ معظم کی حکومت کو روانہ نہیں کیا جا سکا۔ کتنا مجرمانہ جواب ہے جو ایک ایسے
ہی شخص کی جانب سے دیا جا سکتا ہے جس کا ضمیر مردہ اور جو شرافت اور انسانیت کے جوہر
سے عاری ہو۔ نظام کا خط درج ذیل کیا جاتا ہے :-

۱۔ "مسودہ قانون ہند کی دفعہ ۷" کا علم مجھے ابھی چند دنوں قبل اخبارات کے ذریعہ ہوا۔ مجھے افسوس ہے کہ (جیسا گذشتہ چند ماہ میں ایسا بارہا ہوا ہے) اس دفعہ پر برطانوی ہند کے لیڈروں سے کافی طویل مباحث کئے گئے لیکن مجھ پر اس کا نہ اظہار کیا گیا نہ مجھ سے یا میرے کسی نمائندہ سے اس خصوص میں بحث کی گئی۔ مجھے یہ دیکھکر رنج ہوتا ہے کہ اس دفعہ میں نہ صرف برطانوی حکومت کی جانب سے اُن معاہدات کی جو برسوں سے میری ریاست اور خانوادہ کو برطانوی حکومت سے وابستہ رکھتا تھا یکطرفہ تنسیخ عمل میں آئی ہے بلکہ اس میں اس امر کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ تاوقتیکہ میں دونوں جدید مملکتوں میں سے کسی ایک میں شریک نہیں ہوتا اس وقت تک میری ریاست برطانوی دولت عامہ کا جزو نہیں بن سکتی۔ وہ معاہدات جن کے بموجب ایک عرصۂ قبل برطانوی حکومت نے میری ریاست اور میرے خانوادہ کی بیرونی حملوں اور اندرونی خلفشار سے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری قبول کی تھی ان کا اس زمانہ میں خصوصاً سنہ ۱۹۴۲ء میں سراسٹافرڈ کرپس کی جانب سے مسلسل اور اقرار صالح کے طور پر اعادہ کیا جاتا رہا۔ مجھے یہ یقین دلایا گیا تھا کہ میں برطانوی آلحہ اور برطانوی قول پر کاملاً اعتماد کر سکتا ہوں اور نتیجتاً مجھے حال حال تک اپنی فوج کی تعداد میں اضافہ کرنے اور اسلحہ سازی کے کارخانوں کے قیام سے باز رکھا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود دفعہ ۷ میں معاہدات کی تنسیخ نہ صرف میری رضامندی کے بغیر ہوئی ہے بلکہ مجھ سے یا میری حکومت سے اس خصوص میں گفتگو تک نہ کی گئی۔

۲۔ جیسا یور اکسیلنسی کو معلوم ہے کہ آپ کی انگلستان کو روانگی کے قبل اور وہاں کے دوران قیام میں میں نے یہ دریافت کیا تھا کہ ہندوستان سے برطانیہ کے چلے جانے پر میری ریاست کو نوآبادیاتی درجہ عطا ہونا چاہئے۔ میں نے اب تک ہمیشہ یہی محسوس کیا کہ ایک صدی سے زیادہ کے وفادارانہ اشتراکِ عمل کے بعد جبکہ میں نے انگریزوں

پر کامل اعتماد کیا تھا مجھے یقیناً برطانوی دولت عامہ میں شریک رہنے کا موقع دیا جائیگا دفعہ ۷ تو مجھے اس حق سے محروم کرتی ہے۔ مجھے اب بھی امید ہے کہ ملکِ معظم کی حکومت سے راست تعلقات قائم کرنے میں کوئی مشکل حائل نہ ہوگی۔ مجھے حال ہی میں یہ بتلایا گیا کہ یور اکسلنسی نے ایسے تعلقات کے قیام کے متعلق پارلیمنٹ سے اعلان کرانے کا وعدہ کیاہے۔ میری توقع یہ ہے کہ ان تعلقات کے قیام کے بعد میری ریاست اور تاج برطانیہ کے درمیان قریبی اتحاد و یگانگت میں ترقی ہوگی کیونکہ برسوں سے میں وفادارانہ طور پر تاج سے وابستہ ہوں۔

۳۔ اس اثناء میں میں جدید مملکت سے عملی طور پر گفت و شنید جاری رکھنے کا وعدہ کرتا ہوں تاکہ عبوری دور میں کوئی مناسب اور قابلِ عمل انتظام ہوجائے جو ممکنہ طور پر ایک منظم طریقہ سے دیسی ریاستوں اور ہندوستان کے مستقبل کی طمانیت کا ضامن ہوسکے۔

۴۔ میں یور اکسلنسی سے یہ احتجاج کرنے میں حق بجانب ہوں کہ کس طرح میری ریاست کو اس کا قدیم حلیف نظر انداز کر رہا ہے اور ان بندھنوں کو توڑا جا رہا ہے جنھوں نے مجھے ملک معظم سے وابستہ رکھا تھا۔ مجھے امید ہے کہ یور اکسلنسی میرے اس خط کو ملک معظم کی حکومت کی خدمت میں روانہ فرمائیں گے۔ سردست میں اس خط کو شائع نہیں کر رہا ہوں مبادا میرے قدیم احباب اور ساتھی دنیا کے سامنے رسوا ہوں لیکن بعد میں اپنی ریاست کے مفاد میں اس کی اشاعت کے حق کو میں محفوظ رکھتا ہوں۔"

دفعہ ۷ قانون آزادیٔ ہند اور اس کی متذکرۂ بالا تعبیر و تشریحات کی روشنی میں رؤسائے ہند کو دونوں جدید مملکتوں میں سے کسی ایک میں شامل ہونے یا بصورتِ ثانی آزاد رہنے کا پورا اختیار حاصل تھا۔ جہاں تک حیدرآباد کا تعلق ہے معاہدات کی تنسیخ اور پیرامونٹسی کے

برخواست ہونے کے بعد عہد آصف جاہ اول کی حالت عود کر آتی ہے جبکہ مغلیہ سلطنت کے جوئے کو اتار کر دکن کی آزادی کو مستحکم کیا گیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ علاقہ جات کی واپسی کے بعد نواب بہادر یار جنگ کے خواب کی تعبیر بھی پوری ہو جاتی جس کا نقشہ انھوں نے ان الفاظ میں کھینچا تھا :-

" مملکت آصفیہ اسلامیہ کے مقبوضات کی واپسی کے بعد ہمارے حدود اس قسم کے ہوں گے کہ ہم مشرق میں خلیج بنگال پر وضو کریں گے، جنوب میں سلطان شہیدؒ کی مزار پر فاتحہ پڑھیں گے اور شمال میں ور دھا کی سرحدوں پر کھڑے ہو کر گاندھی جی کو نمسکار کریں گے "

برطانوی حکومت کے خلوص، پارلیمانی مباحث اور سب سے زیادہ قانون آزادیٔ ہند کو دلیل راہ قرار دے کر نظامِ دکن نے ۱۱ رجون ۱۹۴۷ء کو حیدرآباد کی آزادی کا فرمان صادر کیا جس میں یہ ظاہر کیا گیا کہ پاکستان میں شرکت ہندو رعایا کے لئے اور ہندوستان میں شرکت مسلم رعایا کے لئے باعث دل آزاری ہے اس لئے حیدرآباد آزاد رہ کر دونوں مملکتوں سے دوستانہ تعلقات قائم رکھے گا اور ہندوستان سے بوجہ ہمسائیگی ہر معاملہ میں تعاون کی پالیسی پر عمل پیرا ہوگا۔ چنانچہ ہندوستان سے گفت و شنید کے لئے ۱۱ رجولائی ۱۹۴۷ء کو ایک وفد جو نواب صاحب چھتاری، علی یاور جنگ، سر والٹر مانکٹن پر مشتمل تھا دہلی روانہ کیا گیا۔ بعد میں دو عوامی وزرا عبدالرحیم اور پنگل وینکٹ راما ریڈی کا بھی اس میں اضافہ کیا گیا۔ اس وفد نے تین مسائل پر بحث و تمحیص کی۔ (۱) استرداد برار (۲) حیدرآباد کو قلمروی حیثیت عطا کرنے کا مطالبہ (۳) حیدرآباد کی ہندوستان میں شرکت۔ پہلے مسئلہ کے متعلق مونٹ بیٹن نے بیان کیا کہ قانونِ آزادی ہند میں برار پر حیدرآباد کی حاکمیت کو تسلیم کیا گیا ہے اور چونکہ ۱۹۳۶ء میں حکومت ہند نے رعایائے برار کی مرضی کے بغیر برار کے مستقبل کا تصفیہ نہ کرنے کا اعلان کیا تھا اور اگر وہاں کی رعایا کی مرضی معلوم کی جائے تو

اس کا تصفیہ یقیناً حیدرآباد کے خلاف ہوگا اس لئے موجودہ انتظام کو علی حالہ بحال رکھنا ہی مناسب ہے۔ دوسرے مسئلہ کے متعلق مونٹ بیٹن نے بتلایا کہ دونوں جدید مملکتوں میں سے کسی ایک میں شرکت کے بغیر حیدرآباد برطانوی دولت عامہ میں شریک نہیں ہو سکتا تیسرے مسئلہ کے تعلق سے مونٹ بیٹن نے جب امور خارجہ، دفاع اور مواصلات پر حیدرآباد کو ہندوستان میں شرکت کی دعوت دی تو وفد نے اعتراض کیا کہ اس سے حیدرآباد کا اقتدار متاثر ہوتا ہے اور اگر اس مسئلہ پر اصرار کیا گیا تو حیدرآباد پاکستان میں شرکت پر غور کرے گا۔ مونٹ بیٹن نے حیدرآباد کے اس حق کو تسلیم کرتے ہوئے جغرافی حالات کا سوال اٹھایا اور یہ بیان کیا کہ اگر اس آخری موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا تو حیدرآباد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جائے گا۔ یہ گفت وشنید نتیجہ خیز نہیں رہی۔ حیدرآباد نے معاہدہ جاریہ کی خواہش کی جس کو ہندوستان کی جانب سے ٹالنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن مونٹ بیٹن نے (جو ۱۵ اگست کے بعد اپنی تاج کے نمائندہ حیثیت کو ختم کر کے ہندوستان کے گورنر جنرل کا عہدہ قبول کرنے والے تھے) ہندوستان کی کابینہ سے گفت وشنید کے لئے مزید دو ماہ کی مہلت طلب کی جو منظور کی گئی۔

۸ راگست ۱۹۴۷ء کو نظام دکن نے مونٹ بیٹن کو ان کے نمائندہ تاج کی حیثیت میں ایک خط لکھا جس میں ہندوستان سے صلحنامہ کی پیشکش کی گئی جس کی رو سے مواصلاتی انتظام کو کل ہند بنیاد پر لانے، دفاع کی حد تک فوجی امداد دینے اور خارجی پالسی ہندوستان کے ہم آہنگ رکھنے کے اقرار کے ساتھ یہ شرط پیش کی گئی کہ اگر ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑ جائے تو حیدرآباد غیر جانبدار رہے گا اور اگر ہندوستان برطانوی دولت عامہ سے کسی وقت علیحدہ ہو جائے تو حیدرآباد کو از سر نو حالات پر غور کرنے کا اختیار ہوگا۔ تیسری شرط یہ تھی کہ حیدرآباد کو بیرونی ممالک میں ایجنٹ جنرل مقرر کرنے کا اختیار ہوگا۔ اس مراسلہ میں برار کے مسئلہ کا بھی تذکرہ کیا گیا اور نمائندہ تاج سے اس امر کی شکایت

بھی کی گئی کہ ہندوستان بجز شرکت کے حیدرآباد سے گفتگو کے لئے آمادہ نہیں ہے جو
جبر اور داب ناجائز کے مترادف اور برطانوی حکومت کے مواعید کے صریح مغائر ہے
حیدرآباد سے عبوری دور میں معاہدۂ جاریہ کرنے سے ہندوستان کی جانب سے جو
انکار کیا گیا تھا اس پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے بتلایا گیا تھا کہ کابینی مشن کے ۱۲ مئی
۱۹۴۶ء کی یادداشت میں جس کا اعادہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کے اعلان میں کیا گیا تھا اور
جس کو کانگریس اور مسلم لیگ نے تسلیم کیا ہے اس میں شرائط کے علاوہ سیاسی تعلقات
کے قیام کی صریح گنجائش رکھی گئی تھی اور ان ہی وجوہ کی بناء پر حیدرآباد نے معاہدۂ جاریہ
کی پیشکش کی تھی لیکن ہندوستان کی جانب سے ایسی گفت وشنید سے قطعی انکار کیا گیا۔
اس معاہدہ کے بغیر بھی حیدرآباد کی جانب سے انتظامی تعطل کو روکنے کی کوشش
کی جائے گی ورنہ دونوں فریقوں کو مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر ایسا کوئی تعطل پیدا
ہو تو اس کی ذمہ داری ہندوستان پر عائد ہوگی۔

اس خط کا جواب مونٹ بیٹن نے نمائندہ تاج کی حیثیت سے ۱۲ اگست ۱۹۴۷ء کو
یوں دیا کہ حیدرآباد کے مخصوص حالات کا انھیں احساس ہے۔ حکومت ہند اپنے حدود کے
اندر جتنی بھی ریاستیں واقع ہیں ان میں مربوط اتحاد (Organic Union) پیدا کرنے
کی خواہاں ہے اور اس طرح شرکت فریقین کے باہمی مفاد کے لئے ضروری ہے گو ۱۵ اگست
کے بعد ان کی تاج برطانیہ کے نمائندہ کی حیثیت ختم ہو جائے گی لیکن انھوں نے حیدرآباد
کے مسئلہ میں گفت وشنید کے لئے مزید دو ماہ کی مہلت حاصل کرلی ہے اور اس مدت میں
انھیں سمجھوتہ کی توقع ہے۔ برار کا انتظام علیٰ حالہ برقرار رہے گا اور دیگر مسائل میں گفت وشنید
جاری رہے گی۔ اس خط میں مونٹ بیٹن نے خصوصیت سے اس شبہ کا ازالہ کیا کہ عدم شرکت
کے فیصلہ کو دشمنی کی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا اور نہ حیدرآباد کی ناکہ بندی کی جائے گی اور
اور انھیں اطمینان ہے کہ ہندوستان کے زعماء ایسا کوئی دباؤ ڈالنے کی تائید میں نہیں ہیں

علاوہ ازیں صوبۂ متوسط و برار کے جدید گورنر کے تقرر کے وقت حیدرآباد سے مشورہ کیا گیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت ہند دستوری حیثیت کا کتنا احترام کرتی ہے۔

اس خط میں جو نمائندہ تاج کی حیثیت سے مونٹ بیٹن کا آخری خط ہے کانگریسی ذہنیت کی پوری آئینہ داری ہوتی ہے، عدم شرکت کو دشمنی کی نظر سے نہ دیکھنا اور ناکہ بندی نہ کرنے کا وعدہ کرنا۔ کتنے بلند بانگ خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن یہ وعدے صرف دنیا کو فریب میں مبتلا کرنے کے لئے کئے گئے تھے اور عمل اس کے بالکل برعکس تھا کم ازکم مونٹ بیٹن کو جو برطانوی قوم اور تاج کے نمائندے تھے اس فریب کا فریق نہیں بننا چاہیئے تھا۔ اس خط میں "حدود کے اندر واقع ریاستوں" کا جو جملہ ہندوستان کے مربوط اتحاد کے لئے استعمال کیا گیا ہے وہ بھی گمراہ کن ہے۔ حیدرآباد جغرانی حیثیت سے چاروں طرف سے ہندوستان سے گھرا ہوا ہے لیکن ٹراونکور، کوچن، کاٹھیاواڑ کی ریاستیں اور کشمیر بھی ہندوستان کی سرحدوں کے اندر واقع نہیں ہیں لیکن ہندوستان کی جوع الارضی نے جائز اور ناجائز ہر طریقہ سے ان ریاستوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ اگر حیدرآباد کو وہ سارے علاقے جو انگریزوں نے اپنے اقتدار کے زمانہ میں حاصل کرلئے تھے واپس مل جاتے اور پیرامونٹسی کے اختتام کے بعد انھیں مل جانا چاہیئے تھا تو حیدرآباد کو بھی اپنا پھیلی پٹم کا بندرگاہ مل جاتا اور اس پر ہندوستان کی سرحدوں کے اندر واقع ہونے کی تعریف صادق نہ آتی۔ نمائندہ تاج کا تو یہ فرض تھا کہ برطانوی مواعید کی پاسداری کرتے ہوئے قانون آزادی ہند کے مضمرات کی لفظاً ومعناً وہ تعمیل کراتے یا اپنی خدمت سے سبکدوش ہوکر ہندوستان کو حیدرآباد کے ہضم کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جاتا۔ مونٹ بیٹن نے ہندوستان کی جوع الارضی کے منصوبوں کا اپنے آپ کو فریق بنا کر برطانوی ناموس کو دنیا میں ہمیشہ کے لئے سرنگوں کردیا۔

سر آرتھر لوتھیان نے ریاستوں کے انضمام کے مسئلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انضمام اگر رعایا کی بہبود کی پیش رفت میں ہے تو یہ ایک بہت ہی خوش آئند عمل ہے کیونکہ ہندوستان

رؤساء کے فیصلوں کو تسلیم کرنے آمادہ نہیں ہے تا وقتیکہ یہ فیصلے آبادی کی اکثریت کے خیالات کے ہم آہنگ نہ ہوں جیسا کہ جوناگڈھ میں کیا گیا لیکن کشمیر میں ہندوستان کا عمل بالکل اس کے متضاد ہے۔ یہاں والیٔ ملک کے فیصلہ کو بنیاد شرکت قرار دیا گیا ہے اور حیدرآباد کے معاملہ میں والیٔ ملک کو نظر انداز کرکے آبادی کی اکثریت سے رجوع کیا جارہا ہے۔ ہندوستان کی پالسی میں یکسانیت عمل کا فقدان ہے اور صرف جلبِ منفعت کا جذبہ کارفرما ہے۔ حیدرآباد پر رائے زنی کرتے ہوئے سر آرتھر نے بتلایا کہ حیدرآباد کے آزاد رہنے میں سارے دلائل اس کی تائید میں ہیں لیکن سرد جنگ، معاشی ناکہ بندی کے ذریعہ حیدرآباد کو شرکت پر مجبور کیا جارہا ہے۔

حیدرآباد کو قلمروی حیثیت دلانے کی آخری کوشش نظام دکن نے اپنی ۱۰ اگست ۱۹۴۷ء والی تقریر میں کی جو حیدرآباد کے آخری برطانوی رزیڈنٹ سر آرتھر لوتھین کی الوداعی ضیافت میں انھوں نے کی تھی اور جس میں برطانوی حکومت سے حیدرآباد کے دو سو سالہ اتحاد اور یگانگت کی تاریخ کو دُہراتے ہوئے برطانوی دولت عامہ میں شریک رہنے کی خواہش کا اعادہ کیا گیا تھا۔ حیدرآباد کے ساتھ جو سلوک انگریزوں نے آخری مرتبہ کیا ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سر آرتھر نے اپنی کتاب میں اس خیال کا اظہار کیا:۔

"برطانوی قوم کا کوئی شخص جس کو واقعات کا علم ہے (نظام دکن کے) اس پُرمغز اور وفاکیشانہ بیان کو شرم اور ندامت کے جذبہ سے مغلوب ہوئے بغیر نہیں پڑھ سکتا کہ کس طرح ہم نے حیدرآباد کو ہندوستان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ چنانچہ شرکت کے لئے ہندوستان کی جانب سے حیدرآباد پر ہر قسم کا دباؤ ڈالا جارہا ہے۔ (گورنر) جنرل اور وزیر ہند کے بیانات جن میں ملکِ معظم کی حکومت نے ریاستوں کو شرکت پر مجبور نہ کئے جانے کا وعدہ کیا تھا، حیدرآباد کے خلاف ہندوستان کی معاشی ناکہ بندی کی روشنی میں عجیب و غریب نظر آتے ہیں.... کاش میں ان الزامات کے

سُننے کے لئے زندہ نہ رہتا جو ۱۵ اپریل ۱۹۴۸ء کے خط میں نظام حیدر آباد
نے ہم پر اور ہماری حکومت کے طرزِ عمل پر لگائے ہیں[1]۔"

انگریز ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان سے دامن جھٹک کر چلے گئے اور ہندوستان میں ریاستوں کی فریاد سننے اور قانونِ آزادیٔ ہند کی دفعات کی خلاف ورزی پر احتجاج کرنے اور ریاستوں کو اس قانون کے تحت اپنے حقوق تسلیم کرانے کے لئے نہ کوئی نمائندہ تاج تھا اور نہ برطانوی قوت تھی جو ان کی دستگیری کرتی۔ چھوٹی ریاستوں کو تو چھوڑیئے بڑی بڑی ریاستیں تک حکومت ہند کی ریاستوں کے انضمام کی اسکیم سے لرزہ براندام تھیں۔ نظامِ دکن نے برطانوی دولت عامہ میں شریک رہ کر آزادی حاصل کرنے کے جتنے بھی جتن کئے تھے جس کا قانوناً انھیں حق بھی حاصل تھا وہ سارے نقشِ برآب ثابت ہوئے۔

علی یاور جنگ نے اپنی کتاب میں اس ناکامی کا ایک بلیغ جملہ میں تجزیہ کیا ہے:-

"حیدر آباد نے کابینی مشن کی پیراموئنٹسی والی یادداشت پر بڑا تکیہ کیا اور اس امر کو بالکل فراموش کر دیا کہ آزادی یا تو میدانِ جنگ میں حاصل کی جاتی ہے یا اس کو تسلیم کرایا جاتا ہے۔ صلحنامہ یا تو نوکِ خنجر سے لکھا یا جاتا ہے یا گفت و شنید کے ذریعہ طے ہوتا ہے لیکن موخر الذکر صورت میں فریقِ ثانی کو بھی اپنی مرضی سے دستخط کرنی پڑتی ہے۔ جہاں تک رقبہ، آبادی، آمدنی، ذرائع، دیگر وسائل، اعزازات اور جنگی کارناموں کا من حیث المجموع تعلق ہے حیدر آباد کی حیثیت جو کہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست تھی، ہندوستان کے مقابلہ میں بہرحال ایک بونے سے زیادہ نہ تھی جو ایک دیو سے صلحنامہ کی بابت گفت و شنید کر رہا ہو[2]۔"

حقیقت یہ ہے کہ طاقت و قوت اور وسائل کے اعتبار سے ہندوستان اور حیدر آباد کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ حیدر آباد قطعاً اس موقف میں نہیں تھا کہ اپنی شرائط منوا سکتا یا ان پر

---

[1] Kingdoms of yesterday.
[2] Hyderabad in Retrospect.

اصرار کرتا۔ لیکن اس کے باوجود تقسیم ہند کے ہنگامہ خیز واقعات کے چوکھٹے میں ہندوستان
کے نزدیک حیدرآباد کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ہندوستان کو سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا
کہ کہیں حیدرآباد پاکستان میں شرکت نہ کرلے کیونکہ قانوناً اس کو یہ حق حاصل تھا اور
گفت وشنید کے ابتدائی دَور میں حیدرآباد کے وفد نے اس تاثر کو پیدا کرنے
کی کوشش بھی کی تھی لیکن حیدرآباد کی بساط سیاست پر جن مُہروں کا تسلط
تھا ان کی سیاسی بصیرت کا یہ عالم تھا کہ وہ مستقل اور عارضی معاہدہ کے موزوں وقت
کا تعین نہیں کرسکتے تھے۔ مستقل معاہدہ کا زرین موقع تو وہ تھا جب ہندوستان مصائب
میں گھرا ہوا تھا اور حیدرآباد کی خوشنودی کو بڑی سی بڑی قیمت پر خریدنے آمادہ تھا
لیکن اس موقع کو کھو کر معاہدۂ انتظام جاریہ پر اصرار کیا گیا اور اس کی تکمیل بھی ایسے
بھونڈے طریقہ سے کی گئی کہ یہی معاہدہ حیدرآباد کے لئے اس کا قتل نامہ ثابت ہوا۔

۵

ہندوؤں کی ریشہ دوانیاں

حیدرآباد میں آصف جاہی خاندان دوسو سال سے حکمراں تھا اور فرمانروائے ملک کو سارے اقتدار کا سرچشمہ قرار دیا جاتا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں جدید اصلاحات کے روبعمل آنے تک کونسل کی حکومت قائم تھی۔ وزرا کا تقرر بادشاہ کا اختیاری تھا۔ ملک میں ایک مجلس وضع قوانین بھی تھی جو زیادہ تر نامزد ارکان پر مشتمل تھی اور جس کو قانون سازی کے سوا کوئی اور اختیارات حاصل نہ تھے۔

دکن میں مسلمانوں کے چھ سو سالہ اقتدار کے زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات آپس میں مخلصانہ اور برادرانہ رہے ہیں۔ قطب شاہی دور میں تو تلنگی سرکاری زبان تھی اور سلطان قلی قطب شاہ تلنگی میں شعر کہتا تھا۔ اس زبان کے شعرا اور ادیبوں کی دربار میں سرپرستی کی جاتی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اکنّا، مادنّا وزراءِ عظام کے درجے کو پہنچے ہیں۔ قطب شاہیوں کے بعد جب آصفجاہیوں کا اقتدار دکن پر قائم ہوا تو ہندو مسلم تعلقات کی جو نیو پڑ گئی تھی، وہ آخر وقت تک قائم رہی۔ عہد سکندر جاہ اور ناصر الدولہ میں چندو لعل پیشکار اور وزیر اعظم دربار کے رکن رکین اور ریاست کے سپید و سیاہ کے مالک تھے۔ ان کے نواسے مہاراجہ سر کشن پرشاد نے برسوں صدارت عظمیٰ پر فائز رہ کر حیدرآباد کے ہندو مسلم اتحاد کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔

حیدرآباد میں ہندو اور مسلمان بادشاہ کی دو آنکھیں اور دونوں کو بادشاہ کے نزدیک

مساوی حیثیت حاصل تھی۔ بجز ملازمت سرکاری کے جس میں مسلمانوں کا تناسب اچھا خاصا تھا ملک کی ساری معیشت، زراعت، تجارت وحرفت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی ہندو اور مسلم میل ملاپ سے حیدرآباد کی تہذیب ومعاشرت کو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں ایک نمایاں خصوصیت حاصل تھی۔ سر مرزا اسمٰعیل جیسے ہندو پرست صدرِ اعظم کے لئے یہ چیز باعث استعجاب تھی چنانچہ اپنی خود نوشت میں تحریر کرتے ہیں:۔

"میں نے حیدرآباد اسٹیٹ میں حقیقی ہندو مسلم اتحاد کے خوش آئندہ مظاہر دیکھے۔ یہاں کی معاشرتی اور سرکاری زندگی ہندو مسلم تہذیب کا آمیزش تھی .... حیدرآباد میں کسی شخص کو دیکھکر ہندو یا مسلمان کہنا میرے لئے مشکل تھا اُن کا لباس ایک ہی قسم کا تھا اور ان کی زبان اردو تھی۔ میں کسی ملاقاتی سے یہ نہیں پوچھتا تھا کہ وہ مسلمان ہے یا ہندو بلکہ نام دریافت کرکے معلوم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔" [1]

حیدرآباد میں فرمانروائے ملک اور حکومت دونوں نے ابتداء سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کبھی کوئی امتیاز نہیں برتا۔ برخلاف اس کے ہندو ریاستوں جیسے کشمیر، جے پور، جودھپور وغیرہ میں مسلمانوں کے ساتھ ناروا مظالم کئے جاتے تھے، انھیں مسجدوں میں اذان تک دینے کی اجازت نہ تھی، ان کی مذہبی آزادی سلب کرلی گئی تھی اور معاشی اور اقتصادی حیثیت سے وہ انتہائی پست افتادہ تھے۔ لیکن حیدرآباد میں ان کے ساتھ فیاضانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ ہندو عبادت گاہوں اور اداروں کی مالی امداد حکومت کے خزانہ سے کی جاتی تھی۔ چنانچہ پانچ ہزار مسلم اداروں کے مقابلہ میں (۱۱,۳۵۵) ہندو اداروں کو نقد معاش مقرر تھی۔ مندروں کے انتظام کے لئے جاگیریں عطا کی گئی تھیں جن کی آمدنی پانچ لاکھ روپے

---

[1] My Public Life.

سالانہ تھی ۔ صرف شہر حیدرآباد کے سیتا رام باغ کے مندر کی جاگیر کی آمدنی پچاس ہزار سالانہ تھی ۔ علاوہ ازیں (٢٥) مسلم ادارے جیسے مساجد، مقبرے اور عاشورخانوں کا انتظام بالکلیہ ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا جس کے لئے انھیں مدد معاش مقرر تھی ۔ مندر کے پجاریوں کے سوا (٥٤) شاستریوں اور (٥٦) بھجن گانے والوں کو سرکاری تنخواہیں مقرر تھیں ۔ حیدرآباد کے باہر کے مندروں کو بھی حیدرآباد سے امداد دیجاتی تھی چنانچہ صوبہ مدراس کے بھدراچلم اور چنگل پیٹ کے مندر کو سالانہ مبلغ (١٩,٤٦٥) اور مبلغ (١٢٦٠) دئے جاتے تھے ۔ برار کے بالاجی مندر، شولاپور کے ہندر پور مندر اور مدراس کے ترپتی مندر کو بھی سالانہ نقد امداد ملتی تھی ۔ اس کا اندازہ ان اعداد سے ہو سکتا ہے کہ مسلم اداروں کے مبلغ (٩٤٦٠) سالانہ امداد کے مقابلہ میں ہندو اداروں کو مبلغ (٩٧,٨٨٦) کی امداد مقرر تھی اور ہندو منادر کے لئے (٢,٠١,٩٥٧) ایکڑ اراضی کی جاگیر اور معاشیں دی گئی تھیں ۔

ریاست حیدرآباد کے سارے ذرائع معیشت پر ہندو قابض تھے زراعت، صنعت و حرفت، تجارت اور سارے پیشے ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے ۔ ذیل کے اعداد و شمار سے جو ١٩٣١ء کی رپورٹ مردم شماری سے ماخوذ ہیں اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

نشان سلسلہ	ذریعہ معیشت	تعداد جملہ افراد	ہندو	مسلم	فیصد تناسب ہندو	فیصد تناسب مسلم
١	زراعت	٦,٩٤٧,٩١٣	٦,٨١,٧١٣	٥,٨١,٧٤٨	٨٧	٧
٢	صنعت و حرفت	١,٧١١,٨٣٧	١,٥٧٨,٢٩٩	٨٩,٩٧٣	٩٢	٥
٣	ذرائع نقل و حمل	١٩٣,٠٨٣	١٥٣,١٥٩	٢٤,١١٩	٧٩	١٢
٤	تجارت	١,٢١٨,٦٩٦	١,٠٣٠,٣٠٧	١٥٢,٥٧٨	٨٥	١٣
٥	فوج و پولس	٢٢٦,٢٢٢	١٦٦,٢٨٦	٤٩,٥٦٥	٧٤	٢٢

۶	سرکاری ملازمت	۳۳۵,۴۵۹	۲۱۸,۶۷۹	۱۰۵,۹۴۹	۶۵	۳۲
۷	پیشے اور حرفتیں	۲۰۱,۱۱۴	۱۴۳,۰۶۳	۴۶,۵۸۹	۷۱	۲۳
۸	خانگی ملازمت	۳۴۴,۵۰۳	۲۳۴,۵۶۸	۸۷,۷۵۸	۶۸	۲۵
۹	ایسے پیشے جن کی تفصیلات ناکافی ہیں۔	۹۴۲,۸۷۷	۷۹۵,۱۰۲	۹۲,۱۰۵	۸۴	۱۰

مذکورہ اعداد و شمار سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندو زندگی کے ہر شعبے پر چھائے ہوئے تھے حتیٰ یہ کہ سرکاری ملازمت میں بھی ان کا تناسب (۶۵) فیصد تھا بمقابلہ مسلمانوں کے (۳۲) فیصد کے ان اعداد میں دیہی ملازمتوں کو بھی شریک کیا گیا ہے جنکی مجموعی تعداد (۹۹,۸۱۴) تھی جس کے منجملہ (۹۶,۶۷۰) ہندو اور (۲۵۱۴) مسلمان تھے اسی طرح (۱۰) لاکھ ہندو پنہ داروں کے مقابلہ میں مسلم پٹہ داروں کی تعداد (۶۰) ہزار تھی۔ ۷ ہزار ہندو انعامداروں کے مقابلہ میں (۱۰) ہزار مسلمان تھے اور ساڑھے تین ہزار ہندو ریوم داروں کے مقابلہ میں (۲۰۰) مسلمان تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ حیدر آباد میں زراعت، تجارت، ٹھیکہ داریاں، ساہوکارہ، سمستان دسیمکھی، دیسپانڈیا گری، دیہی عہدہ داریاں سب ہی ہندوؤں کے قبضہ میں تھیں۔ نتیجتہً مواضعات کی بہترین اراضیات سے وہی متمتع ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں دیہی ملازمتیں موروثی تھیں جو ایک ہی خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ جاری رہتی تھیں۔ ہندوؤں کے ساتھ سرکار کی رواداری کا یہ عالم تھا کہ ہندو معاشدار لاولد فوت ہونے پر اس کے متبنیٰ پر معاش بحال کردی جاتی تھی اور اس طرح ہندوؤں کی معاشیں حکومت آصفیہ کے دو سو سالہ دور میں علیٰ حالہ قائم و برقرار رہیں جس کے باعث ہندوؤں کا تمول کبھی زوال پذیر نہیں ہوا اس کے برخلاف مسلمان معاشدار کے لاولد فوت ہونے پر اس کی معاش شریک خالصہ کرلی جاتی تھی۔ اس طرح ۴۵ فیصد معاشیں امتداد زمانہ کے ساتھ داخل سرکار ہو چکی تھیں۔

ابتداء سے حیدرآباد میں جتنی مادی ترقیاں ہوئیں اُن سے زیادہ تر ہندو ہی بہرہ مند ہوتے رہے۔ اس لئے مزارعین، اہلِ حرفت، تاجر سب ہی خوشحال تھے۔ مسلمان ملازمتوں میں ہونے کی وجہ سے اقتدار اپنے ہاتھ میں ضرور رکھتے تھے لیکن ان کی (۹۰) فیصد تعداد قلاش اور ہندو ساہوکاروں ہی کی مقروض تھی۔ بڑے بڑے امراء اور جاگیردار تک ساہوکاروں کی دستبرد سے باہر نہیں تھے۔

حیدرآباد کی ایک دوسری قابلِ ذکر خوبی یہاں کا اندرونی امن و امان تھا۔ ۱۹۳۷ء تک حیدرآباد میں کبھی ہندو مسلم سوال پر فرقہ وارانہ فسادات برپا نہیں ہوئے۔ اس قسم کے جذبات جہاں بھی ظاہر ہوئے حکومت سے زیادہ خود رعایا نے انھیں اُبھرنے سے روکا، آریہ سماج اور مہاسبھا کی شر انگیزیوں نے بعض اضلاع اور تعلقات کی فضا کو مکدر کرنا شروع کیا تھا لیکن شہروں اور قصبات میں دونوں فرقوں کا باہمی اتحاد اور ہم آہنگی نے آپس کے میل جول اور ربط و ارتباط میں ذرا بھی فرق پیدا نہ ہونے دیا۔

ہندوستان میں وفاقی حکومت کے قیام کے لئے ۱۹۳۰ء کے بعد لندن میں جو گول میز کانفرنس منعقد کی گئی اس وقت تک کانگریس ریاستوں میں عدم مداخلت کی پالیسی پر عمل پیرا تھی۔ علاوہ ازیں پیراموئنٹسی کے ڈر سے ہندوستانی ریاستیں سیاسی تحریکات کو اُبھرنے کا موقع بھی نہیں دیتی تھیں۔ ایسے زمانہ میں ملک کی سب سے مقبول عام تحریک ملکی تحریک تھی جس نے نواب علی نواز جنگ، نواب نظامت جنگ نواب بہادر یار جنگ اور مولوی ابوالحسن سید علی تک کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس تحریک کے تعلق سے حیدرآبادی مسلمانوں کو آج بھی بعض حلقوں میں موردِ الزام قرار دیا جاتا ہے جو حقائق سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ دکن میں مسلم اقتدار کے عروج و زوال کے ہر زمانہ میں شمالی ہند کے باکمال مسلمانوں کے لئے حیدرآباد کی آغوش ہمیشہ کھلی رہی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مغلیہ سلطنت کا چراغ توگُل ہو چکا تھا لیکن اُن مسلمانوں کے لئے جو انگریز کی محکومیت کو برداشت نہیں کر سکتے

تھے حیدرآباد سب سے بڑی پناہ گاہ تھی۔ ہزاروں مسلمانوں نے دہلی سے دکن ہجرت کی اور یہیں کی خاک کے پیوند ہو گئے۔

سالار جنگ اول کے زمانہ میں جدید حیدرآباد کا جو احیا ہوا اور حکومت کی مشنری کو زمانہ کی ضروریات کے مطابق کرنے کے لئے عہد آفریں تبدیلیاں عمل میں آئیں تو شمالی ہند کے علماء اور فضلا ہی کی طرف سالار جنگ کی نظریں اٹھیں۔ سرسید کی انقلاب انگیز تحریک کے جتنے بھی ساتھی تھے انھیں ایک ایک کر کے حیدرآباد کھینچا گیا اور یہ سلسلہ حیدرآباد کے سقوط تک جاری رہا۔ اس کا ناخوشگوار پہلو وہ تھا کہ ہر عالم کے ساتھ جو حیدرآباد کسی اچھے عہدہ پر طلب کیا جاتا تھا متوسلین اور نااہل طالبانِ کرم کا ایک لشکر ہوتا تھا جو دیگر ذیلی عہدوں اور ملازمتوں میں جذب ہو کر مقامی آبادی کے لئے روزگار کے دروازے بند کر دیتا تھا۔ یہ چیز ہندوؤں اور مسلمانوں بالخصوص اول الذکر کے لئے بڑی سوہانِ روح بن گئی تھی جس نے بالآخر ملکی تحریک کی صورت اختیار کی۔ حیدرآباد میں ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ باہر سے آنے والوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنالی تھی اور مقامی آبادی کے ساتھ تمسخر اور استہزا کا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ اعلیٰ خدمتیں شمالی ہند کے مسلمانوں کا اجارہ بن گئی تھیں اور حیدرآباد کا قابل سے قابل فرد پریشان اور بدحال پھرتا نظر آتا تھا۔ اس کا ردعمل ہونا ضروری تھا۔ حیدرآباد میں تعلیم کی وسعت اور جامعہ عثمانیہ کے قیام نے اس ردعمل کو اور بھی تیز کر دیا تھا۔ لیکن قابلیت اور صلاحیت والوں کے لئے حیدرآباد کے دروازے آخر وقت تک کھلے رہے۔ یہ کہنا حیدرآبادیوں پر ایک ظلم ہے کہ ملکی تحریک نے شمالی ہند کے مسلمانوں کی آمد کو روک دیا تھا جس کی وجہ سے مسلم اقتدار باقی نہ رہ سکا۔ اول تو ملازمتوں کی تعداد ہی کتنی ہوتی ہے اور پھر تین فریق اس کے حقدار، حیدرآباد کے مسلمان، ہندو اور شمالی ہند کے مسلمان۔ افسوس تو اس کا ہے کہ شمالی ہند کے مسلمانوں نے اس زرین موقع کو کھو دیا جبکہ زراعت سے لیکر تجارت، حرفت، وکالت، طبابت اور

ہر نوع کے پیشوں کے دروازے ان کے لئے کھلے ہوئے تھے جس سے انھوں نے کوئی استفادہ نہیں کیا اور ملازمتوں کے میدان میں ملکی مسلمانوں کے حقوق غصب کرنے پر مصر رہے۔ آخر زمانہ میں برار اور صوبۂ متوسط کے سات لاکھ مسلمان مہاجرین کو حیدرآباد کی زندگی کے ہر شعبہ میں جذب کر لیا گیا تھا وہ حیدرآباد کی فراخدلی کی ہلکی سی مثال ہے۔

۱۹۳۵ء کے قانون خود مختاری ہند کی منظوری کے بعد جب ہندوستان میں وفاق کے قیام کے امکانات روشن ہونے لگے اور ریاستوں کی نمائندگی کو موثر بنانے کے لئے کانگریس نے ریاستوں میں اپنی عدم مداخلت کی پالسی کو خیرباد کہہ کر وہاں کے عوام کو بیدار کر کے ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کی پالسی کو اختیار کیا تو حیدرآباد کے ہندوؤں میں بھی اقتدار کے حصول کا شوق پیدا ہوا۔ "جمیعت رعایائے نظام" نے جس کے ارکان کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی زیر سایۂ عاطفت "نظام دکن" ذمہ دارانہ حکومت کو اپنا نصب العین قرار دیا اور چونکہ مسلم ارکان کے مشورہ کے بغیر یہ قدم اٹھایا گیا تھا اس لئے مسلم ارکان جمیعت سے علیحدہ ہو گئے۔

ہندوستان کی کشمکش آزادی میں کانگریس نے ہمیشہ غیر مذہبیت کا روپ اختیار کیا لیکن اس کے افکار و اعمال سے ہمیشہ اس کی تکذیب ہوتی رہی۔ کانگریس کی پالسیوں کو ہندو اساس پر روبہ عمل لانے میں ہندو سبھا اور آریہ سماج کا بڑا ہاتھ رہا۔ یہ دونوں اشد قسم کے فرقہ وارانہ ادارے ہیں اور موخرالذکر تو ایک مذہبی تحریک بھی ہے جو ذات پات کے بندھنوں کو توڑ کر ہندوستان کے ہر بسنے والے کو ہندو دھرم میں شامل کرنا چاہتی ہے۔ برطانوی حکومت کے قیام کے بعد جب جمہوری خیالات کی اشاعت ہونے لگی۔ اور عوام الناس کو اقتدار کا سرچشمہ قرار دیا جانے لگا تو ہندوؤں کو اپنی ایک ہزار سالہ غلامی سے نجات حاصل کر کے از سر نو ملک میں ہندو راج قائم کرنے کا قوی امکان نظر آنے لگا۔ کانگریس نے دنیا کو بتلانے کے لئے غیر مذہبیت کا ڈھونگ رچایا

اور ہندو مہا سبھا آریہ سماج، راشٹریہ سیوک سنگ اور اس قسم کے دیگر اداروں نے ہندوستان کی غیر ہندو اقلیتوں کو نیست و نابود کرنے کو اپنا مقصد اولین قرار دیا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے طول و عرض میں ہندو مسلم فسادات کی وبا پھوٹ پڑی۔ یہ چیز خود انگریزوں کی تائید میں تھی کیونکہ ملک کے دو بڑے فرقوں کو متصادم کر کے انھوں نے ہمیشہ اپنا اقتدار برقرار رکھا تھا۔ قانون خود مختاری ہند ۱۹۳۵ء کے تحت ہندوستان کے سات صوبجات میں کانگریسی حکومت قائم ہوئی جس نے مسلم دشمنی کو اپنا شعار بنایا اور مسلمانوں پر دل کھول کر مظالم کئے۔ مسلمان اور ہندو ایک دوسرے سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ قائد اعظم نے مسلم لیگ میں نئی روح پھونکی اور پاکستان کے قیام کے لئے زمین ہموار کرنی شروع کر دی۔

برطانوی ہند کے ان زہریلے اثرات سے حیدرآباد کیسے محفوظ رہ سکتا تھا؟ ریاست کے اندر اسٹیٹ کانگریس ضرور قائم ہو گئی تھی لیکن نہ اس میں قیادت تھی اور نہ مقامی ہندوؤں کو خانوادۂ آصفی سے برگشتہ اور روایتی ہندو مسلم اتحاد سے منحرف کرنے کے کوئی جائز اسباب موجود تھے۔ ذمہ دارانہ حکومت کا مطالبہ ہندو عوام کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ کانگریس کے نیتاؤں اور شمالی ہند کے ہندو لیڈروں نے مقامی ہندوؤں کے نازک موقف کو محسوس کر کے حیدرآباد کے خلاف خود محاذ تیار کیا جس میں سب سے پیش پیش آریہ سماج اور ہندو مہا سبھا تھے۔

یوں تو آریہ سماج کی تحریک حیدرآباد میں ایک عرصہ سے جاری تھی اور دوسرے فرقوں کی طرح یہ لوگ بھی ریاست کی مذہبی رواداری اور عبادت اور تبلیغ مذہب کی یکساں آزادی کی پالیسی سے استفادہ کر رہے تھے لیکن ۱۹۳۵ء کے بعد آریہ سماجی انتہائی تشدد آمیز سیاسی اور فرقہ وارانہ منافرت پیدا کر کے ملک کے امن و امان میں رخنے پیدا کر رہے تھے۔ اسلام کے خلاف ان کے رکیک حملے، حکومت حیدرآباد

پر ان کے بے بنیاد اعتراضات اور خانوادۂ آصفی سے علانیہ دشمنی، ان کے پروپیگنڈے کے ہتیار تھے۔ ان کے مقررین اور مبلغین نے حیدرآباد کے ایک ایک گاؤں کا دورہ کرکے نہ صرف فرقہ وارانہ جذبات کو ابھارا بلکہ ہندوؤں کے دلوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی کہ ملک ہندوؤں کا ہے نہ کہ مسلمانوں کا۔ حکومتِ حیدرآباد ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے ان چیزوں کو دیکھتی رہی، بالآخر جب پانی سر سے اونچا ہوگیا تو آریہ سماج تحریک پر ایک سرکاری کتابچہ شائع کردیا گیا لیکن عملی طور پر اس کو روکنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہ کتابچہ انتہائی معلومات آفریں ہے جس کے پڑھنے سے نہ صرف ہندو ذہنیت، ان کے پروپیگنڈے کے طریقوں، ہندو صحافت کی غلط بیانی اور اقدام کے اوچھے حربوں ہی کا علم ہوتا ہے بلکہ یہ چیز بھی ظاہر ہوتی ہے کہ آج بھی ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف اپنے "طریقۂ جنگ" کو نہیں بدلا۔ ہندوستان کے کسی شہر کے فرقہ وارانہ فساد کا تجزیہ کیجئے تو اس کے یہی تار و پود آپ کے سامنے نمایاں ہوں گے۔ ابتداً کسی ہندو عورت کی عصمت ریزی یا کسی مندر یا عبادت گاہ کی بے حرمتی سے ہوگی، اخبار اور مقررین انتہائی رنگ آمیزی سے کام لیں گے کہ لوگوں میں اشتعال کی کیفیت پیدا ہوجائے گی۔ حکومت واقعہ کی تحقیقات کے بعد جب اس کے بے بنیاد ہونے کا اعلان کرے گی تو اس وقت تک اخبارات کے سامنے کوئی دوسرا شاخسانہ ہوگا اور پہلی خبر کی تردید سے لوگوں کو کوئی دلچسپی باقی نہیں رہے گی یا پھر تاویل کا سلسلہ شروع ہوگا اور تردید کو مشتبہ کرکے رکھدیا جائے گا۔ چنانچہ حیدرآباد کے خلاف بھائی پرمانند یم ایل اے کے ایک بیان نے جتنے دلچسپ چولے بدلے ہیں وہ ہندو ذہنیت کی غمازی سے زیادہ تفننِ طبع کی چیز ہے۔ لونا ٹیڈ پریس مورخہ ۲۲ مارچ ۳۵ئ؁ کے نام بھائی پرمانند نے ایک بیان جاری کیا کہ ریاست میں ہندوؤں کو گھوڑے کی سواری کی اجازت نہیں ہے جو صرف مسلمانوں کو حاصل ہے۔ ہندوؤں کو آزادی کے ساتھ عبادت کرنے کا حق نہیں اور نہ انھیں کسی قسم کا سفید لباس پہننے کی اجازت ہے۔ نیز یہ کہ انھیں جزیہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ حکومت حیدرآباد

نے اس کے خلاف ایک کمیونکے شائع کیا۔ یونائیٹڈ پریس نے ۱۲ اپریل ۳۸ء کے اخبار ٹریبون میں اس خبر کے متعلق یہ تردید شائع کی کہ گھوڑے پر بیٹھنے، سفید لباس پہننے اور جزیہ عاید کرنے کے متعلق جن رکاوٹوں کا ذکر کیا گیا تھا وہ شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانہ سے متعلق تھیں اور ریاستِ نظام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ۱۱ اپریل کو "ہندوا وٹ لک" نے جس نے سب سے پہلے یہ خبر شائع کی تھی' سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدرآباد کو کمیونکے کے جواب میں یہ لکھا کہ خبر رساں ایجنسی سے یہ غلطی صادر ہوئی تھی جس نے خود ہی اپنی سابقہ خبر کی اصلاح کر دی۔ خود بھائی پرمانند نے ۱۷ اپریل ۳۸ء کے ہندوستان ٹائمز میں یہ توجیہ پیش کی کہ چھاپہ خانے یا ٹائپ کرنے والے کی ایک تعجب خیز غلطی سے وہ فقرہ کسی نہ کسی طرح نظر انداز ہو گیا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ ہندوؤں کی یہ شکایات دورِ مغلیہ سے متعلق تھیں اور جیسے ہی مجھے اس کی اطلاع ملی میں نے فوراً یونائیٹڈ پریس کے ذریعہ اس کی اصلاح کر دی۔

حیدرآباد آریہ سماج کے صدر مسٹر وِنائک راؤ نے جو سقوطِ حیدرآباد کے بعد اس کے وزیر خزانہ بھی رہ چکے ہیں صدر المہام پولس مسٹر گرانٹن کے نام ۱۴ اپریل ۳۸ء کو یہ تحریر کیا:-

"سرکاری کمیونکے بھائی پرمانند کے ایک سراسر غلط ترجمے پر مبنی ہے۔ میں آپ کے اطمینان کے لئے اخبار مذکور کا تراشہ ارسالِ خدمت کر رہا ہوں۔ اس میں وہ اس امر سے بحث کر رہے ہیں کہ حیدرآباد میں ہندوؤں کے مطالبات ان کے ابتدائی حقوق سے تعلق رکھتے ہیں مضمون محولہ میں انھوں نے اورنگ زیب کے عہد کی ایک تاریخی مثال پیش کی ہے .... الفاظ میں خواہ کیسا ہی ہیر پھیر کیا جائے اس فقرہ کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ گھوڑے کی سواری وغیرہ سے حیدرآباد میں ہندوؤں کو منع کیا گیا ہے"

اس خط کا جواب مسٹر گرانٹن صدر المہام کوتوالی نے ۳۰ اپریل ۳۸ء کو یوں دیا:-

"آپ کا یہ استدلال کہ سرکاری کیونکے جس میں بھائی پرمانند کے بیان کی تردید کی گئی ہے ایک سراسر غلط ترجمہ پر مبنی ہے 'صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ بھائی پرمانند کا بیان جس طرح کہ وہ یونائیٹڈ پریس کے ذریعہ جاری ہوا ہے اخبار پرتاب لاہور کی اشاعت مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ آپ نے جو تراشا اخبار ہندو لاہور مورخہ ۱۴ اپریل ۱۹۳۸ء روانہ کیا اس پر سرکار عالی کا کیونکے مبنی نہیں ہے۔

سرکار عالی کے بیان کا سراسر غلط ترجمہ پر مبنی نہ ہونا بھائی پرمانند کے اس بیان سے ثابت ہوتا ہے جو خود انھوں نے ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع کرایا ہے اور جس کو "ہندو" نے بھی مکرر چھاپا ہے۔ اس بیان میں بھائی پرمانند کہتے ہیں کہ چھاپے یا ٹائپ کرنے والے کی تعجب خیز غلطی کی وجہ سے وہ فقرہ نظر انداز ہوگیا جس کا یہ مطلب تھا کہ شکایات زیر بحث شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانہ میں پائی جاتی تھیں اس قسم کی غلطی واقع میں تعجب خیز ہے لیکن بلاشبہ آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ بیان مذکور جس طرح کہ وہ ابتداءً شائع ہوا تھا اور جس میں وہ فقرہ نظر انداز ہوگیا تھا. اس سے ظاہر میں یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ شکایات محولہ ریاست کے ہندوؤں کو موجودہ زمانہ میں بھی تھیں۔ اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ سرکار عالی کا بیان سراسر غلط ترجمہ پر مبنی تھا جیسا کہ آپ کا خیال ہے۔ بریں ہمہ اس بیہودہ بیان کے متعلق جو اس طرح دیا گیا تھا بھائی پرمانند کی مابعد تردید کو پڑھ کر میں مسرور رہوا۔"

اس بیان کا سب سے دلچسپ پہلو تو وہ ہے کہ خود یونائیٹڈ پریس نے جس کے شانہ پر رکھکر بندوق چلائی گئی اپنی ۱۴ اگست ۱۹۳۸ء کی نیم سرکاری موسومہ معتمد امور دستوری میں تحریر کرتا ہے:

"ہمیں اس بیان سے اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں کہ ایک ڈاک خانہ کی طرح ہم نے اس کو تقسیم کرایا۔ بلاشک وشبہ ہم نے جو بیان گشت کرایا ہے وہ بالکل وہی تھا جو ہمیں بھائی پرمانند کی طرف سے وصول ہوا تھا۔ ہماری طرف سے اس میں کوئی

تحریف نہیں کی گئی۔"

بھائی پرمانند کے بیان اور اس کی تردید کی دلچسپ تفصیلات بیان کرنے کا مقصد صرف یہ بتلانا تھا کہ ہندو زعما اور ہندو صحافت کی تکنیک ہی یہ ہے کہ ایک جھوٹی بے بنیاد خبر کو مبالغہ آمیز اہمیت دے کر اس کے اثرات سے پورا فائدہ حاصل کر لیا جاتا ہے۔ بعد میں اس کی تردید کی ضرورت درپیش ہو یا نہ ہو لیکن اصل خبر کی اشاعت سے ذہنوں پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ تو زائل نہیں ہو پاتے۔ حیدرآباد پر فوج کشی کے قبل بھی ہندوستانی حکومت اور کانگریسی زعماء نے بھی حربے اختیار کئے تھے کہ ہندو عوام کے آتشِ انتقام نے حیدرآباد کی تہذیب و ثقافت ہی کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

حیدرآباد کی فضا کو فرقہ واریت سے مسموم کرنے کے بعد آریہ سماج، مہاسبھا اور کانگریس نے مل کر ۱۹۳۸ء میں حیدرآباد کے خلاف ستیاگرہ کا پروگرام بنایا اور ہندوستان کے مختلف اضلاع اور شہروں سے تقریباً آٹھ ہزار رضاکاروں نے حیدرآباد کی جیلوں کو آباد کیا۔ اس زمانہ میں پورا ہندوستان کا پریس حیدرآباد کے خلاف صف آرا تھا۔ کانگریس نے تو بہت جلد فرقہ واری اداروں سے اپنی بے تعلقی ظاہر کرنے کے لئے ستیاگرہ سے دستبرداری کر لی لیکن آریہ سماجی اور مہاسبھائی میدان میں اس وقت تک ڈٹے رہے جبتک تحریک خود بخود مُردہ نہ ہو گئی۔ حکومت حیدرآباد نے بھی اپنی روایتی رواداری کو کام میں لا کر ان ستیاگرہوں کو معاف کر کے جیلوں سے رہا کر دیا۔

حیدرآباد کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے حالات اور واقعات کا جائزہ لے کر اپنے قدیم بندھنوں کو مضبوط کرنے کے لئے مصالحت کی طرف قدم بڑھایا۔ اس خصوص میں دو کوششیں قابل ذکر ہیں۔ پہلی گفتگوئے مصالحت بہادر یار جنگ اور مسٹر یم نرسنگ راؤ (جو بعد میں اندھرا پردیس کے وزیر داخلہ بھی ہو گئے تھے) کے درمیان بڑی خوشگوار فضا میں شروع ہوئی اور بڑی حد تک ما بہ النزاع امور میں سمجھوتہ بھی ہو گیا لیکن اس کی تان ذمہ دارانہ حکومت کے

مطالبہ پر جا کر ٹوٹی۔ ہندوؤں کو اس پر اصرار تھا اور بہادر یار جنگ اس کو مسلمانوں کی سیاسی موت سے تعبیر کرتے تھے۔ دوسری گفتگو کے ارکان میں بہادر یار جنگ کے ساتھ اکبر علی خاں بیرسٹر تھے۔ موخرالذکر اتحاد المسلمین کے رکن نہیں تھے لیکن چونکہ ان کے ایما پر گفتگو شروع ہوئی تھی اس لئے اس حیثیت سے اس میں شریک تھے۔ ہندوؤں کی جانب سے کاشی ناتھ راؤ ویدیہ اور یم ہنمنت راؤ تھے۔ یہ گفتگو بھی نتیجہ خیز مرحلہ میں پہنچ رہی تھی جبکہ حکومت نے اصلاحات کی اسکیم مرتب کرنے کے لئے آینگار کمیٹی کا اعلان کیا اور مصالحتی بورڈ کے دو ارکان یعنی اکبر علی خان اور کاشی ناتھ راؤ ویدیہ کو اپنی کمیٹی کی رکنیت پر نامزد کر دیا۔ مفاہمت کی ساری کوششوں پر اس طرح پانی بھر گیا۔

دوسری عالمگیر جنگ شروع ہونے کے کچھ قبل اصلاحات کے تعلق سے اینگار کمیٹی نے اپنی سفارشات حکومت کی خدمت میں پیش کردی تھیں جس پر ہم آئندہ باب میں بحث کریں گے یہ اصلاحات نہ ہندوؤں کے لئے قابل قبول تھے نہ مسلمانوں کے لئے۔ اس اثنا میں جنگ شروع ہوگئی اور حکومت نے اس کو بہانہ بنا کر اصلاحات کو التوا میں ڈال دیا۔ دوران جنگ تک ملک کے امن و امان میں انحطاط کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی کیونکہ برطانوی پیراموئنٹسی ریاستوں میں امن کے خلاف چیرہ دستیوں کو برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ البتہ ضلع نلگنڈہ میں کمیونسٹ تحریک جاری رہی۔ یہ ضلع اور اضلاع ورنگل اور کریم نگر کے بعض علاقے کمیونسٹ سرگرمیوں کے بڑے مراکز بن چکے تھے جن کے امن سوز حرکات اور قتل و غارتگری کو روکنے کے لئے حکومت کو فوج استعمال کرنی پڑی تھی۔

اختتام جنگ کے بعد جب برطانوی حکومت نے کانگریس اور مسلم لیگ سے گفت و شنید شروع کی حیدرآباد میں پھر امن و امان متاثر ہونے لگا۔ آزادیٔ ہند کے خواب کے شرمندۂ تعبیر ہوتے ہی نہ صرف حیدرآباد کے ہندوؤں کے حوصلے بڑھ گئے بلکہ خود ہندوستانی حکومت حیدرآباد کو ہضم کرنے کے لئے شرپسند عناصر کی علانیہ مدد کرنے لگی۔ اس زمانہ میں رضا کاروں

کی عسکری تنظیم ہندو عزائم اور ان کے امن سوز حرکات کے ردِ عمل کا نتیجہ ہے
اس باب کو ختم کرتے ہوئے اس امر کو ذہن نشین رکھنے کی ضرورت ہے کہ انگریزوں کے ہندوستان سے دست کش ہونے اور ہندوستانی ریاستوں کو ہندوستان کی بہیمانہ قوت کے رحم وکرم پر چھوڑ دینے کے بعد حیدرآباد کی حالت ہندوستان کے متلاطم سمندر میں ایک ایسے جزیرہ کی رہ گئی تھی جو چاروں طرف سے طوفان میں گھرا ہوا ہو اور جزیرہ کے اندر اس کی ۸۵ فیصد آبادی ایسے کوہِ آتش فشاں سے متاثر ہو چکی تھی جس کا سیال لاوا نہ صرف مسلم اقتدار کو بلکہ مسلمانوں کی تہذیب وثقافت اور ان کی ہر چیز کو نیست و نابود کرنے کے درپہ تھا۔ یہ صورت حال روز روشن کی طرح عیاں تھی۔ قیادت کی یہیں آزمائش تھی لیکن افسوس اس کا ہے کہ نہ تو بادشاہ نے اور نہ حکومت اور قائدین نے تیز وتند ہواؤں کے چشم وابرو سے آنے والے ہلاکت آفریں طوفان کا جائزہ لیا اور نتیجتاً حیدرآباد کو اس ناعاقبت اندیشی کی بھینٹ چڑھنا پڑا۔

———— ✧ ————

۶

حیدرآباد میں مسلمانوں کے عزائم

حیدرآباد کے مسلمانوں میں ۱۹۳۵ء تک کوئی سیاسی بیداری نہیں تھی۔ مسلمان اطمینان اور راحت کی زندگی بسر کررہے تھے مستقبل کے خطرات کا انھیں احساس نہیں تھا۔ لیکن کانگریس کی ریشہ دوانیوں اور وفاقی مقننہ میں ریاستوں کی نمائندگی کو عوامی قرار دینے کے لئے جب ذمہ دارانہ حکومت کا مطالبہ کیا جانے لگا تو مسلمانوں نے کروٹ بدلی اور انھیں اپنے مفادات کے تحفظ کا خیال آیا۔ مجلس اتحادالمسلمین نے جو ایک مذہبی جماعت تھی سیاست میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا۔

مسلمان آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ۱۵ فیصد کی اقلیت میں تھے۔ لیکن فرمانروائے ملک کے ہم مذہب ہونے کی وجہ سے حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں تھی وہ اپنی اس سیاسی اہمیت سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ تھے۔ اپنے اس موقف کو وہ بادشاہ کے دامن کا سہارا لے کر ہی باقی رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ اتحادالمسلمین نے اپنے دستور میں اس جزو کا اضافہ کیا:

"مسلمانانِ مملکت آصفیہ کی یہ حیثیت ہمیشہ برقرار رہے کہ فرمانروائے ملک کی ذات اور تخت ان ہی کی جماعت کے سیاسی اور تمدنی اقتدار کا مظہر ہے۔ اسی بناء پر مملکت کی ہر دستوری ترمیم میں فرمانروا کے اقتدارِ شاہانہ کی بقاء و احترام مقدم رہے"

اتحاد المسلمین کا یہ ایک سیدھا سادا سیاسی مسلک تھا جس کے بغیر مسلمان مملکت میں اپنے موجودہ پوزیشن کو برقرار نہیں رکھ سکتے تھے۔ بعد میں اس مسلک نے سیاسی کلمہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔

اتحاد المسلمین کے احیاء جدید کے علمبردار نواب بہادر یار جنگ تھے جو ملک میں اپنی بے مثال خطابت اور اسلامی طرز زندگی سے وابستگی کی وجہ سے مسلمانوں کے مسلمہ قائد تسلیم کئے جانے لگے تھے۔ اتحاد المسلمین کے جدید دستور منظور ہونے تک ابو الحسن سید علی مجلس کے معتمد تھے جبکہ مجلس کے اندر صدر کا کوئی عہدہ نہیں تھا۔ ابو الحسن ایک کامیاب ایڈوکیٹ تھے اور دستوری مسائل پر اُن کی بڑی گہری نظر تھی۔ ہندو جماعتوں اور ان کی ذہنیتوں کا بھی انھیں بڑا تجربہ تھا۔ چنانچہ بہادر یار جنگ اور ابو الحسن سید علی کی سرکردگی میں دکن کا مسلمان ایک قلیل عرصہ میں سیاسی طور پر بیدار ہو گیا اور اتحاد المسلمین کی شاخیں ملک کے طول و عرض میں ہزاروں کی تعداد میں قائم ہو گئیں۔ اتحاد المسلمین کے جدید دستور کی منظوری کے بعد بہادر یار جنگ اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے اور ان کے اچانک انتقال کے بعد ابو الحسن سید علی ان کے جانشین قرار پائے۔ مجلس کے چاروں صدور کے بالتفصیل حالات علیحدہ اس کتاب کے حصہ دوم میں شامل کئے گئے ہیں موجودہ باب میں ہم اتحاد المسلمین کی پالیسیوں کا اجمالاً جائزہ لیں گے جن کا حیدر آباد اور مسلمانوں کے مستقبل سے تعلق تھا۔

اتحاد المسلمین کے عروج کا دور وہی ہے جبکہ مجلس کے جدید دستور کے منظور ہونے کے پہلے ابو الحسن سید علی اس کے معتمد اور دستور کی منظوری کے بعد بہادر یار جنگ اس کے اپنی وفات تک صدر تھے۔ اس زمانہ میں مجلس کی جو بھی پالیسی تشکیل پائی وہی بعد کے آنے والے صدور کے لئے چراغ راہ بنی رہی۔ ان میں قابل ذکر مسائل یہ ہیں (۱) پیرامونٹسی کی مخالفت (۲) آزادی کا مطالبہ۔ (۳) ذمہ دارانہ حکومت سے اختلاف

(۴) حیدرآباد میں مسلمانوں کی سیاسی برتری کا استقرار ۔

پیرامونٹسی کی مخالفت | ہندوستان کی کسی دیسی ریاست میں انگریزوں کے تسلط کے زمانہ میں پیرامونٹسی کی اتنی شدید مخالفت نہیں کی گئی جتنی کہ مجلس اتحاد المسلمین نے حیدرآباد میں کی مسلمانوں کا کوئی ایسا سیاسی اجتماع نہ تھا جس میں کھل کر برطانوی حکومت اور رزیڈنسی پر اعتراضات نہ کئے جاتے ہوں ۔ دوسری عالمگیر جنگ کے شروع ہونے کے بعد جبکہ برطانوی حکومت نے جنگ کے اختتام پذیر ہونے پر ہندوستان کو قلمروی مرتبہ دینے کا وعدہ کیا حیدرآباد کی آئینی حیثیت، برار اور مفوضہ علاقہ جات کی واپسی اور خارجی اور داخلی امور میں حیدرآباد کی آزادی کے مطالبات میں شدت پیدا ہوگئی ۔ اپنے ایک خطبہ صدارت میں بہادر یار جنگ نے فرمایا :۔

"اگر اس جنگ عظیم کا نتیجہ یہی ہے کہ دو سو سال کا غلام ہندوستان دنیا میں پھر ایک مرتبہ زیر سرپرستی تاج برطانیہ آزادی کی سانس لے تو اس کا دوسرا لازمی نتیجہ یقیناً یہ ہونا چاہیئے کہ حیدرآباد نے جتنے اقتدارات، ذمہ داریاں اور جتنے علاقہ جات و مقبوضات تاریخ کے مختلف دور میں اپنے حلیف کے تفویض کئے تھے وہ سب بلا کسی شرط کے اس کو واپس کردئے جائیں ۔ اس کے دوسرے الفاظ میں یہ معنی ہوں گے کہ ایک طرف حیدرآباد کے جغرافی حدود میں برار، شمالی سرکار اور مچھلی پٹم داخل ہوں گے اور دوسری طرف حیدرآباد ایک آزاد اسلامی سلطنت کی حیثیت سے آزاد ہندوستان اور دنیا کے دوسرے آزاد ممالک سے اپنے سیاسی تعلقات قائم کرنے کا مجاز ہوگا ۔ داخلی امور کے سلسلہ میں ہم کو کامل اطمینان ہے کہ ہماری آزادی میں کوئی مداخلت نہیں ہوسکتی ۔ اگر صدارتِ عظمیٰ یا وزراء کونسل کے عزل و نصب میں ہماری کامل آزادی کا دامن کسی مشورت یا مداخلت سے اُلجھ رہا ہو تو ہم اس کو برداشت نہیں کرسکتے ۔"

پیرامونشی کی منتقلی کے متعلق بھی بہادر یار جنگ نے مجلس اتحاد المسلمین کے نقطہ نظر کی یوں وضاحت فرمائی تھی:

"ہندوستان میں قائم ہونے والی مقبوضاتی حکومت اپنے آپ کو دیسی ریاستوں کے مقابلہ میں تاج برطانیہ کا قائم مقام تصور کرے اور ریاستوں سے خواہش کرے کہ وہ اس کو اپنا اقتدار اعلیٰ تسلیم کریں۔ مسٹر گاندھی اور دوسرے کانگریسی زعماء کے متعدد بیانات ان کی اسی تمنا پر دلالت کرتے ہیں لیکن کانگریس کے ارباب اقتدار کو واقف ہوجانا چاہیئے کہ حیدرآباد اپنی تاریخ کے ہر دور میں ایک آزاد سلطنت رہا ہے اور آئندہ بھی ایک آزاد سلطنت رہے گا اور سلطنت برطانیہ کے ساتھ اس کے دوستانہ اور حلیفانہ تعلقات ایسے نہیں ہیں جو ایک سے دوسرے کے ہاتھوں فروخت یا منتقل کئے جائیں۔ اگر تاج برطانیہ ہندوستان کی سیاست میں کسی ایسی تبدیلی کو گوارا کرلیتا ہے جو ہندوستان میں اس کے اقتدار کی قلت کا باعث ہو اور وہ اپنے حلیف یعنی حیدرآباد کے ساتھ کئے ہوئے معاہدات کی تکمیل کے قابل نہ رہے تو اس کا پہلا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ ساری ذمہ داریاں جو حیدرآباد کی طرف سے اس نے اپنے اوپر لی تھیں حیدرآباد کو واپس کردے"

امداد جنگ میں حیدرآباد نے اپنی روایات سابقہ کی طرح شایانِ شان حصہ لیا مجلس اتحاد المسلمین نے بھی مسلمانوں کے تعاون سے دریغ نہیں کیا لیکن ساتھ ہی اس امر کا شدت سے مطالبہ کیا کہ حیدرآباد میں آلاتِ حرب کے کارخانے قائم کئے جائیں، فوج میں توسیع کی جائے اور ہندوستان کو مقبوضاتی مرتبہ عطا ہونے سے پہلے برطانیہ کے ساتھ حلیفانہ تعلقات کی اس طرح تجدید کی جائے جس کے ذریعہ حیدرآباد کی داخلی اور خارجی آزادی اور انفرادیت کا تیقن حاصل ہوجائے اور اس کے مفوضہ علاقے اس کو مسترد کردئے جائیں۔

سر اکبر حیدری نے بھی بحیثیت صدر اعظم باب حکومت مجلسِ مقننہ میں حیدرآباد کی آئینی حیثیت اور دفاع کے متعلق ان ہی خیالات کا اعادہ اس طرح کیا تھا:

"ملک معظم کی حکومت نے اب یہ واضح کر دیا ہے کہ ان کا نصب العین ہندوستان کو کامل نوآبادیاتی درجہ دینا ہے ... ہندوستان کے کسی دستور میں اگر ان تعلقات کا کوئی جزو بھی کسی اور کو منتقل کیا جائے تو جہاں تک حیدرآباد کا تعلق ہے ایسی منتقلی اعلیحضرت اقدس و اعلیٰ کی منظوری کے بغیر عمل میں نہیں لائی جا سکتی .... اس کا اطلاق علاوہ دوسرے امور کے مسئلہ دفاع پر بھی ہوتا ہے جس میں بعض وسیع علاقوں کے معاوضوں میں چند خصوصی فوجی ضمانتیں بھی حاصل کی گئی تھیں ۔ اگر کوئی غیر معمولی تغیر دفاع کے متعلق واقع ہو تو اس کا اطلاق ریاست پر بغیر ریاست کی منظوری کے نہیں ہو سکے گا۔"

آزادی کا مطالبہ ابتداء سے اتحاد المسلمین کے پیش نظر حیدرآباد کی آزادی کا مسئلہ رہا ہے اور اس میں شدت پیدا ہوتی گئی کانگریس کے پلیٹ فارم سے یہ ادعا کیا جانے لگا کہ حکومت برطانیہ کے ساتھ ریاستوں کے معاہدات کی کوئی اخلاقی بنیاد نہیں ہے اور وہ ازمنہ وسطیٰ کی یادگار ہیں اس مسئلہ پر ابو الحسن سید علی نے اپنے زمانہ معتمدی کے خطبات صدارت میں بڑی سنجیدہ بحثیں کی ہیں ۔ ان خطبات کے پڑھنے سے ان کی عمیق نظر، وسعت علم اور تدبر کا اندازہ ہوتا ہے ۔ ان کے نزدیک حیدرآباد آئینی، سیاسی، معاہداتی، اقتصادی لحاظ سے آزاد ہے اور اس کی اس حیثیت کو باقی رہنا ضروری ہے اور ہندوستانی زعما کو اپنے ان شکوک و شبہات کو دور کر دینا چاہیئے کہ حیدرآباد اپنے مطالبہ آزادی سے ہندوستان کی آزادی میں سد راہ بنے گا۔ حتیٰ یہ کہ حیدرآباد کے ہندو زعمانے بھی حیدرآباد کے سیاسی اقتدار کی بقا، کامل ترقی کے امکانات اور داخلی معاملات میں کسی بیرونی قوت کی مداخلت نہ ہونے سے متعلق اتحاد المسلمین کے مطالبات سے اتفاق کیا تھا۔ بہادر یار جنگ تو حیدرآباد کی شمع آزادی کے پروانہ تھے ۔ وہ حیدرآباد کو صحیح معنوں میں ایک خود مختار ہر قسم کی مداخلتوں سے پاک اور آزاد بادشاہت و سلطنت

دیکھنا چاہتے تھے اور ان کو یقین تھا کہ ہندوستان کا جو بھی دستور آئندہ مرتب ہوگا اس میں حیدرآباد اپنی تاریخی حیثیت اور معاہداتی مرتبہ کے لحاظ سے اس طرح آزادانہ اور خودمختارانہ حصہ لے گا جو اس کی انفرادی حیثیت کو اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ برقرار رکھے گا۔ بہادر یار جنگ کے الفاظ ملاحظہ ہوں :۔

"مجھ سے کہا گیا ہے کہ لارڈ ریڈنگ کے نظریۂ اقتدار اعلیٰ نے حیدرآباد کی آزادی کے خلاف ایک دلیل فراہم کی ہے جو نظریہ آج تک مسلمہ طور پر (define) ہی نہ ہوا ہو اور جس کو ایک فریق ابھی تک محتاج تعریف تصور کرتا ہو اس پر استدلال کرتے ہوئے حیدرآباد کی آزادی سے انکار تدبر و دانائی سے تہی دامنی کا اقرار ہے۔

حیدرآباد کی آزادی کے خلاف ایک دوسری دلیل مجھ سے بیان کی گئی وہ یہ ہے اواخر انیسویں صدی میں جبکہ ملکہ وکٹوریہ نے قیصر ہند ہونے کا اعلان کیا تو سارے رؤسائے ہند نے چونکہ اس کو قبول کر لیا تھا اس لئے ان کا آزادانہ ہونا مسلم ہے مجھے آج بھی ملکہ وکٹوریہ کے پوتے کے شہنشاہ معظم ہونے سے انکار نہیں ہے لیکن کوئی شہنشاہ اپنی شہنشاہی کا دعویٰ نہیں کر سکتا جب تک چند آزاد بادشاہتیں اس کے ساتھ حلیفانہ تعلق نہ رکھتی ہوں اگر برطانوی دولت عامہ میں چند آزاد اور خودمختار جمہوریتیں موجود رہ سکتی ہیں اور خود ہندوستان آزادی کی منزل سے قریب تر ہو رہا ہے۔ وہ ہندوستان جس پر ملکہ معظمہ اور ان کے پوتوں کی شہنشاہیت کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور اس کو آزادی دی جا رہی ہے جس کی غلامی میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں تھی ایسے زمانہ میں کسی کا اس سلطنت کی آزادی کے خلاف دعوی شہنشاہیت سے استدلال نہ صرف غلط بلکہ مضحکہ خیز ہے۔

اصل چیز جس کے ذریعہ حیدرآباد کے سیاسی موقف کا تعین کیا جا سکتا ہے وہ معاہدات ہیں جو صاف، واضح اور غیر مبہم طور پر حیدرآباد کی آزادی کاملہ کی ضمانت دے رہے ہیں۔ اگر معاہدات کی تعبیر میں اختلاف ہو تو اس کا فیصلہ کرنے کا حق بھی

کسی ایک فریق معاہدہ کو نہیں اگر ضرورت پڑے تو اس کا فیصلہ ایک آزاد ثالثی کریگی۔"

ذمہ دارانہ حکومت | حیدرآباد کے مسلمان ذمہ دارانہ حکومت کو اپنی سیاسی موت سے تعبیر کرتے تھے جس کو بعض لوگ ان کی تنگ نظری پر محمول کرتے ہیں۔ دکن پر مسلمانوں کا اقتدار قلت یا کثرت آبادی کی بنیاد پر قائم نہیں ہوا تھا بلکہ انھوں نے دکن کو فتح کیا تھا اور اس حیثیت سے ان کی حکومت وہاں قائم تھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو اس خاک سے وابستہ کرلیا تھا، رعایا کے مذہبی معاملات سے وہ بے تعلق تھے، رواداری اور انصاف پسندی کو انھوں نے اپنا شعار بنایا، ملک کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھا اور اندرون ملک امن و امان قائم کیا۔ چونکہ ہندوستان ابتداء سے بادشاہت کے سوا کسی طرز حکومت سے آشنا نہ تھا اس لئے اہل ملک کے جذبات اور اعتقادات کو پیش نظر رکھکر اور اپنے شخصی اقتدار کو باقی رکھنے کے لئے ملوکیت ہی کو آخر وقت تک برقرار رکھا گیا۔ اسلام کی تبلیغ کو عمداً نظرانداز کیا ورنہ آج پورا ہندوستان حلقہ بگوش اسلام ہوتا اور مسلمانوں کو اپنی قلت تعداد کا خمیازہ بھگتنا نہ پڑتا۔ بہرکیف سلاطین سلف کی غفلت اور غیر مآل اندیشی کی وجہ سے ہندوستان میں مسلمان بجز چند صوبجات کے ہر جگہ اقلیت میں تھے۔ قلت و کثرت آبادی کے مسئلہ نے ہندوستان میں انگریزوں کی آمد تک کوئی نازک صورتِ حال اختیار نہیں کی تھی لیکن ہندوستان پر انگریزی تسلط کے بعد یہاں کی سیاست میں ایک انقلاب عظیم برپا ہوا۔ انگریزی تعلیم سے جمہوری خیالات کو فروغ ملنے لگا۔ جمہوریت کو ہندوؤں نے حصول اقتدار کا ذریعہ سمجھا اور اس امر کو نظرانداز کردیا کہ ہندوستان کے مزاج کے لئے جمہوریت موزوں طریقہ حکومت نہیں ہے۔ یہ صرف ان ممالک کے لئے سازگار ہے جہاں نسلی، مذہبی، تمدنی اور لسانی یکجہتی ہو اور ہندوستان میں متحدہ قومیت کو فروغ دینے والی ایک بھی چیز نہیں تھی۔ لیکن سیاسیات کے ان بنیادی اصولوں کو تسلیم کرنے والا کون تھا۔ ہندو کثرتِ آبادی کے زعم میں حصول اقتدار کے لئے بے چین تھے ہندوؤں سے مصالحت کی ہر گفتگو ذمہ دارانہ حکومت کے مطالبہ کے تان پر ٹوٹتی تھی۔ بہادر یار جنگ فرماتے ہیں :

"مسلمان اس طرز حکومت کو ایک بعید نصب العین کے طور پر بھی قبول کرلیں تو اس اقتدار کا کیا حشر ہوگا جو ان کو یہاں چھ سو سال سے حاصل ہے۔ ہم حیدرآباد کی آبادی میں صرف (۱۵) فیصد کا تناسب رکھتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مقننہ میں اکثریت ہندوؤں کی ہوگی اور اکثریت بھی اتنی کہ ہماری رائے اس کے سامنے کچل کر رہ جائے گی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندو وزارت تشکیل دیں گے اور ایسی وزارت تشکیل دیں گے جو اعلیٰحضرت کے نزدیک نہیں بلکہ اپنے اعمال و افعال کے لئے اپنی ہی جماعتی اکثریت رکھنے والی مقننہ کے نزدیک ذمہ دار ہوں گے گویا چند دنوں میں اعلیٰ حضرت کی حیثیت وہی ہو کر رہ جائے گی جو شاہ شطرنج کی ہوتی ہے۔ حیدرآباد میں مسلمان کسی ایسے جمہوری اصول، اس کے مطالبہ یا اس کے خیال کو بھی برداشت نہیں کرسکتے جو جمہوریت کا نام لے کر ہندو اکثریت کے اقتدار کو بڑھانے کا باعث ہو۔ وہ کسی ایسے ادارہ سے تو اشتراک عمل پر غور کرسکتے ہیں جس میں ان کی آواز کو پوری قوت حاصل ہو اور جو یہاں کی مسلم حکومت کو ایماندارانہ مشورہ دینے، رعایا کے جذبات سے صحیح طور پر واقف کرنے اور اس کی ضروریات کو ظاہر کرنے کا کام دے لیکن کسی ایسے ادارہ کو قبول نہیں کرسکتے جو وزراء کی ذمہ داریوں کو مسلم بادشاہ کے سوا غیر مسلم اکثریت کی طرف منتقل کردے۔"

مسلمانوں کی سیاسی برتری کا استقرار ذمہ دارانہ حکومت سے اختلاف کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ مسلمان دکن میں اپنی سیاسی حیثیت کو کسی طرح متاثر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ بادشاہ کی ذات ہی ان کے سارے اقتدار کا سرچشمہ تھی اور بادشاہ کے اقتدار کامل کا گھٹانا یا اس کو کسی اور پر منتقل ہوتا دیکھنا ان کے نزدیک سیاسی گناہ کے مترادف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان کسی ایسے دستوری اصلاحات کے نفاذ کی تائید میں نہ تھے جس سے بادشاہ کے اقتدار میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں اینگار کمیٹی کی سفارشات کی بنا پر جو اصلاحات حکومت نے

منظور کیں ان کی رو سے مسلم نشستیں ہندوؤں کے مساوی رکھی گئی تھیں ایوان ۸۵ ارکان پر مشتمل تھا جس میں اراکین منتخب شدہ (۴۲) اور نامزد شدہ (۲۸) اراکین باب حکومت (۷) اراکین صرفخاص (۳) اراکین علاقہ جات (۵) ارکان نامزد شدہ میں سے دو عیسائی اور ایک پارسی رکن کا لزوم رکھا گیا تھا۔ اس طرح مسلمان ہندوؤں کے مقابلہ میں مساوات اور غیر مسلموں کے مقابلہ میں اقلیت کے پوزیشن میں آجاتے تھے۔ انتخاب مخلوط اور مفادات کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا۔ اتحاد المسلمین نے بہادر یار جنگ کی سرکردگی میں اصلاحات کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ سر اکبر حیدری کی حکومت سے مسلمانوں نے تین مطالبات کئے (۱) حیدرآباد کے اسلامی مملکت ہونے کا اقرار کیا جائے (۲) مخلوط کی بجائے جداگانہ انتخاب (۳) صرفخاص کے تین نمائندے مسلم ہوں۔ ابتداء میں حکومت لیت ولعل کرتی رہی لیکن جب مسلم مطالبات میں شدت پیدا ہوگئی تو قائدِ اعظم کو درمیان میں ڈال کر مسلمانوں کو اس امر کا تحریری تیقن دیا گیا کہ ان کے مطالبات تسلیم کرلئے گئے لیکن انھیں راز میں رکھا گیا۔ دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوتے ہی حکومت نے اصلاحات کی پوری اسکیم ہی کو معرضِ التواء میں ڈال دیا۔

اتحاد المسلمین کے یہ وہ بنیادی مطالبات تھے جو اس زمانہ میں پیش کئے گئے تھے جبکہ ہندوستان میں انگریز ایک وفاقی اسکیم کی طرح بندی میں مصروف تھے۔ ان کی معقولیت اور حق بجانب ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا ورنہ وفاق میں حیدرآباد کی شرکت سے نہ صرف اس کا معاہداتی موقف زائل ہوجاتا بلکہ پیرامونٹسی کی مداخلت جو اب تک نامعلوم طور پر ہوتی تھی وہ کھلے بندوں اور قانون کے تحت ہونے لگتی ۔ اگر مرکزی حکومت میں کانگریس کو اقتدار حاصل ہوجائے جس کا قوی امکان تھا تو حیدرآباد کا مسلم اقتدار مرکزی حکومت کی نکتہ چینی اور مداخلتوں کا آماجگاہ بن جاتا۔ مسلمان اس صورت حال کے تصور سے لرزہ براندام تھے۔

ابوالحسن سید علی نے اپنے دورِ صدارت میں اتحاد المسلمین کی متذکرۂ بالا معیلنہ پالیسیوں

میں تھوڑی سی ترمیم پیدا کرنے کی کوشش کی تھی خصوصاً باب حکومت میں عوامی ارکان کو داخل کرکے وہ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے کر ترقی کی جانب قدم بڑھانا چاہتے تھے۔ جنگ کا خاتمہ ہو چکا تھا، انگریزوں کی عالمی قوت ٹوٹ چکی تھی۔ جنگ کے قبل ہندوستان کو مقبوضاتی حیثیت عطا کرنے کا جو وعدہ کیا گیا تھا اس کی ایفا کا وقت آگیا تھا، کانگریس نے حکومت سے مقابلہ کے لئے اپنی قوتوں کو پھر سے مجتمع کرنا شروع کر دیا تھا، قائداعظم نے مسلم لیگ کو منظم کرکے مسلمانوں میں زندگی کی کشمکش پیدا کر دی تھی اور پاکستان کا قیام مسلمانوں کا مطالبہ سیاسی بن چکا تھا۔ ہندوستان کی بساط سیاست میں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ لیکن حیدرآباد پر جمود طاری تھا۔ جنگ کے اختتام کے باوجود حکومت حیدرآباد مسلم تیقنات کی وجہ سے اصلاحات کے نفاذ سے ہچکچا رہی تھی، حیدرآباد کی مجلس وزراء ایک عرصہ سے چند خاندانوں کا اجارہ بنی ہوئی تھی جو مسلمانوں کے نام سے اپنے ذاتی اقتدار کے تحفظ میں ضمیر اور قانون کا خون کر رہی تھی۔ نظم ونسق کی مشنری میں فرسودگی کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے۔ ابوالحسن سید علی کی دوررس نگاہوں نے ان چیزوں کا جائزہ لیا اور باب حکومت میں عوامی عنصر کی فوری شرکت کے ذریعہ حالات کو سنبھالنا چاہا۔ لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے اپنی مجلس عاملہ کو اعتماد میں لئے بغیر ہندوؤں سے خفیہ معاہدہ کر لیا اور اپنی قیادت کے زور پر اتحاد المسلمین کے سالانہ جلسہ عام میں ان تجاویز کو منظور بھی کرا لیا لیکن جب اس معاہدہ کے خفیہ پہلو آشکار ہونے لگے اور دربار اور باب حکومت کو اپنے اقتدار کی اجارہ داری کے لئے خطرہ محسوس ہونے لگا تو ابوالحسن سید علی کو اپنی صدارت ہی سے دستبردار ہونا پڑا۔ اگر ابوالحسن سید علی کی قرارداد مصالحت پر عمل ہو جاتا اور وہ اپنے عہدہ پر باقی رہتے تو ممکن تھا کہ حیدرآباد کا مستقبل ایک نئے باب سے

شروع ہوتا۔ ابوالحسن سید علی کے جانے کے بعد مولانا مظہر علی کامل کا دور طوفان کے پہلے سکون کا دور تھا۔ پارلیمانی وفد اور کابینی مشن کی آمد انقلاب انگیز سیاسی تبدیلیوں کا پیش خیمہ تھی۔ حیدرآباد کے مطلع سیاسی پر سر مرزا کے وزارتِ عظمیٰ پر آجانے سے تھوڑی سی ہلچل ضرور پیدا ہوئی تھی۔ لیکن اس کے سوا مولانا مظہر کے دورِ صدارت میں کوئی اہم واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔

مولانا مظہر علی کامل کی صدارت کے بعد جہاں ہندوستان میں عہد آفریں تغیرات رونما ہونے لگے وہاں اتحاد المسلمین میں اقتدار کی جنگ شروع ہوگئی۔ مجلس کے اندر کوئی ہمہ گیر شخصیت ایسی نہ تھی جو دستوری اور سیاسی گھتیوں کی عقدہ کشائی کرسکے۔ قاسم رضوی نے اپنی انتخابی فرزانگیوں کو کام میں لاکر مجلس کی صدارت پر قبضہ کرلیا۔

ماہ جون ۱۹۴۷ء ہی میں تقسیم ہند کا فیصلہ ہوچکا تھا لیکن رسمی طور پر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو دونوں جدید مملکتیں وجود پذیر ہونے والی تھیں۔ ۱۱ جون ۱۹۴۷ء کو نظامِ دکن نے حیدرآباد کی آزادی کا اعلان کردیا تھا اور ماہ جولائی میں حیدرآباد اور ہندوستان کے مابین آئندہ تعلقات کی بنیاد تلاش کرنے کے لئے ایک وفد دہلی بھی روانہ کیا گیا تھا اور گفت و شنید کا یہ سلسلہ سقوط حیدرآباد کے چند دنوں قبل تک جاری رہا۔ اس اثناء میں ریاستوں کے انضمام کی اسکیم زوروں پر جاری تھی، کشمیر میں جنگ چھڑ چکی تھی، جوناگڈھ پر ہندوستان نے ناجائز طور پر قبضہ کرلیا تھا۔ حیدرآباد کی آزاد حیثیت کو ہندوستان ایک لمحہ کے لئے برداشت کرنے تیار نہ تھا۔ حیدرآباد پر معاشی ناکہ بندی قائم کی گئی تھی اور ہندوستان میں شرکت کے لئے حیدرآباد پر ہر قسم کا دباؤ ڈالا جارہا تھا حتیٰ کہ فوج کشی کی دھمکی کے ساتھ حیدرآباد کے اطراف ہندوستان کی فوج نے ڈیرے ڈال لئے تھے۔ اندرونِ ملک امن و امان کی حالت قابلِ اطمینان نہ تھی۔ رضاکار افراط و تفریط میں مبتلا ہوچکے تھے۔ حیدرآباد میں ہندوستانی فوج کی بہیمی قوت کی مدافعت کی ہمت و طاقت نہ تھی ان سارے حالات کا قاسم رضوی کو علم تھا لیکن اس کے باوجود حیدرآباد کے لئے ہندوستان

کے اندر کوئی باعزت مقام حاصل نہیں کیا گیا۔ جنگ کو دعوت دی گئی اور حیدرآباد تباہ ہو گیا۔

بہادر یار جنگ نے حیدرآباد کے لئے جس آزاد حیثیت کا مطالبہ کیا تھا اس کے فریق انگریز تھے جنہوں نے حیدرآباد کی اطلاع کے بغیر اس سے کئے ہوئے سارے معاہدات کو نذرآتش کر کے ہندوستان کے اقتدار سے دامن جھٹک دیا تھا۔ اب معاملہ ایک متعصب ہندو حکومت سے تھا جو حیدرآباد کے مسلم وجود ہی کو برداشت کرنے تیار نہ تھی۔ ایسی صورت میں عقلمند قیادت کم از کم ملک کے سارے مسلم عناصر کو اعتماد میں لے کر فیصلہ کرتی تو حیدرآباد کا وہ حشر نہ ہوتا جو آج ہماری آنکھوں کے سامنے ہے بظاہر قدرت نے بہادر یار جنگ کو حیدرآباد کے اس روزِ سیاہ کے دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رکھا لیکن اگر وہ زندہ ہوتے تو حالات کا تجزیہ کر کے صحیح نتیجہ پر پہنچتے اور اپنے تدبر، فراست اور معاملہ فہمی سے کوئی ایسی صورت نکالتے کہ سب کچھ ہوتا لیکن حیدرآباد اس طرح تباہ نہ ہوتا۔

۷

ہندوستان کا حیدرآباد کی شرکت پر اصرار

قانون آزادیٔ ہند کی دفعہ ۷ کی بموجب حیدرآباد کو دونوں جدید مملکتوں میں سے کسی ایک میں شریک ہونے یا پھر آزاد رہنے کا حق حاصل تھا جس کی تصدیق برطانوی وزیر اعظم اور پارلیمان کے دیگر مقتدر شخصیتوں کے بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک امر طے شدہ تھا کہ شرکت کے لئے ریاستوں پر کسی قسم کا دباؤ اور زور نہیں ڈالا جائے گا چنانچہ مونٹ بیٹن نے نظام دکن کو اس امر کا تیقن دلایا تھا کہ حکومت ہند کے ارباب حیدرآباد کی شرکت کے لئے معاشی ناکہ بندی یا ایسے کسی حربوں سے کام نہیں لیں گے۔ لیکن جوں ہی ۱۱ر جون ۴۷ء کو نظام دکن نے آزادی کا اعلان کیا حیدرآباد کو ایک غنیم ملک کی حیثیت دے کر ہندوستانی حکومت نے ہر طرح دباؤ ڈالنے کی کوشش شروع کر دی جن میں قابل ذکر سرحدی حملے، معاشی ناکہ بندی اور حیدرآباد کے ہندوؤں کو حکومت کے خلاف ترغیبِ بغاوت تھی۔

اسٹیٹ کانگریس پر ۳۸ء سے جو امتناع عاید تھا وہ ماہ جولائی ۴۷ء میں اس لئے برخواست کیا گیا کہ حیدرآباد کی آزاد حیثیت کے استحکام میں ہندو بھی شایان شان حصہ لے سکیں لیکن ہندوؤں کو حیدرآباد کی آزادی کسی طرح منظور نہ تھی اور وہ ہندوستان کی غلامی کے طوق وسلاسل کو ترجیح دے رہے تھے۔ حیدرآباد اسٹیٹ کانگریس کا پہلا اجتماع جو شہر حیدرآباد میں امتناع کے برخواست کے بعد منعقد کیا گیا اس میں حیدرآباد کانگریس کے صدر نے ہندوستانی یونین میں حیدرآباد کی شرکت کا مطالبہ کیا اور راست اقدام کی

دھمکی دی۔ بلکہ اس کی پیش رفت میں ایک ورکنگ کمیٹی ترتیب دی گئی جس نے ماہ جولائی ۱۹۴۷ء میں حیدرآباد کے متصلہ صوبوں کا دورہ کیا اور سیول نافرمانی کے انتظامات مکمل کر لئے جولائی ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتہ اور اوائل ماہ اگست میں اسٹیٹ کانگریس کے تمام ذمہ دار لیڈر "زیر زمین" ہوگئے اور کانگریس کے تینوں ذیلی مراکز متصلہ صوبجات کے شہروں میں منتقل کئے گئے۔ آندھرائی شاخ کا دفتر بجواڑہ، مہاراشٹر کا منماڑ اور کرناٹک کا گدگ منتقل کیا گیا۔ علاوہ ازیں بمبئی، مدراس، ناگپور، شولاپور اور دیگر شہروں میں حیدرآباد کے خلاف علاقائی مراکز قائم کئے گئے جہاں سے حیدرآباد کے خلاف مقامی زبانوں میں پمفلٹ شائع ہوتے اور اندرون ملک تقسیم کئے جاتے تھے اور اخبارات کو اشتعال انگیز خبریں فراہم کی جاتی تھیں اور لوگوں کو حکومت حیدرآباد کے خلاف اکسایا جاتا تھا۔ اخبارات کے علاوہ ان لوگوں کے پاس ریڈیو ٹرانسمیٹر بھی تھے جس کے ذریعہ حیدرآباد کے خلاف زہر آلود پروپگنڈا کر کے ہندوؤں کو نظام کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لئے ابھارا جا رہا تھا۔ پروپیگنڈے کی تکنیک وہی تھی جو ہندوؤں نے ہمیشہ استعمال کی ہے۔ عورتوں کی عزت ریزی، مندروں کی بے حرمتی، قتل، غارتگری اور لوٹ کے فرضی واقعات۔

حیدرآباد کے خلاف سیول نافرمانی کا آغاز، ۷ اگست ۱۹۴۷ء کو شروع کیا گیا۔ جلسے اور جلوس منعقد کئے جانے لگے۔ حیدرآباد کانگریس کے صدر سوامی رامانند تیرتھ اور ان کے ساتھیوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا۔ نہتے مسلمانوں پر قاتلانہ حملے بھی کئے گئے۔ ۲۶ اگست کو حضور آباد کے ایک پولیس انسپکٹر کو کانگریس کے چند غنڈوں نے قتل کر دیا۔ ماہ اکتوبر اور نومبر میں حکومتِ حیدرآباد کے خلاف تشدد استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ رعایا کو محاصل کی ادائی سے روکا گیا، ہندو ملازمین کو سرکاری ملازمت سے استعفا دینے، طلبا کو مدارس اور کالجوں کو چھوڑنے اور وکلاء کو وکالت ترک کرنے

کا مشورہ دیا گیا۔ اس اثناء میں ہندو رضا کاروں کو آتشین اسلحہ کے استعمال کی تربیت دینے کے لئے جا بجا کیمپ قائم کئے گئے اور ماہ نومبر کے آخر میں حیدرآباد کے سرحدی مواضعات پر متشدد حملوں کا آغاز کیا گیا۔ ان حملہ آوروں نے کروڑگیری کی چوکیوں کو جو ریاست کی سرحدوں پر واقع تھیں خصوصیت سے نشانہ بنایا حیدرآباد کے طول و عرض پر (۱۰۰۰) کروڑگیری کے ناکوں میں سے (۷۰۰) سے زیادہ کو بالکل مسمار کر دیا گیا۔ ان حملوں میں ہندوستانی صوبوں کی مسلح پولس بھی شریک رہتی تھی۔ آتشین اسلحہ جو استعمال کئے جاتے تھے ان میں جدید ترین فوجی اسلحہ، اسٹن گن، رائفل، ریوالور اور دستی بم ہوتے تھے۔ یہ تفصیلات ان لاشوں اور اسلحہ سے اخذ کی گئی تھیں جو حملہ آور ریاست کی طرف سے جوابی حملوں کے بعد چھوڑ کر جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ریلوں پر حملے کئے جاتے اور حیدرآباد سے باہر جانے والے مسلمان مسافروں کو ہندوستان کے سرحدی اسٹیشنوں پر ریل سے اتار کر قتل کیا جانے لگا۔ حیدرآباد کے اندر بھی ان متشدد کارروائیوں کا سلسلہ جاری رہا چنانچہ ماہ نومبر ۱۹۴۸ء میں ایک ہندو طالب علم نے نظام دکن کی موٹر پر ایک فوجی ساخت کا بم پھینکا جو پھٹ نہ سکا۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ سرحدی حملوں میں شدت معاہدۂ انتظام جاریہ کے بعد پیدا کی گئی جو ۲۹ رنومبر ۱۹۴۷ء میں منعقد ہوا تھا اس معاہدہ کے ذریعہ کے یم منشی کو حیدرآباد میں ہندوستان کا پہلا ایجنٹ جنرل مقرر کیا گیا تھا جس نے حیدرآباد کے خلاف تخریبی عناصر کو ابھارنے میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ اس کی کوٹھی سارے شرپسند ہندوؤں کی آماجگاہ تھی اور حیدرآباد کے خلاف ساری تخریبی سرگرمیاں ایجنٹ جنرل کے اشاروں اور ایماپر انجام پاتی تھیں۔ مستقل معاہدہ کے لئے گفت و شنید کا سلسلہ جاری تھا اور حیدرآباد سے جب دہلی وفود جاتے تو ہندوستان کے ارباب ان واقعات کو رنگ آمیزی سے اس طرح پیش کرتے جیسے حیدرآباد کے مسلمان ہندوستان کے

سرحدی مواضعات کے امن واماں کو غارت کر رہے ہیں اور خود حیدرآباد کے اندر ہندوؤں کی جان و مال محفوظ نہیں ہے

سرحدی تنازعات کی ذمہ داری حیدرآباد پر تھی یا کانگریس پر تھی اس کا جواب کانگریس کے ایک ذمہ دار لیڈر مسٹر رامچندر راؤ کے بیان میں موجود ہے جو سقوطِ حیدرآباد کے بعد انھوں نے ۴ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کے اخبار میزان میں شائع کیا :-

" حیدرآباد پر متشدد حملوں کو تین مرحلوں میں تشکیل دیا گیا تھا جن کا مقصد یہ تھا کہ حیدرآباد پر ہندوستان کے فوجی حملوں کے لئے زمین ہموار کی جائے۔ پہلے مرحلے میں ہم نے (۹۰۰۰) رضاکار حیدرآباد کے اندر بھیجے جنھیں تشدد آمیز کارروائیوں کے ساتھ قید و بند کو قبول کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ تین ماہ تک اس پروگرام پر عمل رہا دوسرے مرحلے میں ان ارضی موانعات کو دور کرنے کی کوشش کی گئی جو ہندوستان اور حیدرآباد میں مصنوعی طور پر حائل تھے یعنی کروڑگیری کے ناکوں کا تاراج کرنا۔ مدراس اور بمبئی کے علاقوں میں متعدد ایسے کیمپ قائم کئے گئے جہاں رضاکاروں کی فوجی تربیت کا انتظام کیا گیا تھا حیدرآباد کے (۱۵۰۰) میل طویل سرحد پر (۷۵۰) کروڑگیری کے ناکے قائم تھے جن میں سے (۵۰۰) کو بالکل مسمار کر دیا گیا۔ جدوجہد کا آخری مرحلہ تخریبی کارروائیوں اور رسل و رسائل کے ذریعوں کے انہدام پر مشتمل تھا۔ اس کام کے لئے ہم نے (۳۰۰۰) کیڈٹس کو مکمل طور پر تربیت دے کر حیدرآباد کے اضلاع میں پھیلا دیا تھا۔ چنانچہ صرف ایک دن یعنی ۲۶ر فروری ۱۹۴۸ء کو (۸۲) مقامات پر رسل و رسائل کو منقطع کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد ہندوستان سے کٹ گیا۔"

بہرکیف سرحدی تنازعات کی تمامتر ذمہ داری ہندوستان پر عائد ہوتی ہے اور

جب حیدرآباد کی جانب سے ان کی مدافعت کی جاتی اور ہندوستان کی پولس یا غنڈوں کو جانی نقصان برداشت کرنا پڑتا تو ہندوستانی اخبارات رضاکاروں کے مظالم کے نام سے آسمان سر پر اُٹھا لیتے۔ دہلی میں گفت و شنید کے وقت حیدرآبادی وفد پر دباؤ ڈالا جاتا کہ حیدرآباد میں امن و امان ختم ہو گیا ہے اور ہندوستانی سرحدی مواضعات پر رضاکاروں کی ریشہ دوانیاں ناقابلِ برداشت ہو گئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی نئی ہندو حکومت نے حیدرآباد پر فوج کشی کے جواز کے لیے تخریبی سرگرمیوں کا یہ سلسلہ جاری کیا تھا۔

حیدرآباد میں بعض موقعوں پر ہندوستانی حملوں کا ڈٹ کر مقابلہ بھی کیا گیا خصوصاً ضلع عثمان آباد کے موضع تانج پر جب ہندوستانی فوج نے غنڈوں کو ساتھ لے کر حملہ کیا تو صرف سات پٹھانوں نے غلہ کے ایک گودام میں قلعہ بند ہو کر وہ مقابلہ کیا تھا کہ ہندوستانی فوج کے متعدد سپاہی کام آئے بالآخر ہوائی بمباری کر کے ان پٹھانوں کو شہید کیا گیا۔ بعض وقت دونوں حکومتوں کے عہدہ داروں نے کسی سرحدی ہنگامہ کی متفقہ تحقیقات بھی کی ہے اور اس کا بھی نتیجہ ہمیشہ ہندوستان کے خلاف ہی برآمد ہوا۔ مثال کے طور پر صوبہ بمبئی میں بیجاپور کے موضع ململور میں ایک ہنگامہ کی اطلاع ٹائمس آف انڈیا میں شائع ہوئی کہ حیدرآباد کی فوج نے حملہ میں حصہ لیا اور ہندوستانی پولس کے چند سپاہیوں کا اغوا کیا گیا۔ اس واقعہ کی جب متفقہ تحقیقات کی گئی تو یہ ظاہر ہوا کہ ۵ رجون ۱۹۴۸ء کو ہندوستان کے (۲۰۰) غنڈے پولس کی امداد کے ساتھ حیدرآباد کے ایک موضع پر حملہ آور ہوئے تھے اور جب ان کا مقابلہ کیا گیا تو چھ لاشوں اور اسلحہ چھوڑ کر یہ بھاگ گئے۔ ان میں پانچ لاشیں ہندوستانی پولس کی تھیں۔ یہ متفقہ رپورٹ جب بطور اظہارِ حقیقت پریس میں شائع ہوئی تو ہندوستانی حکومت نے یہ تاویل کی کہ ہندوستانی عہدہ دار نے رپورٹ پر دستخط تو کیے لیکن وہ اس سے متفق نہ تھا۔ حالانکہ یہی وہ واقعہ تھا جو دہلی میں حیدرآبادی وفد کے سامنے انتہائی

رنگ آمیزی سے پیش کر کے حیدرآباد کو موردِ الزام قرار دے کر فوج کشی کی دھمکی دی گئی تھی۔

اخبارات میں ان بے بنیاد خبروں کی اشاعت سے ہندو عوام کے ذہنوں میں حیدرآباد کی حکومت اور مسلمانوں کے خلاف جذبات نفرت برانگیختہ ہونا اور ان کے دلوں میں آتشِ انتقام کا بھڑک اٹھنا لازمی امر تھا۔ اس کے بعد ہندو لیڈروں اور اربابِ حکومت کے بیانات آگ پر تیل چھڑکنے کا کام دیتے تھے۔ چنانچہ پروفیسر رنگا، مسٹر پرکاشم وزیر اعلیٰ مدراس، ارونا آصف علی، ڈاکٹر رام منوہر لوہیہ، جے پرکاش نارائن نے حیدرآباد کے خلاف زہر افشانیاں کرتے ہوئے ہندوستان کو حیدرآباد پر فوج کشی کرنے کا مطالبہ کیا۔

معاشی ناکہ بندی | حیدرآباد کو ہندوستانی یونین میں شرکت پر مجبور کرنے کے لیے حکومت ہند نے دوسری چالوں کے ساتھ ساتھ سخت معاشی ناکہ بندی بھی کی جو جنگ کے زمانہ میں متحارب قوتیں ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرتی ہیں۔ انگریزوں نے دوستی اور اخلاص کا دم بھرتے ہوئے حیدرآباد کے ساحلی علاقہ پر پہلے ہی قبضہ کر لیا تھا جس کے باعث حیدرآباد ہر طرف سے ہندوستانی علاقوں سے گھرا ہوا تھا۔ غلہ کی حد تک تو وہ خود مکتفی تھا لیکن ضروریاتِ زندگی کی بہت سی چیزوں کے لئے وہ بیرونی ملکوں کا محتاج تھا۔ حیدرآباد سے کپاس اور روغنیات کی ایک بڑی مقدار برآمد بھی کی جاتی تھی۔ حیدرآباد دواؤں، پٹرول، موٹروں، پرزوں، مشنری، بچوں کی غذائی اشیاء وغیرہ بمبئی کی بندرگاہ سے حاصل کرتا تھا۔ حیدرآباد کا برطانوی حکومت سے ۱۸۰۲ء کا ایک تجارتی معاہدہ تھا جس کی رو سے ایک دوسرے ملک سے اشیاء، تجارت کی درآمد برآمد پر کسی قسم کا امتناع عائد نہ تھا۔ قانون حکومتِ ہند کی دفعہ ۷ کے ضمیمہ proviso میں بھی یہی گنجائش موجود تھی۔ معاہدۂ انتظام جاریہ مورخہ ۲۹ نومبر ۴۷ء میں بھی ۱۵ اگست ۴۷ء سے پہلے کے انتظامات کی علیٰ حالہٖ بحال رکھنے کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن اس معاہدۂ جاریہ کی تکمیل کے قبل ہی حیدرآباد کو شرکت

پر آمادہ کرنے اور یہ جتلانے کے لئے ہکی سی ناکہ بندی کی گئی تھی کہ حیدر آباد معاشی طور پر کس قدر ہندوستان کا محتاج اور دست نگر ہے۔ لیکن شرکت کا مسئلہ جب التواء میں پڑنے لگا تو ہندوستان نے ناکہ بندی کی گرفت سخت تر کردی۔ عمل تو یہ تھا لیکن ہندوستان کے انگریز گورنر جنرل کو معاشی ناکہ بندی کے وجود ہی سے انکار تھا اور ایک دستوری گورنر جنرل کی حیثیت سے اس کی ذمہ داری سے وہ اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھتا تھا۔ بالآخر نہرو نے اس کا اعتراف کیا کہ حکومت ہند کی ایما کے بغیر یہ چیز کی جارہی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہندوستان کی ہندو حکومت نے حیدر آباد کی ۸۵ فیصد ہندو آبادی کی صحت و عافیت تک کو اپنے سیاسی مقصد کی خاطر نظر انداز کر دیا تھا۔ اس معاشی ناکہ بندی کا سب سے دلخراش پہلو تو وہ تھا جب کلورین نہ ہونے کی وجہ سے شہر حیدر آباد میں ہیضہ پھوٹ پڑا۔ دواخانے مریضوں سے بھر گئے اور سڑکوں پر جنازوں کی قطاریں بندھ گئیں۔ معاشی ناکہ بندی کا حقیقی مقصد یہ تھا کہ حیدر آباد کو پٹرول اور ڈیزل آئل میسّر نہ ہو تاکہ یہاں کا مواصلاتی نظام مفلوج ہو کر رہ جائے۔ لیکن دنیا کو یہ سُن کر حیرت ہو گی کہ حیدر آباد نے اپنے مقامی کارخانوں میں پاور الکحل تیار کر لیا۔ ہندوستان نے نمک بھی بند کر دیا تھا لیکن صرف ایک ضلع کی مٹی سے نمک کا بدل تیار کر لیا گیا۔ معاشی ناکہ بندی کا حیدر آباد نے بڑی دلیری سے مقابلہ کیا لیکن ہندوستانی علاقوں سے گھرا ہونے کی وجہ سے وہ باہر کی دنیا سے کٹ کر رہ گیا۔

جب سرحدی ہنگاموں اور معاشی ناکہ بندی کا کوئی خاطر خواہ اثر برآمد نہیں ہوا تو ہندوستان نے فوج کشی کے منصوبے کی طرف توجہ کی۔ اس لئے اپنے پروپیگنڈے کی مشنری کو اس نے حیدر آباد کے خلاف پوری قوت سے پھیر دیا۔ عالمی رائے عامہ کو اپنی تائید میں کرنے کے لئے اس نے رضا کارانہ تنظیم اور اس کے مظالم کو اچھالنا شروع کیا تاکہ اس بہانہ سے حیدر آباد پر فوج کشی کا جواز پیدا کر سکے۔ آئندہ باب میں ہم رضا کارانہ تنظیم پر بحث کریں گے

لیکن اس باب کی اغراض کے لئے اتنا بتلا دینا کافی ہے کہ یہ تنظیم اتنی جارحانہ نہیں تھی جتنی کہ انڈیا یونین نے اس کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ہٹلر کے گسپٹو کو بھی جس نے یہودیوں پر سفاکانہ مظالم کئے تھے دنیا میں اتنی تشہیر نصیب نہ ہوئی ہوگی جتنی کہ قاسم رضوی اور رضاکاروں کو ہندوستان نے ان کی ناکردہ گناہی کے باوجود اپنے اغراض کے لئے مشہور کیا۔ یوں بھی رضاکار فرشتوں کی جماعت تو تھی بھی نہیں۔ جب ملک میں امن قائم کرنے اور سرحدی حملوں کو روکنے کے لئے پولس کی جمعیت ناکافی ہونے لگی تو پولس کی امداد کے لئے رضاکاروں کو آگے بڑھنا پڑا۔ ابتداء میں مدافعت کا جوش تھا جو بعد میں جارحانہ صورت اختیار کرنے لگا۔ حکومت حیدرآباد کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تو غنڈہ عناصر رضاکاروں کے نام لے کر لوٹ اور غارت گری کا بازار گرم کرنے لگے۔

یہ حقیقت ابتداء سے روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ ہندوستان اپنی ریاستوں کی انضمام کے منصوبہ کے تحت حیدرآباد کو بہر قیمت شرکت کے لئے مجبور کرے گا حیدرآباد کے خلاف ہندوستان نے جتنے بھی محاذ کھولے تھے ان میں اسی کا پلڑا بھاری تھا۔ فوج کشی کے لئے ہندوستان نے زمین ہموار کرلی تھی۔ مونٹ بیٹن نے ہندوستان چھوڑتے ہوئے حیدرآبادی وفد سے آخری ملاقات کے وقت فوجی خطرہ سے بھی آگاہ کر دیا تھا اور اس وقت تک حیدرآباد کے اطراف فوجیں متعین ہو چکی تھیں لیکن حیدرآباد کے قائدین کی سیاسی بصیرت ایسے خطرات کو گیدڑ بھپکیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی۔ قاسم رضوی نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ہندوستانی فوج حیدرآباد میں قدم رکھنے کی ہمت نہیں کر سکتی، اس نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں اسی لئے اس کو فوج کشی کی علی الاعلان دعوت دی جاتی تھی۔ جب کبھی پنڈت نہرو یا سردار پٹیل کی جانب سے اپنے طے شدہ منصوبوں کی تکمیل کے سلسلہ میں حیدرآباد کے خلاف زہر اگلا جاتا تو قاسم رضوی اس زہر کا زہر ہلاہل سے جواب دیتے تھے۔ طاقتور

کی بات کو دنیا بھول جاتی ہے لیکن کمزور کی زبان کھینچ لی جاتی ہے۔ حیدرآباد کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

گفت وشنید کی آغاز سے حیدرآباد پر فوج کشی کی تاریخ تک کوئی ایسا مرحلہ نہ تھا کہ حیدرآباد کو شرکت کے لئے مجبور نہ کیا گیا ہو۔ پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کا عملاً ان گفتگوؤں سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن ملک کے طول وعرض میں وہ اپنے بیانات سے حیدرآباد کو مرعوب اور ہندوؤں کو حیدرآباد کے خلاف اُبھارتے رہے ہیں۔ اس کے چند نمونے ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں

۱۷ر جون ۱۹۴۸ء کو پنڈت نہرو نے کہا تھا:

"حیدرآباد اپنے محل وقوع کے اعتبار سے آزادی کا تصور نہیں کر سکتا اور چاہے کچھ ہو جائے اور اس کے نتائج خواہ کچھ ہی برآمد ہوں ہندوستان اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔"

اس کے بعد ۲ر جولائی ۱۹۴۸ء کو مدراس میں یہ تقریر کی:

"لوگ حیدرآباد سے ہماری جنگ کے متعلق باتیں کرتے ہیں ان کا آخر کیا مطلب ہے؟ یہ ایک بالکل غلط تصور ہے دیسی ریاستوں سے جنگ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، جنگ بیرونی ملکوں سے ہوتی ہے۔ اگر ہم کو ضرورت پڑی تو ہم حیدرآباد کے خلاف فوجی کارروائی کریں گے۔"

ایک اور تقریر میں یہ کہا:۔

"حیدرآباد کے لئے صرف دو ہی راستے ہیں جنگ یا شرکت۔ ہم گفت وشنید کے ذریعہ اس مسئلہ کو سلجھا رہے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم جنگ کا راستہ اختیار کرنے سے ڈرتے ہیں۔"

پنڈت نہرو نے ۲۶ر جولائی ۱۹۴۸ء کو یہ اعلان کیا:۔

"خواہ کچھ ہوجائے حیدرآباد کی آزادی تو کسی طرح تسلیم نہیں کی جائیگی
جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے وہ سب کچھ کیا جو ہم کرسکتے تھے اب ہمیں
ان افراد سے کوئی سروکار اور واسطہ نہیں ہے جو آجکل حیدرآباد کی حکومت
چلا رہے ہیں۔ ان لوگوں نے ہمیں صریح فریب اور دھوکا دیا ہے۔ ہم صورتِ
حال کی نزاکت اور اس کے تمام پہلوؤں سے بخوبی واقف ہیں اور جب بھی
ہم ضروری سمجھیں گے حیدرآباد کے خلاف فوجی کارروائی کریں گے۔ گذشتہ
چندماہ سے حکومت حیدرآباد نے عوام کو دھوکہ دینے کے لئے ایک ایسا
طرزِ عمل اختیار کیا ہے جو بدمعاشوں اور ڈاکوؤں ہی کو زیب دیتا ہے"۔
(رہبر دکن)

سردار پٹیل نے آزاد حیدرآباد کو ہندوستان کے شکم میں ناسور سے تعبیر کرتے ہوئے
کہا کہ حیدرآباد کے ساتھ جوناگڈھ کی طرح سلوک کیا جائے گا۔

ہندوستان اور حیدرآباد کی گفت و شنید جن مرحلوں سے گذر کر آخر میں ٹوٹی
ہے اس کی تفصیلات آئندہ ابواب میں درج کی گئی ہیں۔ موجودہ باب میں دراصل
گفت و شنید کے گھناؤنے اور تاریک پس منظر کو پیش کیا گیا ہے۔

۸

تحریکِ رضاکاران

برصغیر ہند میں ہر عوامی جماعت کے ساتھ ایک جمعیت رضاکاران اس کے ایک لازمی جزو کی حیثیت سے قائم تھی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے رضاکاروں نے جدوجہد آزادی میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ اسی طرح اتحاد المسلمین میں بھی اس کے احیاء جدید کے بعد سے رضاکاروں کی تنظیم اس کا ایک لازمی عنصر بنی رہی۔ بہادر یار جنگ اس تنظیم کے روحِ رواں تھے۔ اتحاد المسلمین کی کوئی ایسی شاخ نہ تھی جس میں رضاکاروں کا ایک دستہ نہ ہو۔ ان کی تنظیم نیم فوجی انداز کی تھی۔ ان کا ایک یونیفارم ہوتا تھا، وہ روزانہ پریڈ کرتے تھے اور اسلحہ میں ان کے پاس بھرمار بندوقیں ہوتی تھیں جن کے رکھنے کی حیدرآباد میں عام اجازت تھی۔ رضاکاروں کے ذمہ اتحاد المسلمین کے جلسوں کا انتظام ہوتا تھا یا پھر مجلس کے سالانہ اجتماعات کے وقت رضاکاروں کے کیمپ قائم ہوتے تھے اور یہ اپنی فوجی تنظیم کے ساتھ پرچم آصفی کو سلامی دیتے تھے۔

دوسری عالمگیر جنگ کے زمانہ میں بہادر یار جنگ نے ان کی عسکری تنظیم کی طرف زیادہ توجہ کی۔ حیدرآباد کی افواج باقاعدہ جنگی محاذوں پر ہونے کی وجہ سے ملک کے اندر امن وامان کی بحالی کے لئے رضاکاروں کی عسکری تنظیم ضروری بھی تھی لیکن جس وقت سنہ ۱۹۴۰ء میں حکومت ہند نے خاکسار تحریک کو کچلنے کے لئے ساری رضاکارانہ

تنظیمات پر عام پابندی عائد کی تو حیدرآباد میں بھی اس پر امتناع عاید کیا گیا۔ یونیفارم پہننا اور پریڈ کرنے کی ممانعت کی گئی۔ بہادر یار جنگ نے اس خیال سے کہ کہیں یہ تنظیم معطل نہ ہو جائے ایک تقریر میں یہ فرمایا تھا:

"میں کوئی وجہ نہیں سمجھتا کہ صرف لباس اور فوجی طریقہ پر پریڈ کی ممانعت سے ہماری تنظیمیں معطل ہو جائیں۔ رضاکار کے معنی صرف پریڈ کرنے والے سپاہی کے تو نہیں ہیں پریڈ تو اس جذبۂ رضاکاری کو زیادہ تیز اور خود اس کو زیادہ چست بنانے کا ایک ذریعہ تھا۔ کیا یہ چستی اور تیزی سرکاری باقاعدہ فوجوں کے طریقۂ پریڈ سے قطع نظر کسی اور ورزش جسمانی سے پیدا نہیں کی جا سکتی اور کیا رضاکار فوجی لباس کے سوا کسی اور لباس یا امتیازی نشان کے ذریعہ ممتاز نہیں کیے جا سکتے۔ میرے خیال میں ہر شاخ پر رضاکاروں کا ایک رجسٹر ہونا چاہیئے اور ہر رضاکار پر روزانہ ورزش، پانچوں وقت کی نماز اور تین آیات قرآنی کی تلاوت سشرط رضاکاری ہونا چاہیئے۔ جو ان شرائط کو پورا نہ کرے اس کو مجمع عام میں افسر متعلقہ مناسب سزا دے اور اس طرح رضاکار میں جذبۂ عمل پیدا کرے۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارا یہ پروگرام فوجی پریڈ سے زیادہ اہم اور زیادہ مفید ثابت ہوگا۔"

اس امتناع کے پہلے بہادر یار جنگ نہ صرف اتحاد المسلمین کے رضاکار بلکہ بڑے سرگرم خاکسار تھے۔ حیدرآباد اور اضلاع میں بارہا لوگوں نے انھیں خاکی وردی پہنے بیلچہ کاندھے پر رکھے میلوں مارچ پاسٹ کرتے دیکھا ہے۔ بعض وقت ایسا بھی ہوا ہے کہ خاکساروں کے سالار انھیں کسی معمولی سی لغزش (جیسے وقت پر کسی جلسہ عام میں عدم شرکت) پر سزائے جلسہ گاہ کے کئی چکر فوجی تنظیم کے ساتھ کاٹنے کا حکم دیتے اور ہزاروں کے مجمع نے یہ بھی تماشا دیکھا کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا قائد، ناز و نعم میں پلا ہوا امیر کس طرح دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں اپنے سالار

کے حکم کی تعمیل کر کے نوجوانوں میں جذبۂ اطاعت امیر پیدا کر رہا ہے۔ یہی حال ان کا
مجلس کے اجتماعات میں ہوتا تھا۔۔۔ وہ رضاکاروں کے ساتھ ان کے کیمپ میں
منتقل ہو جاتے تھے ان ہی کے ساتھ رہتے سہتے، کھاتے پیتے اور اجلاس کے برخواست
تک اپنے آپ کو تنظیم کا پابند رکھتے۔ اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں :-

"مجھے کیا حق ہے کہ میں اپنے کسی بھائی کو رضاکار کی حیثیت سے یونیفارم
میں بر سرِ میدان آنے کی دعوت دوں اور خود اس طرح تیار ہو کر میدان میں آنے
سے گریز کروں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ قوم میں صحیح جذبۂ عمل پیدا ہو تو ہمارا سب
سے پہلا فریضہ یہ ہونا چاہیئے کہ اپنے عمل کی مثال پیش کریں۔ عسکری تنظیم
تاریخِ اسلام کا ہمیشہ ایک لاینفک جز رہا ہے۔ مسلمان فطرۃً سپاہی اور اس
کے مستقبل کی نجات اسی میں ہے کہ اس کو سپاہی برقرار رکھا جائے۔ خون
کے آنسو رلاتی ہے وہ نزاکت و نسوانیت جو ہمارے نوجوانوں میں دن بدن
بڑھتی جارہی ہے۔ میں خداوندانِ مکتب کو آگاہ کر دینا چاہتا ہوں کہ ان شاہین
بچوں کو خاکبازی کا درس دینا ملت کے لئے قبر تیار کرنے کے مترادف ہے۔"

بہادر یار جنگ نے اپنے عمل اور قابلِ تقلید نمونہ سے رضاکارانہ تنظیم میں جذبۂ عمل اور
ڈسپلن پیدا کر دیا تھا جو آخر وقت تک مشعلِ راہ کا کام دیتے رہے۔ بہادر یار جنگ کے
بعد ابوالحسن سید علی اور مولانا مظہر کے زمانہ میں بھی اس تنظیم نے اپنی افادیت کو باقی
رکھا۔ لیکن قاسم رضوی کے زمانہ میں اس تحریک نے غیر معمولی اہمیت اور عالمی شہرت
حاصل کر لی جس کے خاص وجوہ تھے۔

قاسم رضوی کا اتحاد المسلمین کی صدارت پر انتخاب اس وقت عمل میں آیا جبکہ
کابینی مشن نے اپنی ۳ رجون ۱۹۴۶ء والی تقسیم ہند کی یادداشت پیش کر دی تھی اور
نظامِ دکن نے ۱۱ رجون ۱۹۴۷ء کو حیدر آباد کی آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ کانگریسی

زعما حیدرآباد کی آزاد حیثیت کو کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ حیدرآباد کی اسٹیٹ کانگریس نے بھی آزادی سے اختلاف کرتے ہوئے ہندوستانی یونین میں شرکت کا مطالبہ پیش کر کے حیدرآباد کے اندر تخریبی کارروائیوں کے ایک وسیع پروگرام پر عمل شروع کر دیا تھا جس کی تفصیل باب ماسبق میں آ چکی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی جانب سے حیدرآباد کو شرکت پر مجبور کرنے کے لئے سرحدات پر ہنگاموں اور قتل و غارت گری کا لامتناہی سلسلہ جاری تھا۔ ملک کا امن و اماں خطرہ میں تھا اور حیدرآباد کی پولس تنہا ان تخریبی سرگرمیوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی تھی۔

تقسیم ہند کے بعد مشرقی پنجاب، سکھ ریاستوں اور دہلی اور اس کے نواحی علاقوں میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ ہندوستان کی فوج اور پولس علانیہ ان تخریبی سرگرمیوں میں حصّہ لے رہی تھی۔ حکومت ہند کی مشنری مفلوج ہو کر رہ گئی تھی اور قانون کا احترام ختم ہو چکا تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا۔ برصغیر میں صرف حیدرآباد ہی ایک ایسی ریاست تھی جہاں امن و امان کا دور دورہ تھا۔ حیدرآباد کے مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے ہندوستانی علاقوں میں یہ سارے خونین ڈرامے کھیلے جا رہے تھے؛ ہندوستانی حکومت اور ہندوؤں کے عزائم سے وہ واقف ہو چکے تھے۔ خود حیدرآباد کی حکومت امن و امان کی خاطر مسلمانوں کو مسلح کرنا چاہتی تھی۔ اگر اس وقت قاسم رضوی کے سوا مجلس کا کوئی اور صدر ہوتا وہ رضاکاروں کی اسی طرح تنظیم کرتا جیسے قاسم رضوی نے کی۔ ملک کے حالات دن بدن اتنے سنگین ہوتے جا رہے تھے کہ اگر رضاکاروں کی تنظیم کو وسعت نہیں دی جاتی تو حیدرآباد کا امن و امان بہت پہلے تباہ ہو جاتا۔ حکومت نے ان ناکارہ بھرمار بندوقوں کی بڑی تعداد مجلس کے حوالہ کر دی جو پولس کو جدید اسلحہ سے مزین کرنے کے بعد بیکار پڑی ہوئی تھی۔

قاسم رضوی نے صدارت پر فائز ہوتے ہی اس تنظیم میں نئی روح پھونکنی شروع کی۔

تنظیم کو جو اب تک صدور مجالس کے تابع تھی ایک علیٰحدہ کمان کی تحت کر کے اس کے لیئے ایک جدید دستور مرتب کیا گیا[1]۔ اس کا پورا کنٹرول مجلس عمل کو دیا گیا جس کے پہلے صدر عبدالرؤف تھے۔ یہ تحریک آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی۔ حیدرآباد کا کوئی مسلم نوجوان ایسا نہ تھا جو اس تحریک میں شریک نہو۔ بچے، بوڑھے اور عورتیں تک اس تحریک سے وابستہ ہوگئیں۔ ہر جگہ جدید اسلحہ کی تربیت کے لیئے مراکز کھولے گئے۔ شہر حیدرآباد اور اضلاع کے مراکز پر رضا کاروں کے اجتماعات منعقد کئے جانے لگے جس کی وجہ سے تحریک کو بڑا فروغ ملا۔ جامعہ عثمانیہ، کالجوں اور مدارس کے طلبا نے درس و تدریس کو بالائے طاق رکھکر فوجی تربیت کو اپنا مطمح نظر بنالیا۔ سقوط حیدرآباد کے چند ماہ قبل مجلس عمل کی ہدایات کی بناء پر ہر رکن مجلس کے لئے عام لباس کی بجائے یونیفارم کا پہننا لازمی قرار دیا گیا تھا یونیفارم فیشن میں داخل تھا اور سوسائٹی میں اس شخص کی وقعت نہ تھی جو یونیفارم نہ پہنتا ہو۔

فوجی لباس تو حیدرآباد کے نوجوان نے پہن لیا تھا لیکن فوجی اسلحہ سے وہ لیس نہ تھا برچھے اور بھرمار بندوقیں ہی رضا کاروں کے خاص ہتیار رکھے۔ ملک میں جا بجا بھرمار بندوق ریوالور اور دیسی ساخت کے آتشین اسلحہ کے کارخانے قائم ہوگئے تھے جن کی تجارت چمک اٹھی تھی۔ قاسم رضوی نے اپنی جوشیلی تقاریر میں اس امر کی تلقین کی تھی کہ مسلمان اپنی بیوی کا زیور بیچ کر ہتیار خریدیں۔ جن لوگوں کے پاس فاضل ہتیار تھے انھوں نے مجلس کو تحفتہً اپنا اسٹاک حوالہ کر دیا۔ مجلس میں پہلے ہی سے حکومت کی بھرمار بندوقوں کی کافی مقدار جمع تھی جو سرحدی اضلاع کے رضا کاروں کو قیمتاً فروخت کی جاتی تھی۔ اس طرح مجلس کے اندر ہتیاروں کے بیع و شریٰ کا ایک محکمہ قائم ہوگیا جس کے افسر اعلیٰ قاسم رضوی کے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔ مغربی ساخت کی بندوقیں اور ریوالور کی بڑی مانگ تھی اور ان کی قیمت ہزاروں سے تجاوز کر گئی تھی۔ ہتیاروں کی بیع و شریٰ صیغہ راز میں ہوتی

---

[1] پہلا دستور بہادر یار جنگ کے زمانہ میں مرتب ہوا تھا جب راقم الحروف اس تنظیم کا معتمد تھا۔

تھی اور اس کا حساب کتاب بھی راز میں رکھا جاتا تھا۔ صدر اپنے معتمد علیہ کی کارستانیوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی خاموش تھے جس نے مجلس کے اندر بندوقوں کی دکان لگاکر مجلس کو کافی بدنام کردیا تھا۔ پلیٹ فارم پر تو رضاکاروں کو ناموس ملک کے لئے اپنی متاع عزیز قربان کرنے کی تلقین کی جاتی تھی اور مجلس کے اندر تنظیم ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دے دی گئی تھی جو تعلیم و تربیت، کردار و اخلاق اور سماجی حیثیت سے نچلے درجہ کے لوگ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رضاکار تحریک پروان چڑھتے ہی کنٹرول سے باہر ہوگئی اور غنڈہ عناصر نے اس پر قبضہ کرکے اس کو اپنا آلۂ کار بنانا شروع کردیا۔

ہندوستان کی ہندو حکومت نے حیدرآباد پر فوج کشی کا منصوبہ بہت پہلے تیار کرلیا تھا۔ جب معاشی ناکہ بندی اور سرحدی ہنگاموں کے ذریعہ حیدرآباد کو شرکت پر آمادہ نہ کیا جاسکا تو ہندوستان نے رضاکاروں کے مظالم کو غیر معمولی اہمیت دینی شروع کردی۔ ہندوستان کے اندر اخبارات نے اور ہندوستان کے باہر سفارت خانوں نے رضاکاروں کو ساری دنیا میں شہرت دیدی۔ امریکہ، انگلستان فرانس، جرمنی اور دیگر ملکوں میں قاسم رضوی اور رضاکاروں کے اجتماعات کی تصاویر شائع ہونے لگیں۔ غیر ملکی اخبار نویس ہندوستانی حکومت کی ایما پر حیدرآباد کا دورہ کرتے تھے۔ رضاکار پریڈ اور اجتماعات کی تصاویر لیتے تھے، قاسم رضوی کے بیانات حاصل کرتے اور حکومت حیدرآباد کی فیاضی و مہمان نوازی کی تعریف کرتے ہوئے دنیا کو اس تحریک کی اہمیت سے واقف کراتے تھے۔ انڈیا یونین ان بیانات کی آڑ میں رضاکاروں کے مظالم کو حیدرآباد کی ہندو آبادی اور خود اپنے وجود کے لئے خطرہ ثابت کرتی تھی۔

حیدرآباد میں رضاکاروں کی جملہ تعداد کیا تھی اس کا صحیح علم کسی کو بھی نہیں

لیکن اس کی تخمینی تعداد کسی طرح دو لاکھ سے کم نہ ہوگی لیکن ان میں لباس کے
شوقین بہت زیادہ تھے اور اسلحہ کا استعمال جاننے والے بہت ہی کم۔ پھر اسلحہ ملک
میں تھے کہاں، برچھوں، تلواروں اور بھرمار بندوقوں یا انتہائی قلیل تعداد میں رائفلوں
سے ہندوستان کے ہوائی جہازوں، دبابوں اور جدید ترین اسلحہ سے مقابلہ تو نہیں
کیا جا سکتا تھا۔ آخری زمانہ میں قاسم رضوی رضا کاروں کی تعداد کو پانچ لاکھ بتلا کر
انڈیا یونین کو مرعوب کرنا چاہتے تھے۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرحدی ہنگاموں کے مقابلہ میں رضا کاروں
نے نمایاں کام کیا۔ بعض اضلاع کے رضا کار اپنی تنظیم اور ڈسپلن کے لئے بڑے مشہور تھے۔
اُن اضلاع کو خصوصاً جنھوں نے مجلس کے صدارتی انتخاب میں قاسم رضوی کی مخالفت
کی تھی یہ شکایت تھی کہ باوجود ادائی قیمت کے مرکز سے انھیں اسلحہ کی سپلائی میں لیت و
لعل سے کام لیا جاتا تھا۔ بعض صورتوں میں جب کسی علاقہ میں ہندوؤں کی شورہ پشتی
حد سے بڑھ جاتی تو مرکز سے ان کی سرکوبی کے لئے رضا کار دستے روانہ کئے جاتے۔
کبھی کبھار قاسم رضوی بھی ان دستوں کی سرکردگی کا فرض انجام دیتے۔ بی بی نگر کا مشہور
واقعہ جس میں انڈیا یونین نے قاسم رضوی کو سات سال کی سزا دی، اسی نوعیت کا تھا۔

بات یہ تھی کہ بی بی نگر سے آگے کسی موضع میں کمیونسٹوں نے مسلمانوں کی عافیت
تنگ کر دی تھی۔ مجلس اتحاد المسلمین کو اس کا علم ہوا تو قاسم رضوی نے رضا کاروں
کے ایک بڑے دستے کے ساتھ اس موضع پر دھاوا کیا۔ کمیونسٹ خطرہ سے مسلمانوں
کو بچا کر جب وہ واپس ہو رہے تھے تو راستہ میں بی بی نگر پڑتا تھا جہاں ہندوؤں نے کچھ
دل آزار نعرے لگائے۔ رضا کار اس موضع پر اپنے لیڈر کے علم و ایما کے بغیر ٹوٹ پڑے
قاسم رضوی کی موٹر بہت آگے نکل چکی تھی۔ شہر حیدرآباد کی سرحد کے قریب ایک
موٹر والے نے انھیں بی بی نگر کے واقعہ کی اطلاع دی تو یہ واپس بی بی نگر لوٹے اور

رضا کاروں پر غیظ و غضب کا اظہار بھی کیا. لیکن چونکہ رضا کار ابتدا میں ان کی سرکردگی میں روانہ ہوئے تھے ان کے اعمال و افعال کی ذمہ داری لیڈر پر عائد کی گئی اور اسی بنا پر یہ مورد الزام قرار پائے۔ اپنے عروج کے زمانہ میں یہ چیز قاسم رضوی کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھی کہ بی بی نگر کے واقعہ سے ان کے خلاف کوئی نتائج برآمد کئے جائیں گے یہی وجہ ہے کہ رضاکاروں کی حوصلہ افزائی کے لئے تمغوں اور صداقت ناموں کی تقسیم کے لئے دارالسلام میں قاسم رضوی کی صدارت میں جو جلسہ منعقد ہوا تو یہاں بی بی نگر کے واقعہ میں حصہ لینے والے رضاکاروں کو بھی انعام سے سرفراز کیا گیا تھا۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شہر حیدرآباد کے رضاکار دور دراز کے مواضعات پر دھاوا بھی کرنے لگے تھے یہ بھی شہرت تھی کہ یہ سب مجلس کے بعض عہدہ داروں کے ایما سے ہوتا تھا اور مال غنیمت کی آپس میں تقسیم بھی ہوتی تھی۔ جہاں قتل و غارت گری ہو وہاں ذیلی جرائم جیسے لوٹ مار اور زنا بالجبر...... وقوع پذیر ہو ہی جاتے ہیں مجلس کے عہدہ داروں کے اس عمل کی بعض اضلاع میں بھی اتباع ہونے لگی۔ اس خصوص میں ضلع ناندیڑ کے قصبہ لوہا کا واقعہ قابل ذکر ہے جو نہ صرف ہندوؤں کی بڑی تجارتی منڈی تھی بلکہ یہاں کے ہندو بڑے مالدار بھی تھے۔ ایک منظم منصوبہ کے تحت اس قصبہ کو تاراج کیا گیا یہاں کی غارت گری کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ناندیڑ میں لوٹ کا سونا فی تولہ تیس بتیس روپیہ سے فروخت ہوا ہے۔ جبکہ اس کا بازاری نرخ نوے روپے تھا۔ ایک ہندو وزیر جوشی نے اس واقعہ کو بنیاد بنا کر حکومت سے استعفا دیا۔ ایسے واقعات ادنیٰ پیمانے پر اور بھی مقامات پر وقوع پذیر ہوتے رہے. شر پسند عناصر کو رضاکاروردی میں شر پسندی کا موقع ہاتھ آگیا۔ بڑے مقامات پر حفاظت کے بہانے سے ہندو ساہوکاروں سے جبراً چندے وصول کئے جاتے تھے اور دور افتادہ مقامات پر دھاوے بولے جاتے تھے۔ پولس چشم پوشی سے کام لیتی یا پھر رضاکاروں کے ساتھ شریک ہو کر لوٹ کھسوٹ

میں حصہ لیتی۔ انسداد جرائم کی حد تک پولس کی افادیت ختم ہو چکی تھی۔

رضاکاروں کے نقش قدم پر ایک اور مسلم جماعت چن بشیشٹر کی دیندار انجمن نے ہندوؤں کو لوٹنے کا ایک منظم پروگرام بنایا جس کو مذہبی رنگ دیا گیا یہ جماعت جو اتحاد المسلمین کے کنٹرول سے باہر تھی اپنی غارت گری کو غزوات کا نام دے کر ہندوؤں کے مال و دولت پر ڈاکہ ڈالتی تھی۔ ان کی دیدہ دلیری کی حد ہو گئی جب کہ دن کے وقت انہوں نے شہر حیدرآباد کے اندر بیگم بیٹھ کے ایک متمول ہندو کے گھر ڈاکہ ڈالا۔ پولیس کی کارروائی اور ملزمین کی گرفتاری تو ہوتی رہتی تھی لیکن اس سے ہندوؤں کا دہشت زدہ ہو کر حیدرآباد سے متصلہ صوبجات ہند کو نقل مقام کرنے کا جواز بھی پیدا ہو گیا تھا۔

اس وقت جبکہ اتحاد المسلمین اپنے اقتدار کے نصف انتہا پر تھی مجلس یا قاسم رضوی کے خلاف کسی کو زبان کھولنے کی ہمت نہ تھی۔ مجلس کے اندر شوریٰ[۵] کے اجلاسوں کا یہ حال ہو گیا تھا کہ صدر اور ان کی پالسیوں پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک کانگریسی اخبار روزنامہ امروز کے ایڈیٹر شعیب اللہ خاں کو مجلس کی پالسیوں سے اختلاف تھا۔

رضاکاروں کی ایک جماعت نے محض قاسم رضوی کا تقرب حاصل کرنے کے لئے شعیب اللہ خاں کو بیدردی سے قتل کر کے اس کا سیدھا ہاتھ کاٹ دیا تھا۔ اتفاق سے دو ایک روز قبل قاسم رضوی نے زمرد محل تھیٹر میں یوم تاریخ کے موقع پر اپنی تقریر میں کہا تھا کہ مسلمانوں کے مفاد کے خلاف جو بھی ہاتھ اُٹھے گا وہ قلم کر دیا جائے گا۔ بادی النظر میں یہ اشارہ فرمانروائے ملک کی طرف تھا لیکن رضاکاروں نے اس کو ہر مخالف کی جانب منسوب کر کے اپنے صدر کی بات کی لاج رکھ لی۔

اس قتل کو عام قتل کی وارداتوں کی صف میں شامل نہیں کیا جا سکتا جس طرح دنیا کی بعض انتہا پسند سیاسی جماعتیں اپنے مخالفین سے انتقام لینے میں ایک خاص علامتی

---

[۵] مجلس شوریٰ اتحاد المسلمین کی پارلیمان اور اس کی سب سے مقتدر جماعت تھی۔

تکنیک اختیار کرتی ہیں اسی طرح اس قتل میں مقتول کا داہنا ہاتھ قلم کر دیا گیا تھا سقوطِ حیدرآباد تک پولس نے اس قتل کی تحقیقات میں کوئی دلچسپی نہیں لی حالانکہ مجرموں کو نشان زد کر لیا گیا تھا۔ سقوط کے بعد جو لوگ اس جرم میں ماخوذ ہوئے ان میں شمع قیادت کے ایک سرگرم پروانہ (قادر محی الدین اسیر) کے نام کو دیکھکر کسی کو تعجب نہیں ہوا۔ قائد کے اس فدائی نے ممکن ہے پولس کے ظلم اور اپنی برأت کی خاطر سلطانی گواہ بن کر قاسم رضوی کو بھی اس جرم کے الزام میں ملوث کیا ہو۔ جرم تو ثابت نہ ہو سکا لیکن اس سے قیادت کے حاشیہ برداروں کے کردار کی قلعی ضرور کھل گئی اور قائد کی ذہنیت معلوم ہو گئی کہ اپنے اطراف انھوں نے کس قسم کے لوگوں کو جمع کر رکھا تھا۔

ملک میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا، رضاکار کنٹرول سے باہر ہو چکے تھے اور امن و امان کی حالت دن بدن بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ انڈیا یونین تو ابتدا میں رضاکاروں کے من گھڑت افسانے شائع کر کے رائے عالم کو متاثر کرتی تھی لیکن اب خود رضاکار بھی اسی راستہ پر پڑ گئے تھے۔ جس کو انڈیا یونین نے ان کے لئے نشان زد کر دیا تھا۔ فوج کشی کا خود بخود جواز پیدا ہو گیا یہی وجہ ہے کہ گفت و شنید کے بعض مرحلوں پر انڈیا یونین نے رضاکار تنظیم کی برخواستگی کو شرطِ مقدم قرار دیا۔ لیکن حکومتِ حیدرآباد اور قاسم رضوی اس کے لئے تیار نہ ہوئے کیونکہ ان کے نزدیک تحریک انتہائی بے ضرر اور رضاکاروں کی جماعت معصومین کی جماعت تھی ۱۹ رجون ۱۹۴۸ء کی اپنی ایک تقریر میں قاسم رضوی نے بتلایا۔

"میں اس تنظیم (رضاکار) کو اسی وقت ختم کر دیتا ہوں لیکن جب یہ سیلاب بڑھیگا تو سارے ہندوستان کو بہالے جائے گا۔ اس وقت کہو گے رضوی اس کو روکو جب مجھ سے ناممکن ہو جائے گا، اس وقت یہ رضاکار ایک تنظیم اور ڈسپلن کے پابند ہیں کل چنگیز اور ہلاکو کی فوج ہو گی۔ آج دیانتدار سپاہی ہیں کل یہ پنڈاری اور ٹھگ ہو جائیں گے۔ پھر ان کو کوئی نہیں روک سکے گا۔ اس وقت میرے پاس پانچ لاکھ رضاکا

ہیں۔ جب یہ ڈسپلن ختم کرکے نکلے گا تو کمیونسٹ ہوگا۔ معاف کرنا یہ گولکنڈہ کے قلعہ پر قانع نہ ہوگا۔ اس تنظیم کو قیامت تک ختم نہیں کیا جا سکتا۔ بغیر خدا تعالیٰ کی قوت کے ان کے بڑھتے ہوئے قدم کو کوئی روک نہیں سکتا۔ دنیا کی شر پسند قوتیں باقی رہیں یا نہ رہیں رضاکار باقی رہے گا۔"

ہر تنظیم جب کنٹرول سے باہر ہوجاتی ہے تو اس کا افراط و تفریط میں مبتلا ہونا قابلِ فہم ہوتا ہے۔ اتحاد المسلمین کی رضاکار تحریک اپنے جذبہ اور مقصد کے لحاظ سے ایک بے مثال تحریک تھی۔ حیدرآباد کے نوجوانوں میں ایثار اور قربانی کا جو جذبہ اس نے پیدا کیا موجودہ زمانہ میں ہٹلر کی نازی تحریک ہی میں نظر آیا تھا۔ جرمنی میں تو نازیوں کو فوجی تربیت دے کر فوج میں ضم کر لیا گیا تھا لیکن حیدرآباد کے وسائل ایسے نہ تھے کہ انھیں فوج کا جزو بنایا جا سکتا تھا۔ جنگ کی صورت میں یہ فوج کے معاون بن سکتے تھے لیکن فوجی پیش قدمی کے نہ یہ اہل تھے اور نہ انھیں اس کے لئے تیار کیا گیا تھا اور نہ یہ ایسے اسلحہ سے لیس تھے جو کسی میکانی حملہ آور فوج کی مدافعت کے لئے کارآمد ہو سکے قاسم رضوی کے نزدیک اسلحہ کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ وہ صرف جذبہ آزادی کے قدردان تھے اور اپنی ہر تقریر میں نوجوانوں کے سامنے علامہ اقبال کا یہ شعر دہراتے تھے۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

یہی نہیں بلکہ جنگ چھڑنے کے بعد محاذ پر جانے والے رضاکاروں کو تلقین کی جاتی تھی کہ دبابے کوئی چیز نہیں، ان کے سامنے لیٹ جاؤ، ان کی زنجیروں میں اپنے پیر اٹکادو یہ بیکار ہو جائیں گے۔ نوجوانوں نے اپنے لیڈر کی ہر بات پر عمل کیا اور ہزاروں کی تعداد میں جاں بحق ہوگئے۔ موجودہ زمانہ میں ایثار اور قربانی کے ایسے مظاہرے کسی قوم نے بہت کم پیش کئے ہوں گے۔

رضا کار تنظیم بھی ختم ہوگئی اور حیدر آباد بھی ختم ہوگیا لیکن ان ہزاروں
لاکھوں رضا کاروں اور مسلمانوں کا خون حیدر آباد کے قائدین کی گردن پر قیامت
تک باقی رہ گیا۔

۹
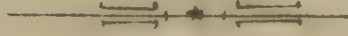
معاہدۂ انتظامِ جاریہ

ہندوستانی حکومت کی یہ کوشش تھی کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے قبل حیدرآباد دیگر ریاستوں کی طرح ہندوستان میں شرکت کرے لیکن ماہ جولائی میں جو وفد انتظام جاریہ کا معاہدہ کرنے دہلی گیا تھا وہ کسی سمجھوتہ پر پہنچے بغیر واپس آگیا تھا۔ لارڈ مونٹ بیٹن نے (جن کی ۱۵ اگست کو نمائندہ تاج کی حیثیت ختم ہوگئی تھی اور وہ صرف دستوری گورنر جنرل رہ گئے تھے) اپنی کابینہ سے گفت و شنید کے لئے مزید دو ماہ کی مہلت طلب کی تھی۔

ہندوستان کو شرکت پر اصرار تھا۔ حیدرآباد شرکت کی بجائے ہندوستان سے معاہدہ کے لئے آمادہ تھا جس کے بموجب مواصلات کو کل ہند بنیادوں پر لانے، دفاع ہند میں اپنی فوج کی ایک مقررہ تعداد شریک کرنے اور امور خارجہ کو ہندوستان کی خارجہ پالسی سے ہم آہنگ کرنے کی آمادگی ظاہر کی گئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ حیدرآباد کی تین شرائط یہ تھیں (۱) ہندوستان اور پاکستان سے جنگ کی صورت میں حیدرآباد غیرجانبدار رہے گا۔ (۲) حیدرآباد کو غیر ممالک میں ایجنٹ جنرل مقرر کرنے اور (۳) اگر ہندوستان کسی بھی وقت برطانوی دولت عامہ سے علیحدگی اختیار کرے حیدرآباد کو حالات کا ازسرنو جائزہ لینے کا اختیار ہوگا۔ اس معاہدہ کا مسودہ سروالٹر مانکٹن نے مرتب کیا تھا جو ایک زمانہ سے نظام کے مشیر دستوری تھے، برطانوی حکومت پر ان کا اثر تھا اور مونٹ بیٹن کے یہ شخصی دوست بھی تھے۔ دیسی ریاستوں کے دستوری معاملات میں ان کی رائے کو ماہرانہ حیثیت

حاصل تھی۔

معاہدہ کی ان شرائط کو نظام کی جانب سے ایک خط کی شکل میں لے کر وفد جس میں نواب چھتاری، علی یاور جنگ اور سر والٹر مانکٹن کے علاوہ عبدالرحیم، ورنگل وینکٹ راما ریڈی بھی شریک کئے گئے تھے دہلی پہنچا۔ قاسم رضوی بھی اپنے چند حواریوں کے ساتھ دہلی روانہ ہوئے۔ اس مرتبہ نظام کے ایما پر وفد کے ارکان نے دہلی میں قائداعظم سے بھی ملاقات کی تھی جنھوں نے جاریہ معاہدات میں معقولیت کو پیش نظر رکھنے کا مشورہ دیا تھا

۸ر اگست کو نظام کا خط مونٹ بیٹن کے حوالہ کیا گیا۔ دہلی سے واپسی کے بعد قاسم رضوی نے وفد کے سرکاری ارکان پر شدید نکتہ چینی کی اور ان پر غداری کا الزام لگاتے ہوئے یہ بتلایا کہ اگر رحیم اور ریڈی نہ ہوتے تو بقیہ ارکان حیدرآباد کو فروخت کر دیتے لیکن یہ الزامات کس بنیاد پر لگائے گئے اس کا علم آج تک کسی کو نہ ہوسکا بجز اس کے کہ یہ بیان کیا گیا کہ جو خط مونٹ بیٹن کے حوالہ کیا گیا وہ اس خط سے مختلف تھا، جس میں غداری کی گئی تھی اور جس کو عوامی ارکان کی وجہ سے روکا گیا۔ ان الزامات اور اعتراضات کا بجز اس کے کوئی مقصد نہ تھا کہ وفد ایسے ارکان پر مشتمل ہو جو بالکلیہ قاسم رضوی کی مرضی کے تابع ہوں۔ ان بے بنیاد الزامات کے جواب میں تینوں ارکان وفد نے (یعنی نواب چھتاری، علی یاور جنگ اور سر والٹر مانکٹن) نظام کی خدمت میں اپنا استعفا پیش کر دیا۔ ۲۵ر جولائی کو دہلی میں گفتگو کی تاریخ مقرر ہوئی تھی۔ اسی تاریخ مانکٹن نے تار کے ذریعہ مونٹ بیٹن کو اپنے استعفا کی اطلاع دی اور یہ بھی بتلایا کہ نظام کا اعتماد حاصل ہوتے ہوئے انھوں نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ اس خبر کو پڑھکر مونٹ بیٹن نے کہا "ہم ڈوب گئے"[۱] مونٹ بیٹن کو مانکٹن کی وفد میں موجودگی سے بڑی توقعات وابستہ تھیں اور حیدرآباد اور ہندوستان کے مابین ایک باعزت سمجھوتہ کی جو امید تھی وہ

۱؎ Mission with Mountbatten by Campbell Johnson

مانکٹن کے بغیر پوری ہوتی نظر نہ آتی تھی. اسی تاریخ نظام نے بھی مونٹ بیٹن کو تار دیا کہ مانکٹن کو وفد میں رہنے کے لئے مجبور کیا جائے ۔ چنانچہ ارکانِ وفد نے اپنے استعفا کو اس وقت واپس لیا جب نظام نے فرمان کے ذریعہ ارکان وفد پر اپنے اعتماد کا اعلان کیا اس سے قاسم رضوی کی بڑی سبکی ہوئی جس کا بدلہ انھوں نے اس طرح لیا کہ نواب چھتاری کو مجبور کر کے امور دستوری کا قلمدان علی یاور جنگ سے لیکر معین نواز جنگ کے حوالہ کرادیا. اس کا عملاً یہ مفہوم تھا کہ وفد سے ان کا تعلق ختم ہوگیا. لیکن نظام نے ان کی جگہ میر سلطان احمد کو وفد کا رکن بنایا، نواب علی نواز جنگ بھی وفد میں شریک کئے گئے اور وفد سے دونوں عوامی ارکان عبدالرحیم اور رنگل وینکٹ راما ریڈی بھی علیحدہ کر دئے گئے ۔

مانکٹن نے مونٹ بیٹن کو اس امر کا یقین دلایا کہ نظام کو انھوں نے امور خارجہ دفاع اور مواصلات کی حد تک ہندوستان میں شرکت کے لئے آمادہ کرلیا ہے بشرطیکہ معاہدہ میں ان امور کی صراحت کی جائے اور شرائط شراکت Instrument of Accession کا نام Articles of Association معاہدۂ مفاہمت میں تبدیل کردیا جائے۔

حیدرآباد کے جدید وفد نے ماہ ستمبر اور اکتوبر میں گفت وشنید کو جاری رکھا. سردار پٹیل شرکت پر مصر تھے اور حیدرآبادی وفد بھی اپنی شرائط پر اٹل تھا. لیکن مونٹ بیٹن کی وجہ سے ہندوستان معاہدہ کے لئے تیار ہوگیا اس تصور میں کہ شراکت کے بنیادی امور کو معاہدہ میں منضبط کر کے معاہدہ انتظام جاریہ کی تکمیل کی سبیل کی جائے گی ۔ چنانچہ ایک مسودہ مرتب ہوا جس پر دونوں وفود نے اتفاق کیا. معاہدہ کے ساتھ اور اس کے جزو کی حیثیت سے دو خطوط بھی نظام کی جانب سے حکومتِ ہند کو لکھے جانے والے تھے جس کے مسودہ پر بھی اتفاق کرلیا گیا تھا ۔ وفد نظام کی منظوری حاصل کرنے کے لئے حیدرآباد واپس لوٹا ۔ نظام نے ان مسودات پر بابِ حکومت (مجلس وزراء یا کونسل) سے رائے طلب کی. کونسل نے ارکان وفد کی موجودگی میں تین روز تک (یعنی ۲۳، ۲۴ و ۲۵ اکتوبر)

ان پر غور کیا اور بالآخر چھ ارکان کی تائید اور تین کے اختلاف سے ان کو منظور کر لیا۔ ۲۵ر کی شام کو وفد نے کونسل کی رائے سے نظام کو مطلع کیا اور نظام نے اکثریت کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے دوسرے روز مسودات پر دستخط کرنے کا وعدہ کیا۔ ۲۶ر کی شام کو پھر ارکان وفد نے یاددہی کی کیونکہ ۲۷ر کی صبح وفد دہلی روانہ ہونے والا تھا۔ نظام نے اس مرتبہ بھی دوسری صبح دستخط کرنے کا وعدہ کیا اور وفد کی روانگی کی تاریخ ۲۸ر مقرر کی گئی۔

۲۷ر کی رات کے دو بجے قاسم رضوی کے حکم پر شہر کے سارے رضاکاروں کو فوری طور پر شاہ منزل پر جمع ہونے کا حکم دیا گیا۔ دو ڈھائی گھنٹوں میں شاہ منزل پر دس ہزار مسلمانوں کا مجمع ہو گیا۔ مجلس کے وزیر عبدالرحیم نے قاسم رضوی کے حکم پر بابِ حکومت سے اپنا استعفا پیش کیا۔ کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ فجر کی نماز قاسم رضوی نے تقی الدین کی امامت میں دلکشا[۱] کے وسیع ہال میں ادا کی اور دعا کے لئے جب امام نے ہاتھ اٹھائے تو مقتدیوں کو مجمع کی غرض و غایت کا علم ہو سکا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ معاہدہ کا جو مسودہ وفد دہلی لے جا رہا تھا وہ حیدرآباد کے مفاد کے مغائر تھا اس لئے ارکان وفد کو پرواز سے روکنے کے لئے یہ حرکت کی گئی تھی۔ ہر رکن وفد کی رہائش گاہ پر اسی طرح اجتماع عمل میں آیا تھا۔ یہ مجمع اس وقت تک منتشر نہیں ہوا جب تک یہ اعلان نہ کیا گیا کہ وفد دہلی پرواز نہیں کرے گا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مجمع کے ساتھ پولس کا ایک جوان تک نہ تھا اور نہ پولس نے کسی قسم کی مزاحمت کی۔

نظام نے پہلی مرتبہ کنگ کوٹھی میں کونسل کا اجلاس طلب کیا اور ہر رکن سے انفرادی طور پر معاہدہ کے متعلق سوالات کئے گئے۔ یہ ۲۷ر اکتوبر کا واقعہ ہے۔ ۲۸ر کو نظام نے ارکانِ وفد سے کنگ کوٹھی میں ملاقات کی اور دوران گفتگو۔۔۔ قاسم رضوی کو بھی طلب کیا گیا۔ کے ایم منشی نے اپنی کتاب میں سر سلطان احمد کے حوالہ سے اس گفتگو کی جو تفصیل بتلائی ہے اس کو

---

[۱] دلکشا متصل شاہ منزل مجلس کے وزیر عبدالرحیم کی سرکاری رہائش گاہ

غیر صحیح باور کرلنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی ۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نظام کے استفسار پر قاسم رضوی نے معاہدہ جاریہ کو حیدر آباد کے خاتمہ کے مترادف قرار دیتے ہوئے اور وفد کو کمزور بتلاکر اعلیحضرت سے معاہدہ پر دستخط نہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی ایک نئے وفد کی تشکیل پر زور دے کر اس امر کا یقین دلایا کہ جہاں موجودہ وفد ناکام ہوا ہے جدید وفد کامیاب ہو کر رہے گا ۔ اس پر سر سلطان احمد نے سوال کیا :

"یہ سمجھنے کی کیا وجہ ہے کہ جس وفد میں سر والٹر مانکٹن ہوں وہ ناکام جائے اور دوسرا کامیاب ہو جائے"۔

"میرے پاس اس کے وجوہ ہیں"! قاسم رضوی نے جواب دیا۔

" وہ کیا ہیں"؟

" براہ کرم ایسے پریشان کن سوالات مجھ سے نہ کئے جائیں"! قاسم رضوی نے جواب دیا اور نظام کی طرف مخاطب ہو کر کہا ؛

" مجھے یقین کامل ہے کہ ہم کامیاب رہیں گے"۔

" کم از کم ایک وجہ تو بتلائی جائے "۔ سر سلطان احمد نے اصرار کیا

" حکومت ہند شمال میں گرفتار آلام ہے ۔ اگر ہم اصرار کریں تو ہندوستان انکار کے موقف میں نہیں ہے اور ہمارے مطالبات رد نہیں کئے جا سکتے"۔

مانکٹن اور دوسرے ارکان وفد قائل نہ ہو سکے ۔

" کوئی دوسرا وفد ہز اگزالٹیڈ ہائی نس کی مجوزہ شرائط پر معاہدہ نہیں کرا سکتا۔ ہم نے کوئی چیز تشنہ نہیں چھوڑی۔ سردار پٹیل اس معاملہ میں اٹل ہیں"۔

قاسم رضوی نے جدید وفد میں معین نواز جنگ اور عبدالرحیم کی شرکت کا نظام کو مشورہ دیا اور اس طرح یہ تاریخی صحبت ختم ہوئی ۔

ارکانِ وفد نے نظام کے سامنے اپنی برہمی کا اظہار کیا کہ ان کی موجودگی میں قاسم رضوی

کو کیوں طلب کیا گیا۔ نظام نے ارکان وفد کا استعفا منظور کر لیا۔ سر والٹر مانکٹن اور سر سلطان احمد نے نظام کو اپنا یہ آخری مشورہ دیا کہ مجوزہ طریقہ عمل حیدر آباد کی تباہی کا باعث ثابت ہوگا کیمبل جانسن نے اپنی کتاب میں سر سلطان کا یہ جملہ نوٹ کیا جو انھوں نے نظام سے کہا تھا[۱]:

"اس سے آپ اور آپ کی دولت کا خاتمہ ہو جائے گا"

ہندوستان سے گفت وشنید کی طویل مدت میں قاسم رضوی سے یہی سب سے بڑی غلطی سرزد ہوئی جس نے حیدر آباد کی قسمت پر مُہر لگا دی۔ ہندوستان اور حیدر آباد کے درمیان اختلافات کی جو خلیج تھی وہ وسیع سے وسیع تر ہو گئی۔ اور بعد کے کسی وفد کے ارکان میں نہ اتنی صلاحیت تھی اور نہ انھیں کامیابی نصیب ہوئی۔ گفت وشنید کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ گفتگو کرنے والے اگر پہلے ہی سے آپس میں ایک دوسرے سے مانوس ہوں۔ تو وہ ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو مفاہمانہ انداز میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح اختلاف کا دائرہ تنگ ہو کر مفاہمت کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ چنانچہ سر والٹر مانکٹن کے جو حیدر آبادی وفد کے روح رواں تھے مونٹ بیٹن سے شخصی تعلقات تھے اور وہ بالعموم وائسریگل لاج ہی میں بحیثیت مہمان ٹھہرتے تھے۔ مانکٹن کی علیحدگی سے حیدر آبادی وفد کی اہمیت ہی ختم ہو کر رہ گئی۔ اس میں شک نہیں اس کے بعد بھی انھیں گفتگو کے آخری مرحلوں تک اس سے متعلق رکھا گیا لیکن جو بات پہلے تھی وہ پیدا نہ ہو سکی۔ حیدر آبادی زعما کے عزائم بے نقاب ہو چکے تھے۔ شکوک وشبہات کے ماحول میں جب فریقین کو ایک دوسرے کی نیتوں میں خلوص کا فقدان نظر آئے تو ان کے درمیان کوئی گفتگو نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں اس وفد کی تحلیل کے بعد حیدر آباد کی جانب سے جو بھی وفد دہلی گیا وہ قابلیت اور صلاحیت کے جوہر سے عاری تھا۔ ان

Mission with Mountbatten. [۱]

میں کوئی بھی سیاست کا مردِ میدان نہ تھا۔اس میں آخر وقت تک یہ احساس پیدا نہ ہوسکا کہ ہندوستان کے خطرناک عزائم سے حیدرآباد کو کس طرح کم سے کم حد تک محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی طاقت وقوت اور حیدرآباد کی بے مائگی مسلمہ تھی اور گفت و شنید ایک طاقتور اور ضعیف میں ہورہی تھی لیکن حیدرآبادی وفد کو اس کا مطلق احساس نہ تھا۔ وہ یہ تک نہ جانتے تھے کہ سیاست میں قوی اور ضعیف کی باہمی نزاع کے تصفیہ میں ضعیف ہی کو اپنی نیک نیتی کا ثبوت پیش کرنا پڑتا ہے۔

یہ امر ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ اس وقت قاسم رضوی کے اندازہ کے مطابق ہندوستان گرفتارِ آلام ضرور تھا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں تو انضمام کا شکار ہوچکی تھیں لیکن بعض بڑی ریاستیں جیسے بیکانیر، بڑودہ، ٹراونکور، بھوپال ابھی حالتِ تذبذب میں تھیں۔ حیدرآباد کی طرز معاندانہ تھی۔ ادھر کشمیر کے مسئلہ نے نازک صورت اختیار کرلی تھی۔ پاکستان کی فوج اور سرحدی قبائل نے کشمیر پر حملہ کردیا تھا۔ ان سب پر مستزاد ہندوستان کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں حیدرآباد پاکستان میں شرکت نہ کرلے جس کا قانونِ حکومت ہند کے تحت اس کو حق حاصل تھا۔ اس سے بین الاقوامی صورت حال میں بڑا فرق پیدا ہوجاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سردار پٹیل بجائے شرکت کے حیدرآباد سے معاہدہ کے لئے تیار ہوگئے تھے تاکہ ایک سال کے معاہدۂ جاریہ کی مدت میں اپنی پریشانیوں سے نمٹنے کا ہندوستان کو موقع مل جائے۔ اس وقت حیدرآباد کے لیے مستقل معاہدہ کے لئے بہترین موقع تھا اور شرائط بھی اس کو حاطر خواہ مل سکتی تھیں۔ لیکن قاسم رضوی کے ذہن میں یہ سمائی ہوئی تھی کہ معاہدۂ جاریہ کی ایک سالہ مدت میں حیدرآباد کو فوجی حیثیت سے اتنا مضبوط کرلیا جائے گا کہ ہندوستان حیدرآباد کے خلاف اپنی من مانی نہیں چلاسکے گا۔ چنانچہ فوجی قوت میں اضافہ کرنے کی کوششیں شروع ہوگئی تھیں۔ جنرل العیدروس زیکوسلواکیہ حیدرآباد کے لئے اسلحہ خریدنے کے لئے گئے ہوئے تھے، مشہور اسٹریلوی ہواباز سڈنی کاٹن سے حیدرآباد اسلحہ

پہنچانے کا معاملہ طے کیا گیا تھا۔ یہ ساری چیزیں گفت و شنید پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔

دوسرا وفد جو دہلی روانہ کیا گیا وہ معین نواز جنگ، عبدالرحیم اور پنگل وینکٹ راما ریڈی پر مشتمل تھا اور یہی وہ تین ارکان تھے جنھوں نے کونسل میں معاہدہ کی مخالفت کی تھی۔ اس وفد کے مقابلہ میں جو روکا گیا یہ وفد قابلیت، صلاحیت، شہرت کسی لحاظ سے اس کا ہم پلہ نہ تھا اور پھر کونسل میں سابقہ تجاویز سے ان کے اختلاف کرنے کی خبریں دہلی پہنچ چکی تھیں۔ سردار پٹیل تو اس وفد کو الٹے پاؤں واپس کر دینے پر مائل تھے۔

جدید وفد ۳۱ ر اکتوبر کو دہلی پہنچا اور اسی شام معین نواز جنگ نے مونٹ بیٹن سے غیر رسمی ملاقات کی۔ وی پی منن اور کیمبل جانسن نے اس ملاقات کی جو تفصیلات اپنی کتابوں میں بتلائی ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ مونٹ بیٹن کی برہمی کا کیا عالم تھا۔ وفد سے انھوں نے سیدھے منہ بات نہیں کی اور گفتگو جس منزل پر پہنچی تھی اس سے سرمو ہٹنے کے لئے وہ تیار نہ تھے۔ وفد سے رسمی گفتگو ۱ر نومبر کو ہوئی۔ سابقہ معاہدہ میں ترمیم کے لئے معین نواز جنگ کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ وفد ۷ر نومبر کو حیدرآباد واپس آیا۔ چونکہ مونٹ بیٹن ملکہ معظمہ کی شادی میں شرکت کے لئے لندن جارہے تھے اس لئے مزید گفت و شنید کو ان کی لندن سے واپسی تک روکنے کے لئے نظام نے تحریک کی جس کو منظور کیا گیا۔

اس اثناء میں نواب چھتاری کا دورِ صدارتِ عظمیٰ ختم ہو چکا تھا اور نواب سرمہدی یار جنگ عارضی طور پر صدر اعظم مقرر کئے گئے تھے۔ مونٹ بیٹن ۲۴ر نومبر کو لندن سے واپس آئے اور ۲۵ر کو وفد سے ملاقات کی۔ معاہدہ اور ساتھ کے دونوں خطوط میں کسی قسم کی مادی تبدیلی عمل میں نہیں آئی۔ نظام نے معاہدۂ انتظام جاریہ پر اپنی دستخط ثبت کر دی۔

قاسم رضوی نے کنگ کوٹھی میں سر والٹر مانکٹن اور سر سلطان احمد کے سامنے جو بلند بانگ دعوے کئے تھے وہ سارے نقش برآب ثابت ہوئے۔ گفت و شنید کے تار اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لئے قاسم رضوی نے حیدرآباد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اگر پہلے وفد ہی کے

ہاتھوں معاہدہ انجام پاتا تو ممکن تھا کہ حیدرآباد ایسے تباہ کن انقلاب کا شکار نہ بنتا اور بقول مونٹ بیٹن حیدرآباد کی تاریخ ایک خوش آئند قلم سے لکھی جاتی۔ علی یاور جنگ نے اپنی کتاب میں جدید وفد کے کارنامہ کے متعلق یہ تحریر کیا:-

"معترضین نے اُسی معاہدہ پہ دستخط کئے جس پہ انھیں اعتراض تھا۔ اور وہ معاہدہ کے ساتھ گورنر جنرل کا جو خط لائے وہ سابقہ وفد کے لائے ہوئے مسودہ کے مقابلہ میں کئی حیثیتوں سے بدتر تھا (بجز اس کے کہ تجارتی ایجنٹ مقرر کرنے کا اختیار حاصل کیا گیا تھا)۔ اس کارنامہ کو پیش کرتے ہوئے قاسم رضوی نے اپنی ایک تقریر میں اعلان کیا کہ سابقہ وفد نے جو نقصان پہنچایا تھا اس کی اصلاح کی موجودہ وفد نے ممکنہ کوشش کی۔ لیکن کسی شخص نے یہ پوچھنے کی جرأت نہیں کی کہ معین نواز جنگ کے دستخط کئے ہوئے معاہدہ اور اُس معاہدہ میں کیا فرق تھا جس پر پہلے انھیں اعتراض تھا[1]"

کیمبل جانسن نے اپنی کتاب میں حیدرآبادی وفد کے کارنامے کے متعلق تحریر کیا ہے:

"معاہدہ کو آخری شکل دینے کے لئے جب وفد مونٹ بیٹن سے ملا تو اس نے اپنے وجود کو ثابت کرنے اور یہ بتلانے کے لئے کہ سابقہ وفد کے مقابلہ میں اس وفد نے معاہدہ میں تبدیلی کرانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ایسی ایسی معمولی ترمیمات جیسے لفظ "گا" (Will) کی بجائے چاہئیے (Shall) حتیٰ کہ Semi Colon کی بجائے Coma پر اصرار کیا گیا یہی وجہ تھی کہ مونٹ بیٹن نے یہ واضح کر دیا تھا کہ معاہدہ میں وہ ایک شوشہ (Coma) تک بدلنے تیار نہیں ہیں۔ معاہدہ کے ساتھ کے خطوط میں البتہ جزوی ترمیمات

---

[1] Hyderabad in Retrospect

قبول کی گئیں لیکن یہاں بھی ہندوستان نے حیدرآباد کو اپنے سفارتی نمائندے مقرر کرنے کے حق سے انکار کیا"۔ ۵ء

معاہدۂ انتظام جاریہ کی پانچ دفعات تھیں۔ تمہید میں دونوں حکومتوں نے مستقل معاہدہ تک باہمی اشتراک اور خوشدلی سے مشترکہ مفادات میں تعاون کا اعلان کیا تھا۔ دفعہ اول میں ان سارے مشترکہ معاملات میں بشمول امور خارجہ، دفاع اور مواصلات دونوں حکومتوں کے تعلقات اُن ہی بنیادوں پر قائم رہیں گے جو نمائندہ تاج اور نظام کے درمیان ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے قبل موجود تھے۔ معاہدہ میں ہندوستانی حکومت کو اس امر کا پابند نہیں کیا گیا تھا کہ اندرونی شورش کی صورت میں نظام کو فوجی امداد دی جائیگی اور بجز زمانہ جنگ کے حیدرآباد میں ہندوستان کی کوئی فوج نہیں رکھی جائیگی۔ دفعہ ۲ میں حیدرآباد اور دہلی میں ایجنٹ جنرل مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ دفعہ ۳ میں حکومتِ ہندوستان نے پیرامونٹسی کے اختیارات استعمال نہ کرنے کا اقرار کیا تھا۔ دفعہ ۴ میں فریقین کو معاہدہ سے متعلق نزاعات کو ثالثی کے سپرد کرنے کا اختیار حاصل تھا اور دفعہ ۵ میں معاہدہ کی مدت تاریخ تکمیل سے ایک سال مقرر کی گئی تھی۔

معاہدہ کے ساتھ کے پہلے خط میں نظام نے یہ ادعا کیا تھا کہ وہ کسی طرح مستقل طور پر اپنی آزاد حیثیت کو متاثر نہیں کر رہے ہیں البتہ چند معاملات میں مدت معاہدہ تک اپنے اختیارات کے استعمال کے حق کو معطل کر رہے ہیں۔ اس خط میں اور بھی دیگر امور کی بحث اٹھائی گئی تھی جیسے غیر ممالک میں سفارتی اور تجارتی نمائندوں کا تقرر، رزیڈنسی کی واپسی، اسلحہ کی فراہمی، حیدرآباد سے ہندوستانی فوج کی واپسی، چھاؤنیوں کا استرداد، کرنسی، سکہ اور ریلوے کے حقوق کا استقرار وغیرہ۔

اس خط کا ماونٹ بیٹن نے اپنی حکومت کی جانب سے یہ جواب دیا تھا کہ معاہدۂ انتظام جاریہ ایک مستقل معاہدہ کی بنیاد ثابت ہوگا چونکہ حیدرآباد کے مفادات

Mission with Mountbatten. ۵ء

ہندوستان سے ناقابلِ انفکاک ہیں اس لئے معاہدۂ انتظام جاریہ کی مدت
کے ختم کے پہلے ہی حیدرآباد ہندوستان میں شریک ہو جائے گا۔ نظام نے اپنے
خط میں دیگر امور جو بیان کئے تھے ان پر ہندوستان کی جانب سے ہمدردانہ غور
کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

ایک اور خفیہ خط میں نظام نے پاکستان میں شریک نہ ہونے کا اقرار کرتے ہوئے
یہ لکھا تھا کہ اگر ہندوستان دولتِ عامہ سے علیحدہ ہو جائے تو حیدرآباد کو حالات
کا از سرِ نو جائزہ لینے کا اختیار رہو گا اور دوسرے یہ کہ اگر ہندوستان اور پاکستان
میں جنگ چھڑ جائے تو حیدرآباد غیر جانبدار رہے گا۔

یہ تھا معاہدۂ انتظامِ جاریہ جس کی تکمیل کے لئے حیدرآباد میں اتنا طوفان برپا
کیا گیا۔

۱۰

لائق علی کا وزارتِ عظمیٰ پر تقرر اور کونسل کا انتخاب

معاہدۂ انتظام جاریہ پر نظام کی دستخط کے قبل ہی وزارتِ عظمیٰ میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ نواب چھتاری طبعاً شریف مسلمانوں کے ہمدرد اور خانوادۂ آصفی کے بہی خواہ ضرور تھے لیکن حالات جس تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے اُن سے نبٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں صوبہ متحدۂ ہند میں ان کے مفادات زمینداری سے وابستہ تھے جن کو وہ اپنی ملازمت پر قربان نہیں کرسکتے تھے یہ چیزیں روزِ روشن کی طرح واضح ہونے لگی تھیں۔ ایسے میں معاہدۂ عارضی پر نظام کی دستخط کے ایک روز قبل کے جس واقعہ نے انھیں حیدرآباد سے بدل کردیا اس کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

عارضی معاہدہ کے متعلق قائدِ اعظم سے مشورہ کرنے کے لئے علی یاور جنگ اور عبدالرحیم کو ماہ نومبر ۱۹۴۷ء کے پہلے ہفتہ میں کراچی بھیجا گیا تھا۔ قائد اعظم نے معاہدہ کی تائید کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا تھا کہ معاہدہ کی ایک سالہ مدت میں ہندوؤں کا زیادہ سے زیادہ اشتراک حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور اس مدت میں پاکستان بھی حیدرآباد کو فائدہ پہنچانے کے موقف میں آجائے گا۔ چار روز کے بعد جب یہ دونوں کراچی سے دہلی واپس آئے تو نظام کو تفصیلات بتلانے کے لئے علی یاور جنگ سیدھے حیدرآباد روانہ ہوگئے۔ اس زمانہ میں جبکہ وفد حیدرآباد سے باہر تھا علی یاور جنگ کے مخالف گروہ نے ان

کے خلاف اخبارات میں ایک مہم شروع کی تھی اور انھیں ہندو نواز، کانگریس کا بہی خواہ اور مسلم مفاد کا دشمن قرار دیا تھا۔ اسی بنیاد پر قاسم رضوی نے بھی علی یاور جنگ کے خلاف معروضہ پیش کیا تھا۔ اس اخباری پروپیگنڈہ نے نظام کے ذہن کو مسموم کر دیا تھا۔ کراچی کی جو تفصیلات علی یاور جنگ نے پیش کی تھیں ان سے نظام مطمئن نظر نہیں آتے تھے۔ فوراً عبدالرحیم کو دہلی سے حیدرآباد طلب کیا انھوں نے بھی دہلی اور کراچی کے واقعات ایک یادداشت کی صورت میں بارگاہ خسروی میں پیش کئے۔ اس وقت ارکان وفد یعنی چھتاری، مانکٹن، علی یاور جنگ اور عبدالرحیم موجود تھے۔ علی یاور جنگ اور عبدالرحیم سے علی الترتیب روئداد سنی گئی۔ گو دونوں کے بیانات میں بجز طرزِ ادا کے واقعاتی اختلافات نہیں تھے لیکن نظام پہلے ہی سے اخباری خبروں اور قاسم رضوی کے معروضہ سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ انھوں نے برافروختہ ہو کر علی یاور جنگ پر اپنا عدم اعتماد ظاہر کیا اور جب چھتاری نے ان کی جانب سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی تو ان کو بھی مستعفی ہونے کہا گیا۔ دوسرے روز یہ سب ارکان پھر طلب ہوئے لیکن علی یاور جنگ نے شرکت نہیں کی اور بعد میں اپنا استعفا پیش کر دیا۔ نظام کے اس طرز عمل نے چھتاری کے دل میں اندیشے پیدا کر دیئے اور انھوں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ جلد سے جلد حیدرآباد سے علیٰحدگی اختیار کرلیں۔

ادھر قاسم رضوی چاہتے تھے کہ ایسے ہنگامہ خیز زمانہ میں صدارت عظمیٰ کے عہدہ پر ان کا اپنا آدمی ہو جو اتحادالمسلمین کی پالیسی کا ساتھ دے سکے۔ چھتاری کے جانے کے بعد مہدی یار جنگ عارضی طور پر صدر اعظم مقرر ہوئے مگر مستقل صدر اعظم کی تلاش جاری رہی۔ نظام کے پیش نظر کسی ایسے آدمی کا تقرر تھا جو مسلمہ قابلیت اور کُل ہند شہرت کا حامل ہو۔ چنانچہ غلام محمد، ظفراللہ خاں اور زاہد حسین کے نام تجویز ہوئے لیکن یہ تینوں پاکستان کی کابینہ اور وہاں کی حکومت کے لئے ناگزیر تھے۔ موخرالذکر پاکستان کی جانب سے ہندوستان

میں ہائی کمشنر تھے، اندرون ملک ایسی صلاحیتوں کا کوئی شخص نظر نہ آتا تھا۔

قاسم رضوی ابتداء میں جنرل العیدروس کی طرف مائل تھے لیکن جب لوگوں نے یہ بات سمجھائی کہ ہندوستانی زعما کہیں اس کو جنگ کا پیش خیمہ نہ سمجھ لیں تو انھوں نے اپنے اس رشتہ کے فوجی بھائی کو نظر انداز کر دیا اور لائق علی کو اس عہدہ کے لئے منتخب کیا۔ مسلم صنعت کاروں میں لائق علی ایک ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ اسسٹنٹ انجنیر کی حیثیت سے انھوں نے اپنی زندگی شروع کی تھی لیکن علی نواز جنگ کی چیف انجنیری کے زمانہ میں ان کے ایماء پر یہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اسی زمانہ میں بابو خاں نے حیدرآباد کنسٹرکشن کمپنی کی بنیاد رکھی تھی جس میں یہ ملازم ہو گئے اور ترقی کرتے ہوئے اس کی مجلس منتظمہ میں پہنچ گئے۔ بہادر یار جنگ کے انتقال کے بعد پہلی مرتبہ ابو الحسن سید علی کے انتخاب کے وقت یہ مجلس کے معاملات میں دخیل ہوئے۔ ایک با اثر مسلم سیاسی جماعت سے تعلقات قائم رکھنے میں چونکہ بڑے فوائد مضمر ہوتے ہیں اس لئے یہ تعمیراتی کمپنی وقتاً فوقتاً مجلس کے سالانہ جلسوں اور مجلس کے وفود کے بیرون ملک کے دوروں کے لئے رقمی سبیل کی صورتیں پیدا کر دیتی تھی۔ کبھی کبھار مجلس کے کسی پریشان حال عہدہ دار کی مالی مشکلات کو دور کرنے یا ان کو عدالت کی قرقیوں سے نجات دلانے کا بھی یہاں سے سامان ہو جاتا تھا۔ مجلس اتحاد المسلمین کے ایک صدر کو صدارتی انتخاب میں کامیابی کے بعد ایک موٹر خریدنے کے لئے پانچ ہزار کی رقم بھی دی گئی تھی اور جب اس کے جانشین کو اسی طرح رقم کی پیشکش کی گئی تو جدید صدر نے اپنی قلندرانہ انکساری کے ساتھ اسے قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ البتہ مجلس کے ایک عہدہ دار کو مستقلاً تین سو کی ماہوار امداد تنخواہ کے طور پر دی جاتی تھی لیکن یہ ساری چیزیں پس پردہ ہوتی تھیں۔

لائق علی نے کاغذ سازی اور شکر سازی کے کارخانوں کو کامیابی سے چلا کر ایک صنعت کار کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کر لی تھی کسی صنعت کی کامیابی یا محدود

کمپنی کے حصص کی فروخت کے لئے محض ان کا نام کافی سمجھا جاتا تھا۔ ان کی یہ ترقی کچھ تو ان کی اپنی صلاحیتوں، حکومت کی سرپرستی کی وجہ سے تھی اور کچھ اس وجہ سے کہ حکومت کے چند اعلیٰ عہدوں پر ان کے عزیز فائز تھے۔ ان میں معین نواز جنگ اور عارف الدین چیف انجنیر نے جو ان کے بہنوئی تھے ان کے آگے بڑھانے میں بہت کام کیا۔ ملک کا ہردلعزیز اور کثیر الاشاعت روزنامہ "رہبر دکن" کے مالک اور مدیر عارف الدین کے بھائی تھے۔ اس اخبار نے صنعت و حرفت میں مسلم مفادات کے تحفظ اور اس کے آگے بڑھانے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ یہ ساری چیزیں لائق علی کی ترقی میں معاون ثابت ہوئیں۔ حیدرآباد کے مسلم صنعت کاروں نے لائق علی کی سرکردگی میں تحریک پاکستان کے مالی استحکام میں بھی بڑا حصہ لیا تھا۔ مسلم لیگ کے منصوبہ بندی کمیشن کے یہ رکن بھی نامزد ہوگئے تھے اور قیام پاکستان کے بعد قائد اعظم نے انھیں پاکستانی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے اقوام متحدہ بھی بھیجا تھا۔ لیکن ان ساری چیزوں کے باوجود عملی سیاست سے لائق علی کو دور کا بھی واسطہ نہیں پڑا تھا اور نہ حیدرآباد کے مسائل کو سلجھانے میں انھوں نے کبھی کوئی رہبرانہ اقدام کیا تھا۔

حیدرآباد میں جب عوامی وزارت کے لئے فضا سازگار ہوئی اور وزارتِ عظمیٰ پر ایک عوامی وزیر کے تقرر کے امکانات روشن ہوتے لگے تو لائق علی، ان کے رشتہ دار اور ساتھیوں نے قاسم رضوی کو ہموار کرنے کی مہم شروع کی۔ قاسم رضوی پہلے ہی سے ایک ایسے شخص کی تلاش میں تھے جو اپنے انتخاب میں ان کا مرہونِ منت ہو۔ لائق علی کے نام پر قاسم رضوی کی آمادگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے ذریعہ قائدِ اعظم کو حیدرآباد کے مسئلہ سے قریب ترکیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اپنی مجلس عاملہ سے کسی قسم کی منظوری حاصل کرنے کے بغیر قاسم رضوی نے بارگاہِ خسروی میں لائق علی کے تقرر کے متعلق دو معروضے روانہ کئے اور اس کے بعد حکومت میں اپنی جماعت کے تنہا وزیر عبدالرحیم کو جن کا اپنی صلاحیت

اور کردار کی وجہ سے دربار میں کافی رسوخ ہو چکا تھا لائق علی کے تقرر کے لئے نظام کو ہموار کرنے پر آمادہ کیا۔ ان حالات کے تحت رحیم نے دربار میں سلسلہ جنبانی شروع کی۔ رحیم کا بیان ہے کہ نظام لائق علی کے نام سے واقف تک نہ تھے لیکن دو تین ملاقاتوں میں رحیم نے نظام کو کس طرح ہموار کیا وہ بڑی دلچسپ تفصیل ہے۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ تین ملاقاتوں میں نظام سے وزارت عظمیٰ پر رحیم کی گفتگو ہوئی انتخاب کا یہ معیار قرار پایا کہ نیا صدر اعظم ایسا ہونا چاہیئے۔ جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے یکساں قابل قبول ہو، حکومت ہند بھی ناراض نہ ہو اور پاکستان کو اعتراض نہ ہو۔ نظام نے ان اصولوں کو تسلیم کرتے ہوئے نام طلب کئے اور اپنی جانب سے شامراج اور پنگل وینکٹ راما ریڈی کے نام تجویز کئے جن کی رحیم نے مخالفت کی۔ دوسری ملاقات میں رحیم نے لائق علی کا نام پیش کیا، ان کے صنعتی کارنامے بیان کئے، ہندوؤں اور مسلمانوں میں ان کی ہر دلعزیزی، بیرونی ممالک کی سیاحت، مذہبی رجحانات اور پسندیدہ خصائل کا تذکرہ کیا۔ نظام نے نے بھی اپنے طور پر ان کے متعلق معلومات حاصل کیں۔

ایک روز قاسم رضوی نے ٹیلیفون پر رحیم کو یامین زبیری کے مکان پر طلب کیا جہاں قاسم رضوی کے علاوہ لائق علی اور مجلس اتحاد المسلمین کے کچھ عہدہ دار بھی موجود تھے۔ لائق علی کے تقرر کے متعلق دریافت کرنے پر رحیم نے دربار میں اپنی گفتگو کی ساری تفصیل بیان کرتے ہوئے تقرر کے امکانات کو روشن بتلائے اس پر قاسم رضوی نے رحیم کے سامنے لائق علی کے تین شرائط پیش کئے:۔
(۱) بیس کروڑ کے امانتی کفالتوں کا پاکستان کو دیا جانا (۲) تقرر کے متعلق قائد اعظم سے اجازت حاصل کرنا اور (۳) تنخواہ کا وہی ہونا جو سر مرزا یا چھتاری کو ہوتی تھی۔ پہلی شرط کے متعلق رحیم نے جواب دیا کہ علی یاور جنگ کے ساتھ گذشتہ مرتبہ جب

وہ کراچی گئے تھے تو غلام محمد نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ حیدرآباد اپنے (۷۳) کروڑ کی امانتی کفالتوں میں سے ایک ثلث پاکستان میں اور دو ثلث ہندوستان میں لگائے چنانچہ اس کی منظوری کے لئے کونسل سے بارگاہِ خسروی میں معروضہ پیش کئے ہوئے دو ماہ سے زیادہ عرصہ ہوگیا۔ تاہم اس سلسلہ میں وہ مزید کوشش کریں گے دیگر دو شرائط کو فروعی نوعیت کا بتلا کر رحیم نے مناسب وقت پر انھیں منظور کرانے کا وعدہ کیا۔

رحیم کا بیان ہے کہ وہ مسلسل سوچتے رہے کہ کس طرح لائق علی کے تقرر کے مسئلہ کی یکسوئی ہوگی۔ بالآخر ایک تدبیر سمجھائی دی اور انھوں نے محسوس کیا کہ اب یہ مسئلہ طے ہوسکے گا۔ چنانچہ صبح سویرے ہی وہ کنگ کوٹھی پہنچ گئے۔ فوراً باریابی ہوئی اور اتنے سویرے آنے کی وجہ دریافت کی گئی۔ رحیم نے جواب دیا کہ چھتاری کو جاکر تقریباً تین ہفتے ہو چکے ہیں، جدید صدر اعظم کا ابھی تک تقرر نہیں ہوا اور اس اثنا میں حکومت ہند کے عزائم خطرناک ہوتے جارہے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ خود بھی وزارت پر رہنا نہیں چاہتے اور بارگاہ خسروی میں استعفا پیش کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ نظام نے خود لائق علی کا ذکر چھیڑا اور اسی صبح ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ رحیم نے ٹیلیفون پر قاسم رضوی کو لائق علی کے گھر فوراً پہنچنے کے لئے کہا۔ روداد سننے کے بعد قاسم رضوی کو اصرار رہا کہ پہلے شرائط کا طے ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ لائق علی نے قائد اعظم سے پاکستان میں چند اہم صنعتوں کے قیام سے متعلق بعض امور طے کرنے کے لئے امریکہ جانے کا وعدہ کرلیا ہے۔ رحیم نے اطمینان دلایا کہ وقت پر ساری چیزیں طے ہو جائیں گی

نظام نے لائق علی سے ملنے کے لئے صبح ½ ۹ بجے کا وقت مقرر کیا تھا لیکن رحیم نے انھیں ۱۰ بجے کنگ کوٹھی پہنچنے کی ہدایت کی اور خود صحیح وقت پر دیوڑھی پہنچ گئے۔ نصف گھنٹہ کی اس تاخیر کی وجہ لائق علی کے سمجھ میں نہ آئی۔ بہرکیف

جس وقت رحیم باریاب ہوئے کاظم یار جنگ صدر المہام پیشی بھی وہاں موجود تھے نظام نے لائق علی کو ساتھ نہ لانے کی وجہ دریافت کی تو رحیم نے کہا انہیں ۱۰ بجے کا وقت دیا گیا ہے اور وہ اب آتے ہی ہوں گے۔ دوران گفتگو میں رحیم نے مکرر لائق علی کی تعریف کے پل باندھے اور ان کی عبادت و ریاضت اور خیر و خیرات کے قصے بیان کئے۔ نظام کو یہ باتیں سُن کر بڑا تعجب ہوا کیونکہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ شاید دولت اور یورپ و امریکہ کی سیاحت نے ان کی عادتوں کو بگاڑ دیا ہوگا۔ دس بج رہے تھے اور لائق علی کی باریابی کا وقت قریب تھا رحیم نے اپنے امیدوار کی قیمت بڑھانے کے لئے اپنا آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا کہ لائق علی وزارتِ عظمٰی قبول کرنے پر مائل نظر نہیں آتے کیونکہ پاکستان کے ایک کام پر وہ امریکہ جانا چاہتے ہیں البتہ اگر بیس کروڑ کے تمسکات پاکستان کو دے دئے جائیں تو ممکن ہے وہ اپنا ارادہ بدلیں۔ نظام نے اسی وقت کاظم یار جنگ کو مثل پیش کرنے کا حکم دیا جس کے آتے ہی منظوری بھی صادر فرما دی۔

لائق علی ۱۰ بجے کنگ کوٹھی مبارک پہنچے۔ نظام نے ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا :-

" تمہارے غیاب میں تمہارے دوست نے تمہاری پرہیزگاری اور تقویٰ کی بڑی تعریف کی ہے۔ میں بہت خوش ہوا "

" میں عاصی او گنہگار ہوں۔ میں گنہگار رہوں " لائق علی نے لجاجت سے جواب دیا۔

" رحیم نے کہا ہے کہ تم نے پاکستان کو ۲۰ کروڑ تمسکات کا وعدہ کیا ہے۔ میں نے اس کی منظوری ابھی صادر کر دی ہے "

لائق علی نے مؤدبانہ اظہار تشکر کیا۔

" میں نے ایک سال کے لئے صدارت عظمٰی پر تمہیں مامور کرنے کا فیصلہ کیا ہے " سرکار نے کہا۔

"میں شاید چھ ماہ سے زائد نہ رہ سکوں" لائق علی نے جواب دیا۔

"چھ ماہ بہت کم ہیں۔ تمہیں کم از کم ایک سال رہنا ہوگا۔ اگر تم چھ ماہ کے بعد چلے جاؤ گے تو پھر تمہارا جانشین کون ہوگا"؟ سرکار نے استفسار کیا

"میرے بعد معین نواز جنگ میرے جانشین ہو سکتے ہیں" لائق علی نے انتہائی سادگی سے جواب دیا۔

سرکار خاموش ہو گئے۔ رحیم کو بھی اس جواب پر تعجب ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہی سے لائق علی کے فیملی گروپ میں یہ منصوبہ تیار ہو گیا تھا کہ اب صدارت عظمیٰ خاندان سے باہر نہ جانے پائے۔ سرکار نے رحیم کو شام کے ۴ بجے تنخواہ کی تفصیلات طے کرنے کے لئے طلب کیا۔

رحیم کا بیان ہے کہ شام میں باریابی کے وقت بجز اُن کے نظام کے پاس کوئی موجود نہ تھا۔ رحیم نے چھ ہزار سکہ عثمانیہ تنخواہ بہ استثنار انکم ٹیکس کی تجویز پیش کی جس کو نظام نے بلا پس و پیش منظور کر لیا۔

تقرر کے سلسلہ میں قائد اعظم کی اجازت کی شرط پیش نہیں ہوئی اور نہ لائق علی نے اس کے متعلق استفسار کیا۔ بظاہر قائد اعظم سے منظوری تو نام پیش ہونے کے ساتھ ہی یا اس کے قبل حاصل کر لی گئی تھی۔

بہرکیف صدارتِ عظمیٰ پر لائق علی کے تقرر کی یہ وہ تفصیل ہے جس کے راوی رحیم ہیں۔ ان تفصیلات کے مطالعہ سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ لائق علی در اصل اتحاد المسلمین کے امیدوار اور قاسم رضوی کے فرستادہ تھے اور اس تقرر کے سلسلہ میں رحیم نے جو کردار ادا کیا وہ سارا اپنے قائد کے حکم کی تعمیل میں تھا۔

حیدرآباد کی صدارت عظمیٰ پر کسی زمانہ میں سالار جنگ اول، سر علی امام اور سر اکبر حیدری جیسے مدبرین اور غیر معمولی صلاحیت اور قابلیت والی ہستیاں فائز رہی

تھیں اس پر پہلی مرتبہ ایک ایسے عوامی صدر اعظم کا تقرر منظور ہوا تھا جس کو نہ سیاست کا تجربہ تھا، نہ پبلک لائف سے واسطہ بلکہ محض ایک صنعت کار تھا اور یہ تقرر ایسے زمانہ میں ہوا تھا جبکہ ملک موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا، حیدرآباد کی کشتیٔ حیات بلاخیز طوفانوں کے تھپیڑے کھا رہی تھی؛ ہر سمت گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور کہیں سے شعاع امید نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے باوجود جدید صدر اعظم سے یہ توقع کی جا رہی تھی کہ اپنے کاروباری تجربات ہی کو دلیل راہ بنا کر وہ مہمات سلطنت کو سر کریگا۔ اگر لایق علی کو بلا کسی پابندی کے خود مختاری کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ حالات کو سازگار بنانے کی کوشش کرتے لیکن وہ قاسم رضوی کے نامزد کردہ تھے؛ اتحاد المسلمین نے حیدرآباد کے مستقبل کے جو منصوبے تیار کئے تھے اُن سے تجاوز نہیں کر سکتے تھے۔

لائق علی کے وزارتِ عظمیٰ پر تقرر کے ساتھ ہی چھتاری والی کونسل تحلیل ہو چکی تھی اور جدید صدر اعظم کو اپنی جدید کونسل کی تشکیل کیلئے حضور نظام کے سامنے تجاویز پیش کرنا تھا۔ اس وقت اگر جماعتی وابستگی کے اصول کو نظر انداز کر کے ملک کے بہترین دماغوں میں سے کونسل کے ارکان کا انتخاب کیا جاتا تو حیدرآباد کے مستقبل کو محفوظ کیا جا سکتا تھا لیکن قاسم رضوی کسی طرح حکومت پر قبضہ حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ سیاست کی باگ ڈور پوری طرح ان کے ہاتھ میں آجائے اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب کونسل میں اتحاد المسلمین کے ارکان زیادہ سے زیادہ داخل ہو سکیں۔ عوامی صدر اعظم کی کونسل کو عوامی ارکان پر مشتمل ہونا چاہیئے تھا لیکن حیدرآباد میں اس اصول کو نظر انداز کر کے چار عہدہ دارانِ سرکاری کو بھی کونسل میں لینے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ ان کی انتظامی صلاحیتوں سے استفادہ کیا جا سکے۔ بارہ ارکان کی مجوزہ کونسل میں چار عہدہ داران سرکاری کے علاوہ اتحاد المسلمین اور ہندو جماعتوں میں سے چار چار ارکان لینے کا تصفیہ ہوا۔

حیدرآباد میں وزراء کے تقرر کو بالکلیہ ایک شاہی اقتدار سمجھا جاتا تھا۔ جس پر رزیڈنٹ کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے حکومتِ ہند کا تسلّط تھا۔ اس شاہی اقتدار کی بحالی کے لئے بہادر یار جنگ نے اتحاد المسلمین کے پلیٹ فارم سے اپنی خطابت کا سارا زور صرف کر دیا تھا اور انھیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ لیکن حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ تقسیم ہند کے ساتھ ہی ہندوستان سے انگریز اپنا بوریا بستر باندھ کر رخصت ہو چکے تھے، ریاستوں میں برطانوی اقتدار اعلیٰ ختم ہو چکا تھا اور حیدرآباد نے آزادی کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ نظام کے سارے شاہانہ اقتدارات از خود بحال ہو گئے تھے لیکن اس کو قدرت کی ستم ظریفی کہنا چاہیئے کہ آزاد حیدرآباد کے فرمانروا کو کونسل کی تشکیل میں اتنا بھی اختیار باقی نہ رہا۔ جو برطانوی پیرامونٹسی کے زمانہ میں حاصل تھا۔ اُس وقت وہ کم از کم وزراء کے تقرر کے معاملہ میں رزیڈنٹ کے پیش کردہ ناموں سے اختلاف کر سکتے تھے یا کسی وزیر کی علیحدگی پر اصرار کر سکتے تھے لیکن اب ان کے ہاتھ سے یہ اختیار بھی چھن گیا تھا۔ رزیڈنسی اقتدار اعلیٰ (پیرامونٹسی) کی کمین گاہ سمجھی جاتی تھی لیکن اب وہ "دارالسّلام"[۱] میں منتقل ہو گئی تھی۔ پیرامونٹسی اور تاج برطانیہ کے سارے اختیارات قاسم رضوی پر منتقل ہو چکے تھے۔

جدید کونسل کے لئے جن چار سرکاری عہدہ داروں کو لیا گیا ان میں صرف معین نواز جنگ ہی ایک ایسے تھے جنہیں کونسل کا تجربہ تھا۔ لائق علی سے رشتہ داری کی بناء پر ان کا کابینہ میں لیا جانا ضروری تھا اور اپنے صدارتِ عظمیٰ کے دور کے خاتمہ پر لائق علی انھیں اپنا جانشین بھی بنانا چاہتے تھے جس کا اظہار انھوں نے اپنے تقرر کے وقت نظام کے سامنے بھی کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ معین نواز جنگ اتحاد المسلمین اور اس کے صدر سے بہت قریب ہو گئے تھے۔ عبدالحمید خاں تین چار سال کے دوران میں سشن جج سے چیف جسٹس کے عہدہ پر پہنچ گئے تھے۔ قاسم رضوی انھیں وزیر بنا کر ان کا ایک احسان

---

[۱] اتحاد المسلمین کا مستقر۔

اتارنا چاہتے تھے۔ حادثۂ لاتور کے سرکاری کمیشن کے رکن کی حیثیت سے عبدالحمید خاں نے
کمیشن کے دیگر دو ارکان (مسٹر لبی اور آر سو ایتگار) کے متفقہ فیصلہ سے اختلاف کرتے
ہوئے حکومت کو لاتور کے حادثہ کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ حکومت کو اس رپورٹ کے شائع کرنے
کی ہمت نہ ہوئی لیکن قاسم رضوی کے دل میں عبدالحمید خاں کے لئے جو جگہ پیدا ہو گئی تھی اس کا
اقتضا یہ تھا کہ انھیں باب حکومت میں لیا جائے۔ وہ ایک اچھے مسلمان تھے لیکن زمانہ کے
نشیب و فراز اور سیاست کے داؤ پیچ سے قطعاً ناواقف تھے۔ یہی حال فضل نواز جنگ
کا تھا جن کی پوری سرکاری ملازمت تحریک امداد باہمی کی توسیع و اشاعت میں صرف ہوئی تھی
عملی زندگی کا انھیں کوئی تجربہ نہ تھا۔ راجہ رام موہن لعل بھی عدالتی عہدہ دار اور جج ہائیکورٹ
تھے لیکن طبیعت میں جلد بازی تھی اور دنیا کے حالات سے بے خبر تھے۔ چونکہ کائستھ اور
مرنجان مرنج قسم کے آدمی تھے اس لئے انھیں منتخب کیا گیا۔

چار غیر مسلم ارکان میں پنگل وینکٹ راما ریڈی نائب صدر اعظم کسی ہندو سیاسی جماعت
سے متعلق نہ تھے۔ حیدرآباد کے بڑے دیسمکھ اور زمیندار تھے۔ ایک عرصہ تک اعزازی طور پر
مشن جج کی خدمات انجام دیتے رہے، سرمایہ دار تھے اور اکثر مشترکہ سرمایہ والی کمپنیوں کے
ڈائرکٹر بھی تھے۔ حیدرآباد کے ہندو مسلم اتحاد کا صحیح نمونہ تھے لیکن عملی سیاست کا انھیں کوئی
تجربہ نہ تھا اور زیادہ پڑھے لکھے بھی نہ تھے۔ البتہ راماچاری جو ایک سابق کانگریسی کی حیثیت سے
کابینہ میں لئے گئے تھے گرگ باراں دیدہ تھے۔ انھیں حیدرآباد کے ہندو مسلم مسائل پر اچھی دسترس
حاصل تھی۔ ہندوؤں میں بھی ان کی بڑی عزت تھی۔ یہ تو ایک شاہد کی حیثیت سے درون خانہ
تماشہ دیکھنے آئے تھے اور استعفا دے کر چلے بھی گئے ان سے مسائل کے سلجھانے کی توقع
رکھنا ہی غلط تھا۔ البتہ ان کو درمیان میں رکھکر ہندو مسلم خلیج کو پاٹا جا سکتا تھا جس کی
طرف توجہ نہیں کی گئی۔ پست اقوام کے قائد وینکٹ راؤ صرف جہل مرکب تھے۔ نہ
تعلیم تھی، نہ صلاحیت۔ ان کے علاوہ بعد میں کچھ اور ہندو ارکانِ مقننہ میں سے وزارت

پر لئے گئے وہ سب کے سب موقع پرست تھے اور ان کا کوئی معیار ہی نہ تھا۔

اتحاد المسلمین سے جو ٹیم لی گئی تھی اس کی تفصیل کتاب کے حصہ دوم میں ایک مستقل باب کے تحت دی گئی ہے۔ ان میں بجز عبدالرحیم کے جنہیں سابقہ دو وزارتوں کا تجربہ تھا اور جنہوں نے جدید کابینہ میں شرکت سے انکار بھی کیا تھا بقیہ تین ارکان میں کوئی بھی اس ہنگامی دور کے لئے موزوں نہ تھا۔ صدر اعظم نے ایک رکن کے انتخاب پر اعتراض کیا تھا کیونکہ یہ اُن کے صنعتی اداروں سے ماہ بماہ مستقل تنخواہ بطور امداد پاتے تھے اور ملک میں ان کی شہرت بھی اچھی نہیں تھی۔ لیکن قاسم رضوی نے یہ کہکر صدر اعظم کو خاموش کر دیا کہ ان کی ورکنگ کمیٹی نے یہ انتخاب کیا ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

دنیا کے متمدن ممالک میں جب کوئی سیاسی جماعت مقننہ کے انتخابات میں اکثریت حاصل کرتی ہے تو اس کے پارٹی لیڈر کو صدر مملکت کی جانب سے حکومت کی تشکیل کی دعوت دی جاتی ہے جس کی بنا پر ارکان مقننہ میں سے کابینہ کے لئے وہ اپنے رفقاء کو نامزد کرتا ہے اور یہ کابینہ اس وقت تک برسر اقتدار رہتی ہے جبتک اس کو مقننہ کا اعتماد حاصل ہے۔ وزیر اعظم اور اس کی کابینہ، مقننہ کے باہر، اپنی سیاسی جماعت کے ڈسپلن کی پابندی ہوتی ہے اور جماعتی فیصلوں کو حکومت کے اندر بروئے کار لانے کی ان پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور ان کی عدم تکمیل یا انحراف کی صورت میں جماعت کے اندر اُن سے بازپرس کی جاتی ہے۔ لیکن اس سیاسی جماعت یا اس کے صدر کو حکومت کے روزمرہ کے معاملات میں دخل دینے اور اس کے فیصلوں کو متاثر کرنے کا حق نہیں ہوتا یہ مسلمہ جمہوری اصول ہیں۔ لیکن حیدرآباد میں ان پر الٹا عمل کیا جاتا رہا۔ سب سے پہلے صدر اعظم کا اپنی کابینہ کے رفقا کو نامزد کرنے کا حق سیاسی جماعت نے سلب کر لیا۔ دوسرے حکومت کی پالسی کے معاملات میں سیاسی جماعت کے صدر کی دخل اندازیاں اتنی زیادہ بڑھ گئیں کہ کسی مسئلہ پر کونسل ابھی غور بھی کرنے نہیں پاتی کہ اس کے قبل کسی پلیٹ فارم سے

اس مسئلہ کے متعلق جماعت کے صدر کوئی تقریر فرما دیتے یا اخبارات میں ان کا کوئی بیان شائع ہو جاتا۔ ہندوستان سے گفت و شنید کے ہر مرحلہ پر قاسم رضوی نے یہی عمل کیا جس کے باعث کونسل آزادی سے کسی مسئلہ پر غور کرنے کے قابل نہ رہی اور بجز لیڈر کی لے میں لے ملانے کے وہ کوئی کام نہ کر سکی۔ اس سے ملک میں اور بیرون ملک یہ عام تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ حیدرآباد میں مہمات مملکت کونسل کے ذریعہ نہیں بلکہ قاسم رضوی کی رائے سے تصفیہ پاتے ہیں۔ اتحاد المسلمین اور اُس کے صدر کا حکومت سے اس طرح مربوط ہو جانا آئندہ چل کر مسلمانوں کے لئے انتہائی مہلک ثابت ہوا۔ کم از کم لائق علی کو حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے یہ محسوس کرنا چاہیئے تھا کہ ساری ذمہ داری ان کی اپنی ہے اور کونسل ملک کی سب سے مقتدر جماعت ہے جس کی رائے کو ملک کے اندر فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے۔ اگر سیاسی جماعت یا اس کا صدر اس رائے کو قبول کرنے تیار نہ ہو تو سربراہ حکومت کے لئے ایک ہی باعزت راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ حکومت سے استعفا دیدے جس کو پوری کونسل کے استعفا کے مرادف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن آپس میں اغراض ایسے وابستہ تھے کہ لائق علی کو استعفا دینے کی ہمّت نہ ہوئی اور حکومت کا وقار ختم ہو کر رہ گیا۔

حیدرآباد کی جدید بابِ حکومت ان اجزائے ترکیبی پر مشتمل تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا ملک میں یہی عالی دماغ تھے جن کے شانوں پر ایسے نازک زمانہ میں جب حیدرآباد موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا حکومت کی ذمہ داریوں کا بار عاید کیا گیا تھا۔ ملک میں بیسیوں ایسے لوگ موجود تھے جو مسلمہ قابلیت اور صلاحیتوں کے حامل تھے۔ انھیں کابینہ میں اگر نہیں لیا جا سکتا تھا تو کم از کم ان سے مسائل کے حل کرنے میں مشورہ طلب کیا جاتا لیکن کس کو اس کی ضرورت پڑی تھی۔ ہر نو مامور وزیر اپنے آپ کو قابلیت اور صلاحیت کا پیکر سمجھتا تھا اور قائد قوم قاسم رضوی کے اشاروں پر چلتا تھا۔

۱۱

اتحاد المسلمین کا عروج

دکن میں مسلمانوں کے اقتدار کے زمانہ میں کسی مسلم عوامی جماعت یا اس کے صدر کو کبھی وہ عروج نصیب نہ ہو سکا جو سقوط حیدر آباد کے سال ڈیڑھ سال قبل مجلس اتحاد المسلمین اور اس کے آخری صدر قاسم رضوی کو حاصل ہوا۔ بہادر یار جنگ ہی مجلس کے وہ تنہا صدر تھے جنھوں نے اپنے خلوص، بے لوث کردار، بے مثل خطابت، انتہائی ایثار اور غیر معمولی تنظیمی صلاحیتوں سے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر کے ان میں زندگی کی تڑپ پیدا کر دی تھی۔ مسلمانوں کے دلوں پر ان کی حکومت قائم تھی لیکن اس کے باوجود حکومت کے معاملات میں یہ دخیل نہ تھے، اس کے فیصلے ان کے اشارہ یا ایما کے رہینِ منت نہ تھے اور کسی وزیر کے تقرر یا تعطل میں ان کے مشورے قبول نہیں کئے جاتے تھے۔ سر اکبر حیدری کے زمانہ صدارت عظمیٰ میں انھیں پبلک لائف سے ہٹانے کے لئے وزارت کی پیش کش کی گئی تھی لیکن ان کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہیں ہوئی اور انھوں نے پبلک طور پر اس امر کا اعلان کر دیا :-

> "میں اپنے آپ کو وزارت کا اہل نہیں پاتا انکساراً نہیں بلکہ حقیقت میں تصور کرتا ہوں کہ مجھے کرسیٔ وزارت پر بیٹھ کر مہمات مملکت پر غور کرنے کے لئے نہیں بلکہ گرد کوچہ و بازار بن کر قلوب کی دنیا میں طوفان برپا کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں شاہین زادہ ہوں اور میرا مقام صرف دامن کوہ اور وسعت صحرا ہے۔

میں وہ مزدور ہوں جو راستہ تیار کرتا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی گاڑی آسانی
سے منزل تک پہونچ جائے۔ اس لئے اپنے قلب میں اس گمان کو بھی نہ جگہ
دیجئے کہ میں حکومت کا کوئی مقام چاہتا ہوں یا آئندہ قبول کروں گا چاہے
وہ وزارت ہو یا وزارتِ عظمیٰ۔"

بہادر یار جنگ کو اس امر کا احساس تھا کہ کوئی عوامی جماعت اپنے منصوبوں میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔ اسی لئے وزراء کے تقرر میں رزیڈنٹ کی ریشہ دوانیوں کے خلاف انھوں نے ہمیشہ احتجاج کیا۔ اس اختیار کو وہ بالکلیہ ذاتِ شاہانہ میں مرکوز دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"کوئی سیاسی جماعت حکومت کو صحیح راستہ پر نہیں چلا سکتی جب تک وہ
حکومت میں دخل نہ پائے لیکن حیدرآباد میں یہ سوال اس لئے پیدا ہی نہیں
ہو سکتا کہ ہم وزراء کے تقرر و تعطل و علیحدگی کا کامل اختیار اپنے بادشاہ
عالی قدر کے دستِ مبارک میں دیکھنا چاہتے ہیں اور کسی کو اس کا مجاز نہیں
سمجھتے کہ وزراء کے انتخاب میں ان کو مشورہ دے۔"

بہادر یار جنگ نے مسلمانوں کے لئے جو منزل متعین کر دی تھی وہ ان کے بعد کے عہد و ر کے لئے دلیلِ راہ اور منہاج بن گئی تھی۔ ان کے نقشِ قدم پر چل کر مجلس اتحاد المسلمین ارتقائی منازل طے کرنے لگی اور ہندوستان کے سیاسی حالات نے اس کو اچانک اس نقطۂ عروج پر پہنچا دیا جس کے بعد ترقی کی راہیں تو مسدود ہو جاتی ہیں لیکن تنزل کی رفتار تیز تر ہو جاتی ہے۔ شمع جس طرح بجھنے سے پہلے سنبھالا لیتی ہے اور بھڑک اٹھتی ہے یہی حال اتحاد المسلمین کے اقتدار کا ہو گیا تھا۔

جب نواب چھتاری کے دَور کے آخر زمانہ میں اصلاحاتِ دستوری کے بموجب

مقننہ کے انتخابات عمل میں آئے تو (۴۲) مسلم نشستوں پر اتحاد المسلمین کے صد فی صد امیدوار کامیاب ہو گئے۔ قاسم رضوی مقننہ کے رکن تو منتخب ہو چکے تھے لیکن مجلس کی صدارت پر ابھی ان کا انتخاب عمل میں نہیں آیا تھا۔ صدارت پر فائز ہونے کے بعد صدر کے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے اُنھیں ارکان مقننہ کا قائد بھی منتخب کر لیا گیا۔ یہ سر مرزا اسمٰعیل کے صدارت عظمیٰ کا زمانہ تھا اور کونسل نے مقننہ کے ارکان میں سے ایک ہندو اور ایک مسلمان رکن کو وزارت پر لینے کا تصفیہ کیا تھا۔ چنانچہ ہندوؤں میں سے پنگل وینکٹ راما ریڈی اور مسلمانوں میں سے عبدالرحیم کو لیا گیا۔ دونوں عوامی وزراء نے کونسل میں بڑی اچھی ابتداء کی۔ ان دونوں کے تقرر کے قبل بلکہ قاسم رضوی کے صدر منتخب ہونے کے پہلے نظام نے ۱۱ر جون ۱۹۴۷ء کو حیدرآباد کی آزادی کا اعلان کر دیا تھا اور بعض مشترک امور میں ہندوستان سے تعاون کے لئے گفت و شنید کا آغاز بھی ہو چکا تھا جس سے عوامی وزراء بھی متعلق کر لئے گئے تھے۔

سر مرزا اسمٰعیل کے آخری زمانہ میں معتمد امور دستوری سید تقی الدین (مرحوم) کو بعض انتظامی الزامات کے تحت ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ حکومت کے اندر یہ بڑے اشد قسم کے ہندو دشمن مشہور تھے۔ ان کے ملازمت سے علٰحدہ ہوتے ہی قاسم رضوی نے انھیں اپنی عاملہ یا ورکنگ کمیٹی میں نامزد کر لیا اور ایک ذیلی انتخاب میں انھیں مقننہ کی نشست بھی دلادی۔ یہ بہار پرونشل سیول سروس کے آدمی تھے۔ بہار میں کانگریسی حکومت کے قیام کے بعد وہاں کی ملازمت سے علٰحدہ کئے گئے اور اپنے ایک عزیز کی کوششوں سے جنھیں سر اکبر حیدری کا تقرب حاصل تھا ان کا اولاً حیدرآباد میں ڈپٹی سکریٹری کی حیثیت سے تقرر کیا گیا۔ یہ قاسم رضوی کے عقل کل بن گئے۔ ہر معاملہ میں ان کی چلنے لگی۔ ان کے اتحاد المسلمین میں آجانے سے سر مرزا کے خلاف اتحاد المسلمین کی مخالفت میں شدت پیدا ہو گئی اور سر مرزا کو حیدرآباد چھوڑتے ہی بنی۔

سید تقی الدین (مرحوم) حکومت کے رازہائے دروں سے واقف تھے چونکہ یہ علی یاور جنگ وزیر امور دستوری کے کشتہ تھے اس لئے انھوں نے اپنی ساری توجہ علی یاور جنگ کی وزارت کی جڑ کاٹنے پر مرکوز کی۔ قاسم رضوی نے جو رحیم کی وجہ سے علی یاور جنگ کے قریب ہو گئے تھے اب تقی الدین کے اثر میں علی یاور جنگ کی مخالفت شروع کی تا اینکہ انھوں نے وزارت ہی سے استعفا دیدیا۔ اس سے حکومت پر اتحاد المسلمین کی گرفت مضبوط کرنے کا قاسم رضوی کو موقع مل گیا جس کا ایک منصوبہ تیار ہوا تھا۔

حیدر آباد کے اعلانِ آزادی کے ساتھ ہی ملک کے سارے ہندو عناصر حکومت کی مخالفت پر اُتر آئے۔ ویسے کانگریس اور دیگر مسلمہ ہندو سیاسی جماعتوں نے مقننہ کا بائیکاٹ پہلے ہی سے کر رکھا تھا۔ مقننہ میں جتنے بھی ہندو ارکان منتخب ہوئے تھے ان کی حیثیت آزادانہ تھی بجز پست اقوام کے جو ابتداء سے مسلمانوں کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ علاوہ ازیں تقسیم ہند کے ساتھ ہی حکومت ہند کے ایماء اشارہ اور عملی امداد سے سرحدی ہنگامے شروع ہو گئے تھے۔ مسلمانوں میں اپنی آزادی کے تحفظ کا جذبہ پیدا ہو گیا اور انھوں نے موت و زیست کی کشمکش کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لیا۔

اتحاد المسلمین کے اندر اپنے پوزیشن کو مستحکم کرنے کے بعد قاسم رضوی کو ملک میں منصب قیادت تو حاصل ہو گئی تھی لیکن حکومت اور اس کی پالسیوں کی تشکیل میں ان کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ ہندوستان سے گفت و شنید کی جو منزلیں طے ہو رہی تھیں اس کی اطلاعات عبدالرحیم وزیر مواصلات کے ذریعہ انھیں مل تو جاتی تھیں لیکن ان کے راست مشورہ اور رائے کو حکومت قبول کرنے تیار نہ تھی۔ علاوہ ازیں وفد سر والٹر مانکٹن، سر سلطان احمد، نواب علی نواز جنگ جیسے جید اور مسلمہ قابلیت اور صلاحیتوں کے لوگوں پر مشتمل تھا جن کے سامنے قاسم رضوی کی حیثیت ایک طفل مکتب سے زیادہ نہ تھی، اس لئے قاسم رضوی کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ کسی طرح اس وفد کو برخواست کرا کر ایسا وفد تشکیل دیا جائے جو ان کا

پٹھو ہو۔ چنانچہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انھوں نے نواب چھتاری پر زور ڈال کر امور دستوری کا قلمدانِ وزارت علی یاور جنگ کے ہاتھوں سے نکال کر معین نواز جنگ کے سپرد کرایا تاکہ قلمدان کی تبدیلی سے علی یاور جنگ کا تعلق وفد اور گفت وشنید ہی سے ختم ہو جائے۔ اس کے بعد معاہدہ انتظام جاریہ کے سلسلہ میں جو وفد دہلی جارہا تھا اس کو شاہ منزل اور ارکان وفد کے مکانوں پر دھاوا بول کر روکا گیا۔ ارکان وفد کے مستعفی ہونے کے بعد انھیں اپنی مرضی کے ارکان کو نامزد کرنے کا موقع مل گیا جس کے لئے قاسم رضوی نے ساری کھکھیڑ اٹھائی تھی۔ ان ساری چیزوں کی تفصیلات کتاب میں علیحدہ ملیں گی۔

حیدرآباد میں نواب چھتاری کے ساتھ دوسری مرتبہ یہ نازیبا برتاؤ کیا گیا تھا۔ پہلے مولانا مظہر علی کامل کے صدارت اتحاد المسلمین کے وقت مسجد ڈپ پلی کے سلسلہ میں اور دوسرے قاسم رضوی کے ہاتھوں۔ ہر مرتبہ انھیں حیدرآباد سے بے نیل و مرام واپس ہونا پڑا۔

معاہدۂ انتظام جاریہ کی تکمیل کے لئے جب قاسم رضوی کا نامزد کردہ جدید وفد دہلی روانہ ہوا تو وہ بھی اپنے چند حواریوں کے ساتھ دہلی پہنچ گئے۔ جن میں تقی الدین مرحوم خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ قبل ازیں انھوں نے حیدرآباد کے ایک ہندو گجراتی نژاد وزیر جوشی کے ذریعہ سردار پٹیل سے ملاقات کی سبیل نکال لی تھی تاکہ ان کا دہلی کا یہ سفر لوگوں کو بے مقصد نظر نہ آئے۔ حیدرآباد میں یہ شہرت دی گئی کہ حیدرآباد کے مستقبل پر گفتگو کرنے کے لئے سردار پٹیل نے قاسم رضوی کو دہلی آنے کی دعوت دی ہے۔ اس ملاقات کی تفصیل بھی کے یم منشی کی کتاب ہی سے اخذ کی جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

> قاسم رضوی اور جوشی کمرۂ ملاقات میں داخل ہوئے سردار اپنی جگہ ایک مجسمہ کی طرح خاموش بیٹھے تھے جوشی نے نمسکار کیا اور رضوی نے گردن کو جنبش دے کر سلام کیا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔
>
> "آپ کیا چاہتے ہیں؟" سردار نے دریافت کیا۔

"میں آپ کی جانب سے دل کی تبدیلی کا خواہاں ہوں"

"قلب کی تبدیلی کی، اس کو ضرورت ہے جس کا دل زہر سے بھرا ہوا ہو"

"آپ حیدرآباد کو آزاد کیوں نہیں رہنے دیتے؟"

"میں نے حیدرآباد کے ساتھ ممکنہ رعایت کی۔ کسی ریاست کو وہ شرائط نہیں دی گئیں جو میں نے حیدرآباد کو دی ہیں"

"لیکن میں چاہتا ہوں آپ حیدرآباد کی مشکلات کو بھی محسوس کریں!"

"مجھے تو کوئی مشکل نظر نہیں آتی اِلا یہ کہ پاکستان سے تم نے سمجھوتہ کر لیا ہو"

"اگر آپ ہماری مشکلات کو محسوس نہیں کرتے تو ہم بھی جھکنے تیار نہیں ہیں۔ ہم آخری آدمی تک حیدرآباد کے لئے لڑیں گے اور مریں گے" رضوی نے جوشیلے انداز میں کہا۔

"اگر تم خودکشی کرنا چاہتے ہو تو میں کیسے روک سکتا ہوں!"

"آپ حیدرآباد کے مسلمانوں سے واقف نہیں ہیں۔ آزادی کے لئے ہم اپنی ہر چیز قربان کر دیں گے!"

"اگر قربانی کا سوال ہے تو دنیا ہندوستان کی قربانیاں دیکھ چکی ہے البتہ حیدرآباد کو اس مرحلہ سے گزرنا ہے!"

وی پی منن نے بھی قاسم رضوی سے اپنی بے نتیجہ ملاقات کا سرسری طور پر تذکرہ اپنی کتاب میں کیا ہے۔ ان ملاقاتوں کا کوئی مقصد نہ تھا بجز اس کے کہ حیدرآباد میں اپنی اہمیت ظاہر ہو اور مسلم عوام پر قیادت مسلّط کی جائے۔

برٹش رزیڈنٹ کو کسی زمانہ میں پیرا َسونٹسی کے کارندہ کی حیثیت سے حیدرآباد میں جو اہمیت حاصل تھی اس سے زیادہ اہمیت اس وقت قاسم رضوی نے حاصل کر لی تھی۔ رزیڈنٹ کے اعمال کی نوعیت خفیہ ہوتی تھی لیکن رضوی کا جو بھی عمل ہوتا وہ علانیہ ہوتا

تھا۔ اس زمانہ میں بادشاہ کی حیثیت اپنے ملک میں ثانوی درجہ کی ہوگئی تھی۔ جو بھی قوت تھی وہ قاسم رضوی کے ہاتھ میں تھی۔ اعلیٰ عہدہ داروں نے کنگ کوٹھی یا شاہ منزل کو چھوڑ کر دارالسلام کا طواف کرنا شروع کردیا تھا۔ اعلیٰ کلیدی خدمات پر قاسم رضوی کے ایما و اشارہ سے تقرر اور تبادلے کئے جاتے تھے۔ ایک ٹیلیفون پر عہدہ داروں کی قسمتوں کے فیصلے موقوف تھے۔ جب صدر کے اقتدار کا یہ عالم ہو تو حاشیہ کا کیا کچھ حال نہ ہوگا؟ مجلس کے سینیر کارکنوں کے مقابلہ میں قاسم رضوی کے نیم پختہ حاشیہ بردار بھی وزارتوں کے امیدوار بن گئے تھے۔

اتحادالمسلمین کی سب سے مقتدر جماعت اس کی مجلس شوریٰ تھی۔ ارکان کی جملہ تعداد (۲۵۰) کے قریب تھی جس میں شہر حیدرآباد اور اضلاع کے ارکان کی تعداد برابر تھی۔ شہر کے ارکان بالعموم تعلیمیافتہ ہوتے تھے اور ان کا سیاسی شعور بھی بیدار تھا لیکن اضلاع کے ارکان کی بیشتر تعداد غیر تعلیم یافتہ اور ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو اپنے ضلع کے صدر کے اشاروں پر چلتے تھے۔ مجلس شوریٰ کا ابتداء سے یہ ریکارڈ رہا ہے کہ مملکتی مجلس کے صدر پر اس نے ہمیشہ غیر معمولی اعتماد کیا ہے۔ قاسم رضوی کے زمانۂ صدارت میں مجلس شوریٰ کے چند نوجوانوں نے ایک تحریک پیش کی تھی کہ حیدرآباد کی آزادی کو ہندوستان کی بیہمانہ قوت کے مقابلہ میں کس طرح محفوظ کیا جاسکتا ہے اور ہندوستان سے جو غیر مفاہمانہ طرز اختیار کی گئی ہے اس کے کیا اسباب ہیں۔ اس تحریک کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ جب فوجی لحاظ سے حیدرآباد ہندوستان کے مقابلہ میں کمزور ہے تو پھر دہلی کے لال قلعہ پر پرچم آصفی ہرانے کے بلند بانگ دعوے کیوں کئے جاتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ اس تحریک کے بعد مجلس شوریٰ کے چند اہل الرائے ارکان کو اعتماد میں لیکر صحیح صورت حال ان کے سامنے رکھی جاتی قاسم رضوی نے اپنے خاص جذباتی انداز میں نفسیاتی داؤ پیچ سے کام لیا۔ اپنے اے ڈی سی کے ذریعہ الماری سے راز کی ایک مثل منگوائی اور کہا کہ اس تحریک کے ذریعہ مجھ پر مجلس شوریٰ نے بے اعتمادی کا

اظہار کیا ہے ہندوستان سے مقابلہ کے لئے حیدرآباد میں کیا کیا جارہا ہے اور ہماری جانب سے کیا اقدام ہونے والا ہے یہ ساری انتہائی راز کی چیزیں ہیں جنھیں اتنے زیادہ لوگوں کے سامنے عام نہیں کیا جاسکتا لیکن ارکان شوریٰ کو اگر اصرار ہے تو میں ساری چیزیں مجلس شوریٰ کے سامنے کھول کر رکھدیتا ہوں لیکن اس سے کیا نتائج مرتب ہوں گے میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ صدر کی زبان سے یہ الفاظ نکلنے کی دیر تھی کہ ہر طرف سے "نہیں! نہیں!" کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ ایک سینئر رکن نے جو امیدوار وزارت بھی تھے فوراً یہ تحریک پیش کی کہ مجلس شوریٰ کو نہ صرف صدر پر پورا اعتماد ہے بلکہ مجلسِ شوریٰ اپنے پورے اختیارات صدر کے تفویض کرتی ہے۔ یہ تحریک منظور ہوگئی اور گھر کے اندر بھی اب صدر پر اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہی۔ صدر کی آمریت جماعت کے اندر اور جماعت کے باہر پوری طرح قائم ہوگئی۔

نظام والیٔ ملک ہوتے ہوئے خاموش تماشائی تھے یا قاسم رضوی اور رضاکاروں سے اتنے مرعوب تھے کہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ دربار میں کاظم یار جنگ اور دین یار جنگ مسلمانوں کے موئدین کی حیثیت سے مشہور تھے۔ قاسم رضوی نظام کی شاطرانہ چالوں سے واقف تھے کہ معلوم نہیں کس وقت یہ کیا کر بیٹھیں۔ اس لئے ایک مرتبہ ان کے دل میں نظام کو تخت سے اتار کر وارثِ تخت (اعظم جاہ پرنس آف برار) کی بجائے ان کے فرزند مکرم جاہ کو تخت نشین کرانے کا خیال پیدا ہوا تھا لیکن جب شہزادی درشہوار کی بمبئی میں سردار پٹیل سے ملاقات کی خبر شائع ہوئی تو قاسم رضوی نے اپنے منصوبہ کو ترک کردیا۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ رضوی کو اپنی طاقت واقتدار کا کتنا گھمنڈ ہوگیا تھا۔

قاسم رضوی ہندوستان سے کسی سمجھوتہ کے لئے تیار نہ تھے، وہ بہر قیمت حیدرآباد کی آزادی کو مستحکم کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ ہندوستان کی جانب سے بار بار استصواب عامہ کی تحریکیں پیش ہوتی رہتی تھیں اس لئے مسلمانوں کی اقلیت کو اکثریت میں تبدیل کرنے کا ان کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ برار اور صوبہ متوسط کے مسلمانوں کو حیدرآباد

منتقل کرنے کے لئے وہاں کے چند مقامی لیڈروں کو ہموار کیا گیا۔ میسور، مدراس اور دوسرے علاقوں میں بھی یہ تحریک شروع کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً دس لاکھ مسلمانوں نے متصلہ صوبجات سے حیدرآباد ہجرت کی۔ حکومت نے تین کروڑ روپے مہاجرین کی آبادکاری کے لئے منظور کئے، اور یہ کام عبدالرحیم صدرالمہام کے تفویض کیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ مہاجرین کی آبادکاری کا جو کام حیدرآباد میں ہوا اس کی مثال ہندوستان یا پاکستان میں کہیں بھی نہیں ملتی۔ ایک قلیل عرصہ میں سارے مہاجرین کو جذب کر لیا گیا لیکن اس کو محسوس نہیں کیا گیا کہ ہندوستانی یونین کے بہت سے ایجنٹ بھی مہاجرین کے روپ میں حیدرآباد میں داخل ہو گئے تھے جو یہاں کی پل پل کی خبر ہندوستان روانہ کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ایسے زمانہ میں جب حیدرآباد کی قسمت پر مہر لگی ہوئی تھی مہاجرین کی آمد اور حکومت حیدرآباد کے ان کے ساتھ فراخدلانہ سلوک نے ہندوستانی یونین اور مقامی ہندوؤں کو حکومت حیدرآباد سے اور بھی بدظن کر دیا تھا۔ یہ چیز اگر سر علی امام کے زمانہ میں ہو جاتی تو اس کے نتائج ہی کچھ اور برآمد ہوتے۔

یہی نہیں بلکہ حیدرآباد کی تائید میں، دنیا خصوصاً عالم اسلامی کی رائے عامہ کو متاثر کرنے کی ایک اسکیم بروئے عمل لائی گئی۔ سید تقی الدین (مرحوم) کی سرکردگی میں ایک وفد اسلامی ممالک کے دورے پر روانہ کیا گیا۔ بجز مولانا مظہر علی کامل کے جو اس وفد میں لائق علی کے اصرار پر شریک ہوئے تھے، بقیہ سب ارکان قاسم رضوی کے حاشیہ بردار یا مرد وفد کے رشتہ دار تھے۔ اس وفد نے سارے عالم اسلام کا دورہ کیا اور ہر اسلامی ملک نے حیدرآباد کی آزادی کو تسلیم کرتے ہوئے ہندوستان کی مذمت کی لیکن ان ممالک کی زبانی ہمدردیوں سے حیدرآباد کا مسئلہ سلجھنے کی بجائے اُلجھ گیا۔ وفد کا دورہ ختم ہونے کے پہلے حیدرآباد کا سقوط عمل میں آگیا اور وفد کے ارکان حیدرآباد واپس نہ جا سکے کراچی ہی میں انھیں ہمیشہ کے لئے رک جانا پڑا۔ اس وفد کے اخراجات کے لئے کتنا روپیہ مختص کیا گیا تھا وہ کس طرح خرچ

ہوا اور کتنا خرچ ہوا اس کا کسی کو آج تک علم نہ ہوسکا۔

معاہدۂ انتظام جاریہ پر ہندوستان اور حیدرآباد کی آمادگی دو متضاد نقاط نظر کی حامل تھی۔ ہندوستان کشمیر میں اپنے فوجی پوزیشن کو مستحکم کرنا چاہتا تھا تاکہ حیدرآباد سے اطمینان سے نمٹا جاسکے۔ ادھر حیدرآباد اس اثناء میں اپنی فوجی قوت کو بڑھا کر اپنی آزادی کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ دونوں فریقین ایک دوسرے کے دشمن تھے اور وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ فرق یہ تھا کہ ہندوستان بہت طاقتور تھا اور اس کے وسائل لامحدود تھے اور حیدرآباد کے وسائل محدود اور چاروں طرف سے وہ ہندوستانی علاقوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان حیدرآباد کو شرکت پر مجبور کرنے کے لئے ہر طرح کا دباؤ ڈال رہا تھا۔ سرحدی ہنگامے اور اندرون ملک تخریبی سرگرمیاں ہندوستان کی پیدا کردہ تھیں لیکن ان سے عہدہ برآ ہونے کی جو سعی حیدرآباد میں کی گئی اور جس سے رضاکار بے لگام ہوگئے اس سے ملک کا امن و امان تباہ ہوگیا۔ یہی نہیں بلکہ پست اقوام کے لیڈروں کی ایما پر اونچی ذات کے ہندوؤں پر پست اقوام کے افراد نے مظالم شروع کردیئے اور لوٹ و غارت گری کا بازار گرم کردیا۔ ضلع بیدر میں تو حالات بہت ہی ابتر ہوگئے۔ حکومت حیدرآباد کی انسدادی تدابیر کا کچھ بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ حیدرآباد کی حکومت کو ہندوستان نے رضاکار حکومت کا نام دیدیا۔ پنڈت نہرو نے تو ایک مرتبہ اسے غنڈے اور لٹیروں کی جماعت سے تعبیر کیا۔ لیکن حکومت حیدرآباد نے رضاکار تنظیم پر آخر وقت تک پابندی عاید کرنے سے انکار کیا اور یہی مستقل معاہدہ کی گفت وشنید کی ناکامی کی بڑی وجہ ثابت ہوئی۔

معاہدۂ انتظام جاریہ کے وقت کے حالات مستقل معاہدہ کی گفت وشنید کے وقت بدل چکے تھے۔ کشمیر میں ہندوستان کے پیر جم چکے تھے، مذبذب دیسی ریاستیں ہندوستان میں شریک ہوگئی تھیں، ملک میں بدامنی اور فسادات پر قابو پالیا گیا تھا۔

فوج کی ایک معتدبہ تعداد حیدرآباد کے حملہ کے لئے محفوظ کرلی گئی تھی اس کے برخلاف حیدرآباد نے اپنے استحکام کے لئے کوئی مناسب تدابیر اختیار نہ کی تھیں۔ جنرل العیدروس پر قاسم رضوی کو جو ان کے رشتہ کے بھائی تھے پورا بھروسہ تھا لیکن کمانڈر کو اتحاد المسلمین کے صدر یا رضاکاروں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ فوج میں برائے نام بھرتی تو شروع کی گئی لیکن بھاری اسلحہ، بمبار طیارے، طیارہ شکن اور دبابہ شکن توپیں حیدرآباد کو تیسر نہ تھیں۔ بجز عزم کے حیدرآباد کی آزادی کو بچانے کے لئے کوئی مادی وسائل نہیں تھے اور عزم بغیر تیاری کے دنیا میں کبھی قوموں کی آزادی کی حفاظت کے لئے کافی ثابت نہیں ہوا۔

قاسم رضوی میں ایک مستبد آمر کی ساری خصوصیتیں پیدا ہوگئی تھیں۔ ان پر کسی حلقہ سے اعتراض نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ کسی مشورہ کو قبول کرنے کی ان میں صلاحیت تھی۔ شعیب اللہ خاں مدیر روزنامہ امروز کے واقعہ قتل کے بعد کسی میں ان پر تنقید کرنے کی ہمت نہ تھی۔ چند وظیفہ یاب مسلم عہدہ داروں نے ان کی پالیسیوں پر اپنے ایک اخباری بیان میں اعتراض کرتے ہوئے ہندوستانی یونین میں شرکت کا مشورہ دیا تھا۔ تو ان کے وظائف کی مسدودی کی کارروائی شروع کی گئی اور انھیں غدار قرار دیا گیا۔ ملک کی سیاست پر رضاکار پوری طرح چھا گئے تھے۔

اتحاد المسلمین اپنے اقتدار کے نصف النہار پر پہنچ گئی تھی اور ارتقا کی ساری منزلیں انتہائی سرعت سے اس نے طے کرلی تھیں۔ اس سرعت پذیری کا اندازہ قاسم رضوی کی موٹررانی سے بھی ہوتا تھا جبکہ وسط شہر کی گنجان سڑکوں پر ساٹھ ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے وہ اپنی جیپ وان چلایا کرتے تھے۔ جب کوئی جماعت سرپٹ راستہ کے نشیب و فراز سے آنکھیں بند کئے آگے بڑھے تو اس کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو ایک تیز رفتار موٹر اور اس میں بیٹھنے والوں کا موٹر کے کسی گہری کھائی میں گرنے کے بعد ہوتا ہے۔ حیدرآباد کا بھی یہی حشر ہوا۔

۱۲

معاہدۂ جاریہ کی خلاف ورزیاں

معاہدۂ انتظام جاریہ کی تکمیل فریقین کی باہمی خوشدلی کی بناء پر عمل میں نہیں آئی تھی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے دونوں فریقین اپنے اپنے داؤ پر تھے۔ ہندوستان کے ہاتھ کشمیر اور دیگر مسائل میں گتھے ہوئے تھے اور قاسم رضوی چاہتے تھے کہ اس ایک سالہ مدت میں حیدرآباد کو فوجی حیثیت سے اتنا مستحکم کر لیا جائے کہ طاقت و قوت کے بل بوتے مساوات کی اساس پر ہندوستان سے ایسا سمجھوتہ کیا جا سکے جس سے نہ صرف حیدرآباد کی آزادی کا بھی تحفظ ہو جائے گا بلکہ مسلمانوں کے ہاتھ اقتدار بھی باقی رہے گا۔ چنانچہ معاہدۂ انتظام جاریہ کی تکمیل کے قبل ہی ریاست حیدرآباد کی افواج کے سپہ سالار جنرل العیدروس حیدرآباد کے لئے اسلحہ خریدنے کے لئے زیکوسلواکیہ روانہ کئے گئے تھے۔ برطانیہ میں بھی اسلحہ کے حصول کی کوششیں کی گئی تھیں۔ ہندوستانی حکومت ان ساری چیزوں سے باخبر تھی۔ اسٹریلوی ہوا باز سڈنی کاٹن بے دھڑک اپنے ہوائی جہازیں حیدرآباد کو اسلحہ فراہم کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ حیدرآباد کے قائدین وقتاً فوقتاً مشورہ کے لئے پاکستان کا سفر کرتے تھے۔ یہ ساری چیزیں ہندوستان کے نزدیک معاندانہ نوعیت کی تھیں۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے نقطۂ نظر سے حیدرآباد کے اندر رضاکار حکومت قائم تھی اور رضاکاروں نے ملک کے امن و امان کو خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ اتحاد المسلمین کے قائدین اور خصوصاً قاسم رضوی کے بیانات سے مفاہمت کی راہ ہموار ہونے کی بجائے اختلاف کی خلیج دن بدن وسیع

ہو رہی تھی ۔ اس کے برخلاف ہندوستانی حکومت حیدرآباد کو شرکت پر مجبور کرنے کے لئے اپنے پورے وسائل حیدرآباد کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دئے تھے ۔ اخبارات، پروپگنڈہ، ریڈیو نشریات، قائدین کے بیانات، سرحدی ہنگامے، معاشی ناکہ بندی، تخریبی سرگرمیاں، ہر چیز کا رخ حیدرآباد کی طرف پوری قوت کے ساتھ پھیر دیا گیا تھا ۔ دنیا کو بتلانے کے لئے فریقین کے درمیان ایک معاہدہ کی تکمیل ہو گئی تھی لیکن معاہدہ کی سیاہی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ دونوں کی جانب سے ایک دوسرے کے خلاف معاہدے کی خلاف ورزی کے الزامات عاید کئے جانے لگے ۔ ہندوستان جیسے وسیع اور طاقتور ملک کے لئے یہ چیز کتنی مضحکہ خیز تھی کہ وہ اپنی سرحدوں کی خلاف ورزیوں کا حیدرآباد پر الزام لگائے ۔ ہندوستان کی جانب سے متعدد مرتبہ حیدرآباد پر ایسے الزامات عاید کئے گئے حالانکہ یہ الزام اُلٹا ہندوستان پر عاید ہوتا تھا جس کی تصدیق سقوط حیدرآباد کے بعد ہندو لیڈروں کے بیانات سے بھی ہوئی ۔ قاسم رضوی نے اپنے آخری خطبہ صدارت میں بھیڑیئے اور بکرے کی مثال کے ذریعہ اس صورت حال کی صحیح ترجمانی کی تھی ۔ لیکن جذبات کی رو میں بکرے کو شیر میں تبدیل کر لیا تھا ۔

"ہندوستان حیدرآباد میں تباہی اور غارتگری کے نتیجے جو دراصل خود اس کے بھیجے ہوئے غنڈوں کی پیدا کردہ ہے ہماری آزادی کو چھین لینا چاہتا ہے ۔ یہ بالکل اس بھیڑیئے کی منطق ہے جو نہر کے بہاؤ کے نیچے پانی پینے والے بکری کے بچے کے ساتھ اس نے کی ہے ۔ حیدرآباد نے تعاون کا ہاتھ بڑھایا اور انصاف کا طالب ہوا لیکن پیام محبت کا جواب دشمنی سے دیا گیا ۔ یہ ہے وہ سلوک جو بھیڑیئے نے بکری کے بچے کے ساتھ کیا تھا ۔ مگر اس بکری کے بچے نے جب عزت کی موت کا تہیہ کر لیا اور پانی پینے کے لئے نہر پر پہنچا تو حقیقت اس پر آشکار ہوئی ۔ اس نے اپنا عکس پانی میں دیکھا اور بھیڑیئے کی طرف بڑھا ۔ تب بھیڑیئے کو معلوم ہوا کہ یہ شیر ہے ڈرنے والا نہیں ۔

فولاد کا چنا ہے ۔۔۔ اس کا جنگل ہے ۔۔۔ وہ بھیڑیا جتنا چاہے غرّائے لیکن اس کے جنگل سے دُور ۔۔ ورنہ ایک برق ہوگی جو ہندوستان کے خرمنِ امن کو جلا کر خاکستر کردے گی ۔"

اس تمثیل میں قاسم رضوی نے بکری کے بچے کو شیر بنانا چاہا جو ایک ناممکن سی بات تھی اور نتیجہ بھی اس کا ظاہر ہو گیا۔

معاہدۂ انتظام جاریہ جس مقصد سے کیا گیا تھا اس کا حال بھی قاسم رضوی ہی کی زبان سے سُنیئے :۔

"بعض اشخاص کہتے ہیں کہ اس معاہدہ سے انڈیا نے وقت حاصل کیا ہے وہ دن بدن طاقتور ہوتا جائے گا اور حیدرآباد کے لئے خطرناک صورت اختیار کرے گا۔ لیکن میں یہ کیوں نہ سوچوں کہ اس سے ہمیں وقت ملا ہے۔ میں یہ کیوں نہ سمجھوں کہ اپنے سیاسی انتشار نسلی و مذہبی اختلاف اور بین المملکتی اور بین الاقوامی صورتِ حال کے مدنظر انڈیا کمزور سے کمزور تر ہوتا جائے گا اور اس کے برعکس ہمارے متحدہ عزم سے حیدرآباد دن بدن طاقت حاصل کرتا اور پھلتا پھولتا جائے گا۔"

فریقین ایک دوسرے کے متعلق شکوک و شبہات میں مبتلا تھے اور خلاف ورزیوں کے معاملے میں دونوں کا دامن پاک نہ تھا۔ معاہدہ کے مطابق ہندوستان نے صرف دو امور صحیح طور پر انجام دیئے۔ ایک تو سکندرآباد کنٹونمنٹ سے ہندوستانی فوج کو واپس بلالیا دوسرے رزیڈنسی کی بلڈنگ حیدرآباد کے حوالہ کردی۔ اس اثناء میں حکومت حیدرآباد کے دو تین فیصلوں کو ہندوستان نے معاہدہ کی خلاف ورزی قرار دیا۔ سب سے پہلے تو پاکستان کو بیس کروڑ کے امانتی قرضہ کا دیا جانا' دوسرے حیدرآباد سے طلا اور قیمتی دھاتوں کی برآمد پر امتناع عاید کرنا اور تیسرے حیدرآباد کے اندر ہندوستانی کرنسی کے چلن کو بند کرنا۔ ہندوستان نے ابتداء میں ان تین چیزوں کو لائق علی کے سامنے پیش کیا جو

حیدرآباد کی جانب سے گفت وشنید کے سربراہ تھے۔ ہندوستان کو اصرار تھا کہ ہر ستہ امور میں حیدرآباد کو قبل از قبل ہندوستان کے علم میں یہ چیزیں لانی چاہیئے تھی کیونکہ ۱۵راگست کے پہلے حیدرآباد انگریزوں کے دور میں اپنے طور پر ایسی جسارت نہیں کرسکتا تھا۔ اس استدلال میں قوت تھی۔ قاسم رضوی کی بعض اشتعال انگیز تقریروں پر اعتراض کرتے ہوئے رضاکار تنظیم کو ختم کرنے کا بھی مطالبہ کیا گیا تھا۔ اسی زمانہ میں بتاریخ ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء گاندھی جی کے قتل کا واقعہ ظہور میں آیا۔

ہندوستان کی ساری رضاکار تنظیمات پر حکومت ہند نے امتناع عاید کردیا۔ اس موقع سے حیدرآباد میں بھی فائدہ اُٹھایا جاسکتا تھا اور برائے نام تنظیم ختم کردی جاتی تو حیدرآباد کے خلاف ایک بہت بڑا الزام رفع ہوجاتا۔ لیکن دانشورانِ دکن تو رضاکاروں کو خدائی فوج سے تعبیر کرتے تھے جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے ختم ہوسکتی تھی جیسا کہ بعد میں ہوئی۔

اسی زمانہ میں سر والٹر مانکٹن کی خدمات نظام نے پھر حاصل کرلیں جو آخر وقت تک حیدرآبادی وفد کو گفت وشنید میں امداد دیتے رہے۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ لائق علی نے یہ وعدہ کیا تھا کہ بیس کروڑ کی امانتیں معاہدۂ جاریہ کی مدت میں پاکستان کی جانب سے نکاری نہ جائیں گی اور یہ کہ برآمدیٔ طلا اور ہندوستانی کرنسی کے امتناعی قوانین میں ترمیم کی جائے گی۔ یہ مباحث ۳۰ر جنوری کی صبح منعقد ہوئے تھے لیکن شام میں گاندھی جی کے واقعۂ قتل کی وجہ سے کچھ دنوں کے لئے گفتگو میں التوا کی صورت پیدا ہوگئی۔ ۲۳ر مارچ کو حکومت ہند نے رسمی طور پر معاہدہ جاریہ کی خلاف ورزیوں کے خلاف حیدرآباد سے احتجاج کیا۔ یہ مراسلہ چار فقرات پر مشتمل تھا۔ پہلے فقرہ میں امور خارجہ کے تعلق سے بیان کیا گیا تھا کہ پاکستان کو بیس کروڑ کا اماتی قرض دیا گیا اور یہ کہ کراچی میں ایک پبلک ریلیشنز افسر کا تقرر منظور کیا گیا۔ دفاع کے سلسلے میں یہ خلاف ورزی بیان کی گئی کہ سابقہ

حکومتِ ہند کی مقرر کردہ تعداد سے زیادہ حیدرآباد کی فوج میں اضافہ کیا گیا۔ پولس کی تعداد کے متعلق سالانہ تختہ حکومت ہند کو روانہ نہیں کیا گیا جیسے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے پہلے عمل تھا اور رضا کار تنظیم کی سرپرستی کی گئی۔ سو اصلاحات کے متعلق بیان کیا گیا کہ حکومت ہند سے استمزاج کے بغیر امریکہ سے حیدرآباد میں ریڈیو ٹرانسمیٹنگ اسٹیشن کے قیام کا معاہدہ کیا گیا۔ آخر میں طلا کی برآمد اور ہندوستانی کرنسی کی چلن پر امتناع کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مجلس اتحاد المسلمین کے توڑنے کا مطالبہ کیا گیا جس کی وجہ سے نہ صرف حیدرآباد کے اندر بلکہ متصلہ ہندوستانی صوبہ جات کا امن و امان خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ لائق علی نے ۵ اپریل کو اس مراسلہ کا ایک تفصیلی جواب پنڈت نہرو کے نام روانہ کیا جس میں ہندوستان پر اُلٹا یہ الزام عاید کیا گیا کہ حیدرآباد کے خلاف معاشی ناکہ بندی پہلے سے زیادہ سخت کر دی گئی اور حیدرآباد کی سرحدوں کے اطراف فوجیں متعین کی گئیں۔ بمبئی، مدراس اور دیگر شہروں سے کوئی مال حیدرآباد میں درآمد نہیں کیا جا سکتا جس کی وجہ سے صحت عامہ متاثر ہو گئی ہے۔ آخر میں حکومت حیدرآباد کی جانب سے ثالثی کا مطالبہ کیا گیا جس کی صراحت معاہدۂ انتظام جاریہ میں موجود ہے۔ نظام دکن نے بھی مونٹ بیٹن کو ان امور کی طرف اپنے ایک مکتوب مورخہ ۵ اپریل میں سر والٹر مانکٹن کے ذریعہ توجہ دلائی اور حسب سابق مونٹ بیٹن نے اپنی یقین دہانیوں کا اعادہ کیا۔

حکومتِ ہند کی جانب سے وی پی مینن نے جو ابتدائی خط ۲۳ مارچ کو لکھا تھا اس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا جس کی طرف مانکٹن نے مونٹ بیٹن اور نہرو کی توجہ مبذول کرائی۔ چونکہ ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا اس لئے قاسم رضوی کی اشتعال انگیز تقاریر کو آڑ بنا کر یہ دریافت کیا گیا کہ حیدرآباد پر آیا نظام کی حکمرانی ہے یا قاسم رضوی کی؟ یہ مسلمہ ہے کہ ہندوستان کی نیت صاف نہ تھی۔ الزام تراشی اور پروپیگنڈہ کے فن میں ہندوستان کے کانگریسی لیڈروں اور اخبارات کا دنیا میں مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس امر

کا بھی لحاظ رکھا جاتا تھا کہ کس وقت کونسی خبر شائع کی جائے اور اس سے کس قسم کا اثر پیدا کیا جائے۔ مثال کے طور پر حیدرآبادی وفد سے گفتگو کی تاریخ ۷ اپریل کی شام مقرر تھی۔ صبح کے ہندوستان ٹائمز میں جلی عنوانات سے یہ خبر شائع کی گئی کہ ۳۰ مارچ کو قاسم رضوی نے ایک جلسۂ عام میں "ہفتۂ اسلحہ" منایا اور جہاد کی تلقین کی۔ بقول وی پی منن اس تقریر کا سب سے زیادہ دل آزار پہلو وہ تھا جس میں بیان کیا گیا تھا کہ اگر حیدرآباد سے مقابلہ کیا جائے گا تو ہندوستان کے ساڑھے چار کروڑ مسلمان ہندوستان کے خلاف پانچویں کالم کا کام دیں گے۔ یہ اخباری خبر بالکل بے بنیاد تھی۔ یہ نہیں کہ قاسم رضوی ایسی تقریر نہیں کر سکتے تھے انھوں نے اس سے زیادہ سخت اور جذبات انگیز تقاریر کی ہیں اور آخر وقت تک کرتے رہے ہیں لیکن متذکرۂ صدر تقریر انھوں نے نہیں کی تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ تقریر ۳۰ مارچ کو ہوتی ہے اور حیدرآباد کے کسی مسلم یا ہندو اخبار میں شائع نہیں ہوتی اور عین اس روز جبکہ حیدرآبادی وفد سے مونٹ بیٹن سے ملاقات کی تاریخ مقرر ہوتی ہے ہندوستان ٹائمز کو الہام کے ذریعہ یہ خبر پہنچتی اور اخبار میں شائع ہوتی ہے۔ اس خبر کی اشاعت کا مقصد بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ حیدرآبادی وفد کو پریشانی میں مبتلا کر کے شرکت پر مجبور کیا جائے۔

مسٹر والٹر مانکٹن نے حیدرآباد واپس آکر اپنی تحقیقات کے بعد بتاریخ ۱۱ اپریل مونٹ بیٹن کو قاسم رضوی کی ہفتہ اسلحہ والی تقریر کی خبر کے بے بنیاد ہونے کی اطلاع دی۔ لیکن قاسم رضوی نے یہ اتہام تراشی برداشت نہیں کی اور مبینہ بے بنیاد تقریر سے زیادہ سخت ایک تقریر داغ دی جو اسوشئیٹڈ پریس کے ذریعہ ۱۲ اپریل کو اخبارات میں شائع ہوئی۔ اس میں قاسم رضوی نے یہ بتلایا کہ وہ دن دور نہیں جب خلیج بنگال کی لہریں ہمارے بادشاہ کے قدم چومیں گی اور پرچم آصفی دہلی کے لال قلعہ پر لہرائے گا۔

لائق علی اور مسٹر والٹر مانکٹن نے ۱۵ اپریل کو پنڈت نہرو سے ملاقات کی اول الذکر نے

جب قاسم رضوی کے ہفتہ اسلحہ کی تقریر کے بے بنیاد ہونے کا اعادہ کیا تو پنڈت نہرو نے پہلو بدل کر قاسم رضوی کی دوسری اشتعال انگیز تقاریر کا حوالہ دیا اور غیر مبہم الفاظ میں کہہ دیا کہ ہندوستان آزاد حیدرآباد کو کسی قیمت برداشت نہیں کر سکتا۔ سردار پٹیل نے بھی ان ہی خیالات کا اظہار کیا۔ لائق علی ہندوستان میں شرکت کی بجائے دونوں ملکوں میں سیاسی ہم آہنگی چاہتے تھے۔ بالآخر بقول وی پی منن طویل مباحث کے بعد جومونٹ بیٹن، مانکٹن، نہرو اور منن کے درمیان ہوئے نظام کی منظوری حاصل کرنے کے لئے چار امور کا تصفیہ کیا گیا: (۱) رضاکار تنظیم پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے فوری اقدام جس کی ابتداء رضاکار جلوس، اجتماعات اور تقاریر پر امتناع سے کیا جائے۔ (۲) ریاستی کانگریسی ارکان کی جیلوں سے رہائی جس کی ابتداء لیڈروں کی رہائی سے کی جائے (۳) حکومت حیدرآباد کی تشکیل جدید جس میں تمام جماعتوں کو نمائندگی دی جائے (۴) ختم سال تک مجلس دستور ساز کے انعقاد کا اعلان اور جلد از جلد ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کی تدابیر۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مانکٹن نے ان چاروں امور کے علاوہ لائق علی کی بجائے کسی دوسرے وزیر اعظم کے تقرر کے متعلق نظام کو آمادہ کرانے کا بھی وعدہ کیا۔

وسط ماہ مئی تک حیدرآباد کی جانب سے مسلسل کوشش کی گئی کہ ہندوستان سے امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے متعلق کوئی ایسا سمجھوتہ ہو جائے جس پر شرکت کی تعریف کا اطلاق نہ ہو لیکن ہندوستان ٹس سے مس نہ ہوا۔ کبھی اس کی جانب سے شرکت پر اصرار کیا جاتا کبھی ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کا مطالبہ ہوتا۔ حیدرآباد کی جانب سے پس و پیش کی صورت میں اس پر معاہدۂ انتظام جاریہ کی خلاف ورزی اور بیرونی ممالک سے اسلحہ حاصل کرنے کا الزام عائد کیا جاتا۔ حیدرآباد کی جانب سے ثالثی کی تحریک پیش ہوتی تو ہندوستان کی جانب سے رضاکار تنظیم ختم کرنے اور ریڈیو پروپگنڈا بند کرنے کا مطالبہ پیش ہوتا۔ بہرکیف دونوں کی جانب سے ایک دوسرے پر الزام تراشیوں

کا سلسلہ جاری تھا۔

مونٹ بیٹن کے عہدہ کی مدت قریب الختم تھی۔ ۲۱ر جون کو وہ اپنی خدمت سے سبکدوش ہورہے تھے۔ اس ایک ماہ کی مدت میں وہ کسی طرح حیدرآباد کے مسئلہ کو حل کرنا چاہتے تھے لیکن وقت تنگ تھا۔ اپنی حکومت کی زیادتیوں کے متعلق ان کے جو بھی خیالات ہوں لیکن ایک دستوری گورنر جنرل کی حیثیت سے وہ اپنی حکومت کی پالیسی کو چلانے پر مجبور تھے۔ معاشی ناکہ بندی، سرحدی ہنگامے اور حیدرآباد کے اطراف فوجی اجتماعات ان کے علم کے بغیر تو عمل میں نہیں لائے جاسکتے تھے۔ انگریزوں سے حیدرآباد کی دیرینہ وفاداریوں کا بھی انھیں احساس تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ان کے جانے کے بعد حیدرآباد کا مسئلہ حل نہ ہوگا کیونکہ ان کی حکومت آزاد حیدرآباد کے وجود کو برداشت کرنے تیار نہ تھی۔ ان ساری چیزوں کو پیش نظر رکھکر مونٹ بیٹن نے نظام کو دہلی آنے کی دعوت دی لیکن نظام کو حیدرآباد سے کون نکلنے دیتا۔ انھوں نے جوابی دعوت مونٹ بیٹن کو دے دی بالآخر مونٹ بیٹن نے اپنے پریس اتاشی کیمبل جانسن کو نظام سے ملاقات کرنے اور حیدرآباد کے حالات کا مطالعہ کرکے رپورٹ پیش کرنے کے لئے روانہ کیا۔ لائق علی کی موجودگی میں کیمبل جانسن نے نظام سے ملاقات کی۔ حیدرآباد کے ہندو اور مسلم زعما سے بھی ملے۔ ان کی رپورٹ بھی حیدرآباد کے خلاف تھی اس لئے کہ (۸۵) فیصد ہندو اکثریت کے مقابلہ میں مسلم اقلیت کے نقطۂ نظر اور تاریخی اہمیت کسی کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ حیدرآباد کی آزادی کے معاملہ میں اس نے نظام ہی کو سب سے زیادہ مورد الزام قرار دیا۔

۲۵ر مئی کو مونٹ بیٹن نے حیدرآبادی وفد سے پانچ گھنٹے گفتگو کی اور کھلے الفاظ میں بتلا دیا کہ اگر ہندوستان سے سمجھوتہ نہ کیا گیا تو اس کے نتائج حیدرآباد کے لئے تباہ کن ثابت ہونگے انھوں نے جبکہ وہ حیدرآبادی وفد کے ساتھ تنہا تھے یہاں تک کہا کہ ہندوستان نے حیدرآباد پر فوج کشی کا منصوبہ تیار کرلیا ہے اور حیدرآباد مقابلہ نہیں کرسکتا۔ لیکن حیدرآباد کے

وفد نے مونٹ بیٹن کے اس پُر خلوص مشورہ کو تشدد سے تعبیر کیا۔

یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس گفتگو میں لائق علی نے حیدرآباد کی انڈیا یونین میں شرکت سے انکار کیا اور ذمہ دارانہ حکومت کو بھی منظور نہیں کیا جو بالفاظ دیگر ان کے نزدیک شرکت کے مترادف تھا۔ شرکت کو وہ پیرامونٹسی سے دس گنا بدتر سمجھتے تھے۔ اس پر استصواب عامہ کا مطالبہ کیا گیا۔ منن کا بیان ہے کہ لائق علی مسئلہ شرکت کے تصفیہ کے لئے استصواب کی اس وجہ سے تائید میں نہ تھے کہ اس سے حیدرآباد کے امن و امان میں ابتری پیدا ہو جائے گی۔ اس کے برخلاف لائق علی نے اپنی کتاب میں استصواب پر اپنی آمادگی کو اپنا ایک بڑا کارنامہ بتلاکر پیش کیا ہے جس کی تفصیل آگے ایک باب میں آئے گی۔ منن کے قول کے مطابق لائق علی شرائط شراکت کی بجائے معاہدہ مفاہمت[1] کے لئے تیار تھے اور بعد میں ذمہ دارانہ حکومت کے لئے بھی آمادہ ہو گئے تھے۔ بالآخر لائق علی کی خواہش پر منن نے ہندوستان کی اقل ترین شرائط کو معاہدہ کی صورت میں مدون کیا جس کی تفصیل آئندہ باب میں درج کی گئی ہے۔

---

[1] مفاہمت کے لفظ میں مساوات کا تصور پیدا کیا گیا تھا اور شراکت کے معنی محکومیت کے لئے جاتے تھے

۱۳

گفت وشنید کا انقطاع

ہندوستان اور حیدرآباد کے مابین مستقل معاہدہ کے لئے جو مسودہ شرائط مدات Heads
۲۵ مئی ۱۹۴۸ء کو مرتب کیا گیا تھا اس میں درج ذیل امور کو شامل کیا گیا تھا :

الف ۔ امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے متعلق حکومت حیدرآباد ایسے قوانین کے
نفاذ پر آمادہ ہو جو شیڈول کے مندرجہ ذیل کسی امر کے متعلق حکومت ہند حیدرآباد میں
نافذ کرنے کی درخواست کرے۔

ب ۔ اگر حکومت حیدرآباد ایسے قوانین کے نفاذ سے قاصر رہے تو حکومت ہند کو ان کے
نافذ کرنے کا اختیار ہوگا جس صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ یہ حیدرآباد میں بھی قابل
عمل ہیں ۔

ج ۔ حیدرآباد کی فوج کی تعداد بیس ہزار سے زائد نہ ہوگی۔ حکومت ہند کو معائنہ کا حق حاصل
ہوگا اور ساری افواج بے قاعدہ بشمول عسکری تنظیمات ختم کر دی جائیں گی۔

د ۔ حیدرآباد کے اندر حکومت ہند بجز مفاجاتی حالات کے اپنی افواج متعین نہیں کرےگی
لیکن مفاجاتی حالت کا تصفیہ حکومت ہند کرے گی ۔

ہ ۔ حکومتِ ہند حیدرآباد کے خارجی تعلقات کی ذمہ دار ہوگی اور دنیا کے کسی ملک سے
حیدرآباد کو سیاسی تعلقات قائم کرنے کا اختیار نہ ہوگا ۔

و ۔ آپس کے مشترکہ معاملات کی انجام دہی موجودہ معاہدات اور انتظامی سمجھوتوں کی

بنیاد پر ہوگی۔

اس مسودہ کے دوسرے جزو میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ معاہدہ کی تکمیل کے بعد ہی حیدرآباد میں ایک عارضی حکومت تشکیل دی جائے گی جس میں بشمول وزیر اعظم ارکان کابینہ میں نصف غیر مسلم ہوں گے۔ یہ عارضی حکومت یکم جنوری ۱۹۴۹ء کے قبل ایک دستور ساز اسمبلی کے انعقاد کا اعلان کرے گی جس کا انتخاب علاقہ واری بنیادوں پر وسیع حق رائے دہی کی بنیاد پر عمل میں آئے گا اور جس کے ارکان کی (۶۰) فیصد تعداد غیر مسلم ہوگی۔ دستور ساز اسمبلی کے انعقاد کے بعد عارضی باب حکومت اور مقننہ کی تحلیل عمل میں آئے گی اور ایک جدید کابینہ کی تشکیل کی جائے گی جس کو دستور ساز اسمبلی کا اعتماد حاصل ہوگا۔ کابینہ کے کم از کم (۶۰) فیصد ارکان غیر مسلم ہوں گے۔ دستور ساز اسمبلی حیدرآباد کا دستور مدوّن کرے گی۔ مسلمانوں کے جائز مذہبی اور ثقافتی مفادات کا دس سال کے لئے تحفظ کیا جائے گا۔ جدید دستور کے قابلِ عمل ہونے کے پانچ سال بعد تک حکومت ہند اور حکومتِ نظام کے تعلقات کی بنیاد مسودہ شراکت کے جزو اول کی شرائط پر مبنی ہوگی۔ حیدرآباد میں سرکاری ملازمتوں بشمول فوج میں فرقہ واری تناسب کو اس طرح قائم کیا جائے گا کہ سارے فرقوں کو مناسب نمائندگی حاصل ہو جائے اور یکم جنوری ۱۹۵۴ء تک سرکاری ملازمتوں میں (۶۰) فیصد تک غیر مسلم تناسب قائم ہو جائے گا۔

چونکہ سر والٹر مانکٹن کی انگلستان سے آمد کا انتظار تھا اس لئے گفت و شنید کی آئندہ تاریخ ۶؍ جون مقرر کی گئی۔ حیدرآباد کی جانب سے ایک متبادل مسودہ شراکت پیش کیا گیا جو ہندوستان کے لئے قابلِ قبول نہ تھا۔ لائق علی نے ہندوستان میں شرکت یا آزادی کے مسئلہ کے تصفیہ کے لئے استصواب پر آمادگی کا اظہار کیا جو اقوامِ متحدہ جیسی غیر جانبدار جماعت کی نگرانی میں منعقد کیا جائے گا۔ لیکن ہندوستان کی جانب سے استصواب کی پیشکش کو اس وقت تک قبول کرنے سے انکار کیا گیا جبتک حیدرآباد عملاً ہندوستان میں شرکت

کر کے امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے متعلق نفاذ قوانین کا اختیار ہندوستان کے سپرد نہیں کر دیتا۔ یوں دیکھا جائے تو استصواب کا مطالبہ پہلے سردار پٹیل نے پیش کیا تھا۔ اور ہندوستان کو یقین کامل تھا کہ حیدرآباد جس کی ۸۵ فیصد آبادی ہندوؤں کی اکثریت پر مشتمل ہے، اس کو قبول نہیں کرے گا۔ لیکن ان کی توقع کے خلاف جب حیدرآباد نے استصواب کو قبول کر لیا تو ہندوستان نے پینترا بدلا۔

وی پی منن نے اپنی کتاب میں ۸ و ۹ جون کے مباحث کی جو تفصیل درج کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سر والٹر مانکٹن نے ایک ترمیمہ مسودہ پیش کیا جس کو ہندوستان نے قبول نہیں کیا۔ ہندوستان کی جانب سے رضاکار تنظیم کے خاتمہ اور عوامی بنیاد پر حکومت حیدرآباد کی تشکیل جدید کا مطالبہ کیا گیا۔ دوران مباحث میں یہ چیز واضح ہوگئی کہ نفاذ قوانین کے حق سے ہندوستان کسی طرح دستبردار ہونے تیار نہیں ہے اور یہ کہ بیس ہزار کی حیدرآبادی فوج میں امدادی (Auxiliary Service) سروس کی جمعیت بھی داخل ہوگی اسی زمانہ میں سرحدی ہنگاموں کے متعلق حکومت ہند نے یہ اعلان کیا تھا کہ ہندوستانی سرحدوں پر حملہ کرنیوالوں کا تعاقب پولس اور فوج کی جانب سے حیدرآباد کے حدود کے اندر بھی کیا جائے گا۔ چونکہ اس سے رو در رو مقابلہ کی صورت پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے حیدرآباد کے وزیر اعظم کے حکم کی بنا پر حیدرآبادی فوج کو اپنی سرحدوں سے تین میل کے اندر ہٹ جانے کا حکم دیا گیا۔ حیدرآبادی وفد کے بیان کے بموجب ہندوستان کے گورنر جنرل نے وفد کو اعتماد میں لیکر بیان کیا کہ ہندوستان کی حکومت حیدرآباد پر فوج کشی کے لئے پابہ رکاب ہے۔ ہندوستان کی فوج کی تعداد تین لاکھ تبلائی گئی جس میں سے صرف چالیس ہزار کشمیر میں مصروف ہے۔ فوج کا بکتر بند ڈویژن حیدرآباد کی سرحد سے صرف تین یوم کی مسافت پر متعین ہے۔ میکانی اور بری فوج بھی کافی تعداد میں ہے۔ گورنر جنرل نے یہ بھی کہا کہ اگر سنگین صورت حال پیدا ہو جائے تو حیدرآباد کے خلاف فوج کشی ناگزیر ہے

ہندوستانی فوج کو حیدرآباد پر قبضہ کرنے سے کوئی قوت روک نہیں سکتی۔ رضاکاروں کو کارہائے نمایاں انجام دے کر مرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ لیکن اس حملہ سے نظام کی حکومت ختم ہوجائے گی البتہ ان کی ذات کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ پورے برصغیر پر اس کا ردعمل ہوگا اور ابھی سے دہلی کے مسلمان ہندوؤں کی انتقامی کارروائیوں سے خائف ہیں۔ گورنر جنرل نے اس امر کی بھی وضاحت کی کہ اگر حیدرآباد کے معاملات میں انھیں ذرا بھی دخل ہوتا تو نظام کو تخت پر برقرار رکھنے کے لیے وہ بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے سے دریغ نہ کرتے اور مسلمان زمینداروں اور مسلمان ملازمین کے تناسب کو تدریجی طور پر کم کرنے آمادہ ہوجاتے۔ انھوں نے بتلایا کہ اب تک حیدرآباد کو ہندوستانی حملہ کی صورت میں عالمی رائے عامہ کو اپنے تائید میں کرنے کا موقع تھا لیکن اب اس کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ انحطاط پذیر حالات بتلا رہے ہیں کہ سرحدی ہنگاموں کی جگہ اب جو فوجی کارروائی کی جائیگی اس پر عالمی رائے عامہ ہندوستان کو اتنا بدنام نہیں کرے گی۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے زعما کو بین الاقوامی حالات کی اتنی پروا بھی نہیں ہے وہ اپنی پوری توجہ قومی استحکام پر صرف کر رہے ہیں۔ حتّٰی کہ اقوام متحدہ کا مسٹر نہرو کو بڑا تلخ تجربہ ہوا ہے جس نے کشمیر کے مسئلہ میں ہندوستان کے خلاف فیصلہ صادر کیا ہے۔ یہ امر بھی غورطلب ہے کہ مجلس اقوام متحدہ اپنے فیصلوں کی تعمیل کے ناقابل ہے۔[1]

حیدرآبادی وفد کے اس بیان کی صداقت کو جو مونٹ بیٹن سے منسوب کیا جاتا ہے تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس کے قبل بھی انھوں نے اشارۃً فوج کشی کا تذکرہ کیا تھا۔ لیکن حیدرآبادی وفد نے اور خصوصاً قاسم رضوی نے اس کو بندر بھبکیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی اور یہ سمجھ لیا کہ کانگریسی لیڈروں کی طرح مونٹ بیٹن نے بھی حیدرآباد کو شرکت پر آمادہ کرنے کے لئے تخویف کا حربہ استعمال کیا ہے۔ لیکن آج

---

[1] The Case of Hyderabad in the U.N.O

سقوط حیدرآباد کے اتنے دنوں کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ مونٹ بیٹن نے ہندوستان
کے عزائم کی کتنی سچی تصویر حیدرآبادی وفد کے سامنے پیش کی تھی اور کس طرح مونٹ بیٹن
کے بیان کا ایک ایک لفظ صحیح ثابت ہوا۔

بہرکیف ۸ و ۹ جون کے مباحث کی روشنی میں مسودہ مذاکرات شراکت ——
(Heads of Agreement) اور نظام کی جانب سے ایک فرمان کا مسودہ
بھی مرتب کیا گیا جن کی منظوری حاصل کرنے کے لئے لائق علی حیدرآباد گئے۔ ۱۲ جون
کو سر والٹر مانکٹن حیدرآباد سے لوٹے اور یہ بیان کیا کہ نظام اور باب حکومت نے مسودات
کو منظور کر لیا ہے بجز دو اہم امور کے جن کے ساتھ چند اور ذیلی چیزوں پر مزید مباحث کئے
جائیں گے۔ امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے متعلق نفاذ قوانین کے حق اور مجوزہ
مجلس دستور ساز میں غیر مسلم اکثریت پر اعتراض کیا گیا اور ان کو اتنی اہمیت دی گئی کہ
گفت و شنید کے انقطاع کے لئے بھی وفد تیار ہو گیا۔ سردار پٹیل نے ترمیمات بالا کو
قبول کرنے سے انکار کیا لیکن مونٹ بیٹن نے اپنے شخصی اثر کو کام میں لا کر اپنی مراجعت
کے پہلے حیدرآباد کے مسئلہ کے تصفیہ کی درخواست کی تو سردار پٹیل بسیج گئے۔ نفاذ
قوانین کے حق کو مسودہ سے خارج کر کے اس کی بجائے ایسے الفاظ بڑھائے گئے کہ اگر
حکومت ہند کے قوانین مناسب مدت میں حیدرآباد کی حکومت نافذ نہ کرے تو نظام
کو فرمان کے ذریعہ ان قوانین کے نفاذ کا اختیار ہوگا۔ مسودۂ فرمان میں دستور ساز اسمبلی
کی تشکیل کا جو حوالہ درج تھا اس کو بھی خارج کیا گیا۔ عارضی حکومت میں ہندو مسلم مساوات
کی بجائے اس جملہ کا اضافہ کیا گیا کہ حیدرآباد کی بڑی سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کے
مشورہ سے عارضی حکومت تشکیل دی جائے گی۔ سر والٹر مانکٹن نے ان ترمیمات
کو قبول کیا اور ۱۳ جون کو ٹیلیفون کے ذریعہ حیدرآبادی وفد کے مابقی ارکان کو دہلی
پہنچنے کی ہدایت کی اور ۱۴ جون کو وفد دہلی پہنچ گیا اور اسی رات مونٹ بیٹن سے

اس کی ملاقات ہوئی۔

یہ بیان کیا گیا کہ حیدرآباد کی جانب سے مزید چار ترمیمات پیش کی گئیں:۔
(۱) امور خارجہ، دفاع اور مواصلات سے متعلق قوانین حیدرآباد میں اس صورت میں نافذ ہوں گے جب پہلے خود ہندوستان میں ان کا نفاذ عمل میں آچکا ہو (۲) بیس ہزار باقاعدہ فوج کے علاوہ مزید ۸ ہزار بے قاعدہ فوج رکھنے کا حیدرآباد کو حق ہوگا۔(۳) رضاکار تنظیم فوری نہیں بلکہ تدریجی طور پر ختم کی جائیگی۔ (۴) مفاجاتی حالات میں حیدرآباد میں فوج رکھنے کے اختیار کو دفعہ ۱۰۲ قانون حکومت ہند کے تابع کیا جائے جس کی رو سے مفاجاتی حالت کا اعلان اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب ہندوستان حالتِ جنگ میں مبتلا ہو یا ملک بدامنی کا شکار رہو۔ اس کے علاوہ لائق علی نے حیدرآباد کے لئے معاشی اور مالیاتی آزادی کا سوال بھی اٹھایا جس کے متعلق مونٹ بیٹن نے بتلایا کہ نہرو کی جانب سے حیدرآباد کے وزیر اعظم کو تحریری طور پر اس امر کا اطمینان دلایا جائے گا کہ اس مسئلہ کے حسن و قبح پر بعد میں غور ہوگا۔ ہندوستان کی کابینہ نے حیدرآباد کی پیش کردہ ساری ترمیمات قبول کریں۔ دوسرے روز یعنی ۱۵ ارجون کو جب مونٹ بیٹن نے حیدرآبادی وفد سے ملاقات کی تو ہندوستانی کابینہ کا فیصلہ وفد کو سُنایا گیا۔ اس نوبت پر لائق علی نے حیدرآباد کی معاشی اور مالیاتی آزادی کا پھر سوال اٹھایا جس کے متعلق یہ جواب دیا گیا کہ ہندوستان کے وزیر مالیات اور دیگر ماہرین اسٹرلنگ بچت (Sterling Balance) کی گفتگو کے سلسلہ میں لندن گئے ہوئے ہیں ان کی واپسی کے بعد ان سے مشورہ کرکے اس مسئلہ کا تصفیہ کیا جائے گا اور فوری طور پر ہندوستان اس کے متعلق کوئی اطمینان نہیں دلا سکتا۔ اجلاس کے اختتام پر لائق علی نے مجوزہ مدات شراکت میں ثالثی کی دفعہ کے اضافہ کی شرط پیش کی جس پر کہا گیا کہ یوں تو معاہدۂ انتظام جاریہ کی ثالثی دفعہ سے کام لیا جاسکتا ہے لیکن مدات شراکت میں جن امور کا تذکرہ

کیا گیا ہے وہ ثالثی کے تابع نہیں ہیں۔

اسی شام لائق علی حیدرآباد واپس لوٹے اور مونٹ بیٹن نے واضح طور پر انھیں بتلا دیا کہ ہندوستان کی حکومت نے حیدرآباد کی پیش کردہ ساری ترمیمات قبول کرلی ہیں اور اب حیدرآباد کی جانب سے مزید کسی ترمیم کا مطالبہ نہ ہوگا۔ حیدرآباد کو یا تو کامل طور پر سمجھوتہ کو قبول یا رد کرنا چاہیئے۔ سر والٹر مانکٹن دہلی ہی میں رک گئے۔

نظام کی جانب سے ۱۶ر جون کو مونٹ بیٹن کے نام ایک تار موصول ہوا جس میں بتلایا گیا کہ ان کی کونسل نے معاہدہ مجوزہ کو قبول کرنے کا مشورہ نہیں دیا ہے اور جب تک حسب ذیل چار نقاط معاہدہ میں شریک نہ کئے جائیں معاہدہ قابل قبول نہ ہوگا:

(۱) دستور ساز اسمبلی کے متعلق مسودہ فرمان میں یہ الفاظ بڑھائے جائیں "کہ فرقہ جات کے تناسب کی بنیاد وہ ہوگی جو میں بعد میں طے کروں گا"۔

(۲) عارضی حکومت کے متعلق الفاظ "بڑی سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کے مشورہ سے" حذف کئے جائیں۔ نظام نے توجیہ یہ پیش کی کہ مونٹ بیٹن سے ملاقات کے خاتمہ کے بعد جب مسودات کی نقول لائق علی کو دی گئیں ان میں یہ الفاظ بڑھادئے گئے تھے جن کا حیدرآباد واپس ہونے کے بعد لائق علی کو علم ہوا۔

(۳) معاہدہ میں حیدرآباد کی معاشی اور مالیاتی آزادی کی دفعہ شامل کی جائے۔

(۴) ثالثی کی دفعہ کا بھی اضافہ کیا جائے۔

مونٹ بیٹن نے اس تار کا ایک تفصیلی جواب سر والٹر مانکٹن کے ذریعہ حیدرآباد روانہ کیا جس میں انھوں نے بتلایا:

"مجھے آپ کا ۱۶ر جون کا تار وصول ہوا اور اس میں جن کلمات تحسین کا اظہار کیا گیا ہے اس کے لئے میں آپ کا شکر گذار ہوں۔

میں نے اس امر کو نوٹ کیا کہ آپ کی کونسل نے مسودہ فرمان اور یادداشت مفاہمت

کو قبول نہ کرنے کا آپ کو مشورہ دیا ہے ۔ ان کو یقینی طور پر اپنی مرضی کے مطابق یور اگزالٹیڈ ہائینس کو مشورہ دینے کا اختیار حاصل ہے ۔ لیکن مجھے بڑا تعجب ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ساری دنیا کو تعجب ہوگا کہ آپ کی کونسل نے کن جائز غیر معیوب امور کو انکار کا موضوع قرار دیا ہے ۔

پہلی چیز اور آپ کے تار کے بموجب سب سے زیادہ سنگین جس پر آپ کی کونسل بظاہر گفت و شنید کو منقطع کرنے اور اس کے نتیجہ میں انسانی جان و مال کی تباہی کو برداشت کرنے پر مائل نظر آتی ہے وہ فرمان کے فقرہ (۲) کے ذیلی دفعہ (۱) میں الفاظ " ایسی بنیاد پر جو بعد میں میں طے کروں گا " کے اضافہ کے متعلق ہے ۔ میں اس امر کے سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں کہ آپ کی کونسل اپنے کسی ذہنی عمل کے تحت اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ انقطاع گفتگو کا دارومدار اسی فقرہ پر ہے یہ واقعہ کہ دستور ساز اسمبلی کی بنیاد کا بعد میں تصفیہ ہونے والا ہے فرمان میں اس بنیاد کا تذکرہ نہ ہونے سے خود ظاہر ہے ۔ آپ کی کونسل کے خیال کے بموجب ان الفاظ کے اضافہ کو میں قطعاً غیر ضروری سمجھتا ہوں اور اس کو " مادی تبدیلی " قرار دینا مضحکہ خیز ہے ۔ علاوہ ازیں یہ کہنا غیر صحیح ہے کہ ان الفاظ کے اضافہ پر اتفاق کیا گیا تھا ۔ دوشنبہ ۱۴ ؍ جون کی دوپہر کو آپ کے وزیر اعظم نے ایک جملہ کے اضافہ کی تحریک کی تھی جس میں نہ صرف یہ بلکہ اور بھی الفاظ تھے لیکن بحث کے بعد انھوں نے اپنی استدعا کو واپس لے لیا تھا اور بالآخر اس فقرہ کو بغیر کسی ترمیم کے باقی رکھنے پر تصفیہ ہوگیا تھا ۔

دوسرا اعتراض آپ کی کونسل نے فرمان کے ذیلی فقرہ (۲) کے الفاظ میں تبدیلی کے متعلق کیا ہے ۔ آپ کے تار سے جو مطلب میں نے نکالا ہے یہ ہے کہ آپ کے وزیر اعظم نے آپ کو یہ اطلاع دی کہ تبدیلی فرمان کی اُس آخری کاپی میں کی گئی جو

کانفرنس کے دوران (نہ کہ اس کے اختتام کے بعد جیسا آپ بیان فرماتے ہیں) اُن کے حوالہ کی گئی تھی جو میرے اور حیدرآبادی وفد کے دیگر امکان کے مابین سہ شنبہ بتاریخ ۱۵ر جون منعقد ہوئی تھی اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ دوشنبہ ۱۴ر کی صبح اول وقت سر والٹر مانکٹن کے علم میں یہ تبدیلی آگئی تھی اور اسی روز انھوں نے آپ کے وزیر اعظم کو اس تبدیلی کی وجوہات سے آگاہ کر دیا تھا۔ میں نہیں سمجھتا آپ اس سے یہ نتیجہ نکالیں گے کہ جس تبدیلی کی اطلاع سر والٹر مانکٹن کو دی گئی تھی اس کو عمداً انھوں نے یا ہم نے آپ کے وفد یا وزیر اعظم سے چھپا رکھی۔ میں کسی صورت میں یہ باور نہیں کر سکتا کہ الفاظ کی ایسی کسی تبدیلی کو آپ گفتگو کا ٹوٹنا قرار دیتے ہیں۔ جس کے بعد دونوں حکومتوں کے درمیان گفت و شنید کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ زیادہ سے زیادہ اس کو غلط فہمی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے قبل آپ نے سر والٹر مانکٹن سے بھی اس کے متعلق استمزاج کیا ہے۔

جہاں تک تیسرے اعتراض کا تعلق ہے جس کو بنیاد بنا کر آپ کی کونسل نے آپ کو معاہدہ کو نامنظور کرنے کا مشورہ دیا ہے یعنی آپ کا تجارتی، معاشی اور مالی امور میں آزادی کا مطالبہ' اس کے متعلق آپ کے وزیر اعظم نے شاید آپ کو نہیں بتلایا کہ کس طرح میں نے انھیں یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ فی الوقت اس مسئلہ پر حکومت ہند کی غیر مشروط منظوری حاصل کرنا عملاً ناممکن ہے بالخصوص اس وجہ سے کہ اس وقت وزیر فینانس اور دیگر ماہرین لندن میں ہیں۔ آپ کے وزیر اعظم نے آپ کو یہ بھی نہیں بتلایا ہوگا کہ انھوں نے سہ شنبہ ۱۵ر جون کی صبح تک مجھ سے اس کی اہمیت کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ اس وقت تک اس مسئلہ کو ایک فٹ نوٹ (Foot note) کے تحت رکھا گیا تھا اور انھوں نے اس کے

قبل کبھی اور طرح اس مسئلہ کے تصفیہ پر اصرار بھی نہیں کیا۔ اگر یور اگزالٹیڈ ہائینس
کا یہ خیال ہے کہ اس مسئلہ کی حد تک حکومتِ ہند پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تو مجھے
آپ سے یہ اقرار کرنا چاہیئے کہ اُس باہمی اعتماد کے حاصل کرنے کی اب کوئی اُمید
باقی نہیں رہی جس کے بغیر کسی معاہدہ پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔

چوتھا اعتراض جو آپ کی کونسل نے گفتگو کی انقطاع کے لئے پیش کیا ہے
وہ ثالثی کی دفعہ کی عدم موجودگی سے متعلق ہے۔ انھوں نے بظاہر آپ کو صحیح
طور پر مطلع کیا ہے کہ معاہدۂ انتظام جاریہ میں ثالثی کی جو دفعہ موجود ہے وہ سارے
موجودہ انتظامات اور معاہدات پر حاوی ہے۔ شخصی طور پر میں اپنے ذہن میں
موجودہ مدات معاہدہ کے تحت ایک بھی ایسے معاملہ کا تصور نہیں کرسکتا جس
میں ثالثی کی ضرورت محسوس ہو۔ علاوہ ازیں جب آپ کے وفد کے ارکان سے
کسی ایسی مفروضہ صورت کو پیش کرنے کہا گیا تو کافی غور کرنے کے بعد بھی وہ ایسی
کوئی مثال پیش نہ کرسکے۔ گفت وشنید کو اس وجہ سے منقطع کرنا کہ ثالثی کی دفعہ کا
پورے معاہدہ کی بجائے اس کی چند شرائط پر اطلاق ہوتا ہے' اس حقیقت کو نظرانداز
کرنے کے مرادف معلوم ہوتا ہے کہ: (الف) ثالثی کی دفعہ کو بہرصورت معاہدہ کی
شرائط کے چند دفعات سے متعلق کرنا نامناسب ہے' جیسا کہ آپ کے وفد نے بھی تسلیم
کیا ہے اور (ب) اس قسم کے معاہدات کی صحیح تعمیل میں جن پر خوشدلی سے عمل پیرا
ہونے کی ضرورت ہوتی ہے ثالثی بالعموم ایک غیر اطمینان بخش اور غیر مؤثر طریقۂ کار ہے۔

آخر میں میں یہ باور نہیں کرسکتا کہ ان چار وجوہات کی بناء پر جن کو آپ نے
اپنی کونسل کی جانب سے پیش ہونا بیان فرمایا ہے یور اگزالٹیڈ ہائینس کا ارادہ
اس معاہدہ کو رد کرنے کا ہے جس پر اتنا زیادہ وقت اور محنت صرف ہوئی ہے۔
اگر آپ نے قطعی ارادہ کرلیا ہے تو میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ دنیا آپ کی کونسل

کی پیش کردہ وجوہات کو لیت ولعل اور حیلہ بازی سے تعبیر کرے گی تاکہ معاہدہ کی دیگر شرائط جیسے رضاکاروں کی تحلیل' پر عمل کرنے سے گریز کیا جائے۔"

یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۷ر جون کی دوپہر مونٹ بیٹن کو حیدرآباد سے سر والٹر مانکٹن کا یہ ٹیلیفونی پیام ملا کہ "ہم ڈوب گئے"۔ اسی شام مونٹ بیٹن کو نظام کا ایک تفصیلی تار بھی ملا جو درج ذیل کیا جاتا ہے :-

"جیسا یور اکسلنسی کو علم ہے سر والٹر مانکٹن دہلی سے ذریعہ طیارہ رات پہنچے اور آج صبح ... وہ مجھ سے ملے۔ انھوں نے مجھے مطمئن کیا ہے کہ مسودہ فرمان میں وہ تبدیلیاں جن کا حوالہ میں نے اپنے تار مورخہ ۱۶ر جون میں دیا ہے' ان مسودات میں موجود تھیں جو انھوں نے دوشنبہ بتاریخ ۱۴ر جون ملاحظہ کئے تھے اور وہ سمجھتے ہیں کہ میرے وزیر اعظم کو یہ نقول اسی دن دوپہر کو وصول ہو گئی تھیں۔ ان حالات میں اپنی پہلی فرصت میں میں اپنے تار سے پیدا شدہ اثرات کی اصلاح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے نمائندوں کو آخر وقت تک ان تبدیلیوں کا علم نہیں کرایا گیا تھا۔ چونکہ دونوں فریقین کی جانب سے متعدد مسودات تیار کئے گئے تھے اور میرے وفد کے ارکان یور اکسلنسی اور آپ کی حکومت کے متعدد نمائندوں سے مباحث میں مسلسل مصروف رہے اس لئے اس معاملہ میں غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان تھا۔ میں نے اپنا تار اس وقت روانہ کیا تھا جب سر والٹر مانکٹن دہلی میں تھے اگر وہ یہاں ہوتے تو یہ غلطی پیدا نہیں ہوتی۔

اس میں شک نہیں کہ گفت و شنید نے طوالت اختیار کی ہے اور ہم سب آخری سمجھوتہ پر پہنچنا چاہتے ہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ دو ایک روز میں اس کا تکمیل پانا ناممکن ہے۔ اکثر اہم معاملات میں سمجھوتے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں لیکن اب بھی ایسے سوالات ہیں کہ آخری نتیجہ پر پہنچنے کے قبل ان کا

تصفیہ پانا باقی ہے۔ بلاشبہ فرمان کے صحیح الفاظ کیا ہونا چاہیئے اس پر ہم
متفق ہو سکتے ہیں لیکن مالیاتی آزادی اور حیدرآباد کی سمندر پار برآمدی تجارت
پر کنٹرول کو ہندوستان نے اصول کی حد تک بھی تسلیم کرنے سے جو انکار کیا ہے
اس پر میری کونسل کو بڑی تشویش ہے۔ میرے وزیر اعظم نے بہت پہلے پنڈت نہرو
اور آپ سے مباحث کے وقت اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اس کے
بعد اس معاملہ کو عملی صورت دینے کے لئے مسٹر منن کو ایک مسودہ بھی دیا گیا تھا۔
میں جانتا ہوں کہ یہ مسئلہ ایسا ہے جس پر تفصیلی چھان بین کی ضرورت ہے لیکن
میں تو اصول کی حد تک اس کی قبولیت چاہتا ہوں۔ علاوہ ازیں میری کونسل
مجھے یہ مشورہ دینے کے موقف میں نہیں ہے کہ مفاجاتی حالات میں جس کا جب
بھی ہندوستان کی جانب سے اعلان ہوگا حیدرآباد کے سرحدی علاقوں کے
سوا ہندوستانی فوج کو پڑاؤ کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ میں کسی بھی شدید
مفاجاتی حالت میں ہمیشہ تعاون کے لئے تیار رہوں۔ پھر ثالثی کا مسئلہ بھی ہے جس
کا میں نے اپنے گذشتہ تار میں حوالہ دیا ہے۔

چونکہ ان وجوہات کی بنا پر مسودات کو ان کی موجودہ صورت میں میں قبول
نہیں کر سکتا میری مخلصانہ توقع ہے کہ گفت وشنید کو جاری رکھا جائے تاکہ بہت
ہی قلیل مدت میں سمجھوتہ کی تکمیل ہو جائے۔ حیدرآباد ایک خوش آئند سمجھوتہ پر پہنچنے
میں یور اکسلنسی کی آمادگی کا ہمیشہ ممنون رہے گا جس کے لئے ہم ہمیشہ شکر گذار رہیں گے"

۱۷ کی شام پنڈت نہرو نے ایک پریس کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے بتلایا کہ ہندوستان
اب حیدرآباد سے مزید گفت وشنید کے موقف میں نہیں ہے۔ جو معاہدہ طے ہوا ہے
اس سے ہندوستان سرمو ہٹنے تیار نہیں ہے اور اب نظام ان تجاویز کو جب چاہیں
قبول کر سکتے ہیں۔

معاہدہ کی یہ ساری تفصیلات وی پی منن کی کتاب سے ماخوذ ہیں۔ وی پی منن کے بیان کردہ واقعات کی تصدیق کیمبل جانسن کی کتاب سے بھی ہوتی ہے لیکن اس کی کوئی تفصیل یا تاویل اقوام متحدہ کے حیدرآبادی وفد کی جانب سے شائع کردہ کتاب میں نہیں بتلائی گئی ہے۔ البتہ لائق علی نے اپنی کتاب میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ گفت و شنید سے لائق علی کا جو تعلق رہا ہے اس پر آئندہ باب میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

گفت و شنید کے اُن ایام میں جبکہ واقعات برق رفتاری سے وقوع پذیر ہو رہے تھے، صبح کی حالت شام کو باقی نہیں رہتی تھی اخبارات میں یہ تفصیلات شائع نہیں ہوتی تھیں اور بجز معتدد لوگوں کے جنھیں گفت و شنید سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق تھا عام لوگ ان چیزوں سے مطلق واقف نہ تھے۔ وہ تو صرف قائدین اور ان کے بیانات پر تکیہ کئے ہوئے تھے۔ آج پندرہ سال گذرنے کے بعد جب ان واقعات کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو کہنا پڑتا ہے کہ حیدرآباد کے قائدین اور وہ لوگ جو گفت و شنید میں حصہ لے رہے تھے، سیاست سے کتنے دور اور زمانہ کی رو سے کس قدر ناواقف تھے، انھیں نتائج و عواقب کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ جن چار امور کی وجہ سے معاہدہ کا انقطاع عمل میں آیا وہ اتنے فروعی اور معمولی تھے کہ ان کی بنا پر گفتگو کو منقطع نہیں کیا جاسکتا تھا اس کے باوجود یہ کہا جاتا ہے کہ ۱۶ رجون کے معاہدہ کو قاسم رضوی قبول کرنے مائل ہوگئے تھے لیکن اتحادی وزراء میں ایک وزیر نے جن کو کونسل میں لینے سے لائق علی نے انکار کیا تھا، تارپیڈو مارا جس سے حیدرآباد کی بساط سیاست ہی الٹ گئی۔

فروعی مسائل کو چھوڑ کر جنھیں دانستہ گفت و شنید کی انقطاع کی بنیاد بنایا گیا اگر اصل معاہدہ کے مضمرات پر غور کیا جائے تو مترشح ہوتا ہے کہ معاہدۂ انتظام جاریہ سے بھی یہ گرا ہوا معاہدہ تھا۔ شرکت سے بچنے کے لئے اس معاہدہ کے ذریعہ ہندوستان کی پیرامونٹسی کو اپنے اوپر مسلط کر لیا گیا تھا۔ عارضی حکومت اور دستور ساز اسمبلی کو

قبول کرکے صرف عبوری دور کی حد تک مسلمانوں کی مقتدر حیثیت کو (۴۰) فیصد کے
اقلیتی تناسب میں تبدیل کرنے پر آمادگی ظاہر کی گئی تھی۔ امور خارجہ، دفاع، مواصلات
اور ان امور سے متعلق نفاذ قوانین کے اختیار کو ہندوستان کے سپرد کرکے ذمہ دارانہ
حکومت کو قبول کرلیا گیا تھا۔ اگر ان امور یا ان میں سے کسی جزو کے متعلق اعتراض کرکے
انھیں انقطاع معاہدہ کی بنیاد قرار دیا جاتا تو یقیناً یہ کہا جاتا کہ حیدرآباد کی آزادی
کے تحفظ کی کوشش کی گئی۔ لیکن معاہدہ ٹوٹا ہے ایسے لایعنی اور فروعی سوالات پر
جو نہ صرف مضحکہ خیز ہیں بلکہ جنھوں نے ان اعتراض کرنے والوں کو بھی مورد تمسخر بنادیا ہے۔

استصواب کے مسئلہ کو اس طرح اٹھایا گیا جیسے حیدرآباد نے تدبر کا کوئی قلعہ فتح
کرلیا۔ قاسم رضوی کو شاید یہ خیال ہوا کہ پست اقوام اور لنگایت اونچی ذات کے
ہندوؤں کے خلاف جاکر مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔ یہ بڑی خودفریبی تھی۔ مجھے
یاد ہے کہ مجلس کے چند سربرآوردہ ارکان کو یامین زبیری کی وزارتی کوٹھی پر جمع
کرکے تدبر کے اس شہکار کو قاسم رضوی نے ان کے سامنے پیش کیا تھا جس کی سب
نے بجز ارکان عاملہ کے مخالفت کی تھی[1] لیکن اس کے باوجود استصواب کی پیشکش
کی گئی۔ استصواب کسی غیرجانبدار ادارہ کے ذریعہ منعقد ہوتا ہے، اور اس کے قبل
ملک کی فضا کو دہشت اور فسادات پاک کیا جاتا ہے لیکن قاسم رضوی نے غالباً
یہ سمجھ رکھا تھا کہ استصواب کا انعقاد شاید اتحاد المسلمین کے رضاکاروں کی نگرانی
میں عمل میں آئے گا۔ اور ان کے ڈر سے ہندوؤں کی آزاد رائے کو متاثر کیا جاسکیگا۔

مستقل معاہدہ کی گفت وشنید کے دوران میں مونٹ بیٹن کو باوجود ان
دستوری تحدیدات کے جو بحیثیت گورنر جنرل اس پر عاید تھے، حیدرآباد کے نازک موقف
کا شدید احساس تھا۔ برطانوی حکومت نے حیدرآباد کو جس طرح دھوکا دیا تھا اس

---

[1] مصنف نے بھی خلاف رائے دی تھی۔

کا بھی انھیں علم تھا اور ہندوستان کی کانگریسی حکومت کی حیدرآباد کے خلاف معاندانہ روش سے بھی وہ بخوبی واقف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے عہدہ کے اختتام کے پہلے وہ حیدرآباد کے مسئلہ کا تصفیہ کرکے ہندوستان سے رخصت ہونا چاہتے تھے۔ اتفاق سے پھر سر والٹر مانکٹن کی خدمات سے استفادہ کا بھی موقع مل گیا تھا۔ لیکن قضا و قدر کو یہ منظور نہ تھا کہ مونٹ بیٹن کے سر حیدرآباد کے تصفیہ کا سہرا رہے۔ اس طرح مونٹ بیٹن کے عہدہ کے اختتام کے تین دن پہلے ہندوستان اور حیدرآباد کی گفت و شنید حیدرآبادی وفد کی غیر مفاہمانہ طرز کی وجہ سے ٹوٹ گئی۔ مونٹ بیٹن ۲۱ جون کو انگلستان روانہ ہوئے۔

گفت و شنید کی ساری تفصیلات کو سامنے رکھکر قاسم رضوی کے اس بیان کو پڑھا جائے :-

"ہمارا وفد جب بحث و مباحثہ کرکے مسائل پر غور کرنے کے لئے دستاویز لاتا اور پھر واپس جاتا تو اس کو نئی شرائط دی جاتیں اور ہمارے لئے مفید شرائط کو گھٹایا جاتا ..... ہندوستان نے مفاہمت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی اور ہم نے اس کو جلاکر خاکستر کر دیا۔"

لائق علی نے بھی اپنی کتاب میں ہندوستان پر یہی الزام عاید کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن واقعات کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے سے اس امر کا اظہار ہو جاتا ہے کہ دونوں فریقوں میں سے زیادہ موردِ الزام کون ہے؟

۱۴

لائق علی کا گفت و شنید سے تعلق

تقسیم ہند کے منصوبہ کے اعلان کے بعد ہی ۱۹۴۷ء میں نواب چھتاری کی وزارت
عظمیٰ کے زمانہ میں حکومت ہند سے گفت و شنید کے لئے کونسل کے ارکان پر مشتمل ایک
کمیٹی ترتیب دی گئی تھی جس کے ارکان نواب چھتاری، علی یاور جنگ، عبدالرحیم اور پنگل
وینکٹ راما ریڈی اور سر والٹر مانکٹن اس کے مشیر تھے۔ جب علی یاور جنگ سے امور دستوری
کا قلمدان لے کر معین نواز جنگ کے حوالہ کیا گیا تو اول الذکر کا تعلق اس کمیٹی سے باقی نہ
رہا۔ معاہدۂ انتظام جاریہ کے عین ماقبل زمانہ میں جو وفد تشکیل پایا تھا اس میں چھتاری
کے سوا کونسل کے کسی بھی رکن کو شامل نہیں کیا گیا تھا اور اس کے ارکان چھتاری کے
علاوہ سر سلطان احمد، علی نواز جنگ اور اس کے مشیر سر والٹر مانکٹن تھے۔ لیکن اس کے
باوجود کمیٹی تحلیل نہیں ہوئی تھی اور آخر وقت تک کام کرتی رہی۔

لائق علی کے صدر اعظم مقرر ہونے کے بعد اس کمیٹی کی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں
لیکن اس کے ارکان کو یہ شکایت تھی کہ لائق علی نے کبھی ان کو اعتماد میں لیا اور نہ گفت و
شنید کے مختلف مراحل سے ان کو واقف رکھا بلکہ خود گفت و شنید کی ذمہ داری اپنے
سر لے لی۔ چنانچہ جب پہلی مرتبہ لائق علی ۲ مارچ ۱۹۴۸ء کو گفت و شنید کے سربراہ کی
حیثیت سے دہلی پہنچے تو ان کے ساتھ صرف ان کے بہنوئی معین نواز جنگ تھے۔ معاہدہ
کی گفتگو کے قبل مونٹ بیٹن نے پاکستان کو بیس کروڑ کی امانتی کفالتوں کے دئیے جانے

اس کے دوسرے ہی روز لائق علی نے حیدرآباد کی مجلس مقننہ میں ان الزامات کی تردید کرتے ہوئے مفاہمت اور دوستی کی پیشکش کی اور آخر میں حیدرآباد کے اس عزم کا اظہار کیا کہ اگر ہندوستان جنگ کرنے ہی پر آمادہ ہے تو باوجود اس کے کہ فوجی لحاظ سے حیدرآباد کا ہندوستان سے کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا، تاہم جو بھی مقاومت ہو سکتی ہے حیدرآباد کی جانب سے کی جائے گی۔ نہرو کی جانب سے مسلسل حیدرآباد کے خلاف بیان بازی، تشدد اور دھمکیوں کا اظہار ہوتا رہا۔

ماہ مئی کے اوائل میں مونٹ بیٹن نے نظام کو دہلی آنے کے لئے ایک شخصی دعوت نامہ روانہ کیا۔ نظام نے اپنی مجبوریوں کا اظہار کرتے ہوئے خود مونٹ بیٹن کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی۔ مونٹ بیٹن نے اپنے پریس اتاشی کیمبل جانسن کو روانہ کیا جس نے نظام اور حیدرآباد کے مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندوں سے ملاقات کی۔ عام طور پر یہ خیال تھا کہ نظام اپنی حکومت کے ہاتھوں بے بس ہیں لیکن نظام سے اپنے نمائندے کی ملاقات کے بعد مونٹ بیٹن کو بھی اندازہ ہو گیا کہ حیدرآباد کے اقتدار کی باگ ڈور نظام ہی کے ہاتھ میں ہے اور حکومت حیدرآباد ان کی مرضی اور ایما پر کام کرتی ہے۔

حکومتِ ہند نے وسط ماہ مئی میں حیدرآباد کے اُس خط کا جواب دیا جو لائق علی نے ۵ راپریل کو لکھا تھا کہ معاہدۂ عارضی کی خلاف ورزیوں کا تصفیہ ثالثی کے سپرد کیا جائے۔ جواب میں حکومتِ ہند نے حسب عادتِ قدیم حیدرآباد پر اتہامات کا دفتر کھول دیا۔ نہ صرف ثالثی سے انکار کیا بلکہ عدم شرکت اور ذمہ دارانہ حکومت قائم نہ کرنے کی بھی شکایت کی۔

مونٹ بیٹن کی میعاد ملازمت قریب الختم تھی اور حیدرآباد کو نزاع کے منصفانہ تصفیہ کی خواہش تھی۔ چنانچہ ۲۳ رمئی کو لائق علی دہلی پہنچے اور ۲۵ رکو گفتگو ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ

مونٹ بیٹن نے دونوں ملکوں میں باعزت سمجھوتہ ہونے پر زور دیا اور بتلایا کہ اگر ان کی موجودگی میں یہ نہ ہوسکا تو حیدرآباد کو خون خرابے کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ ہندوستانی لیڈر حیدرآباد پر فوجی حملہ کا منصوبہ بنا چکے ہیں، عالمی رائے کو اپنے موافق بنانے کے لئے وہ کافی پروپیگنڈہ کریں گے، اقوام متحدہ کی رکینیت کی وجہ سے ہندوستان کی اہمیت زیادہ ہے اور حیدرآباد کا مقدمہ قانونی اور اخلاقی حیثیت سے کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو صیانتی کونسل کے اس مسئلہ میں دخیل ہونے کے قبل ہی حیدرآباد کی قسمت پر مہر لگ جائے گی۔ پھر فوجی حملہ کی تباہ کاریوں کا مونٹ بیٹن نے نقشہ کھینچا کہ کس طرح ہندوستانی دبابے حیدرآبادی علاقوں کو روندتے ہوئے گذریں گے اور حیدرآبادی فوج اپنی رائفلوں سے ان کا بال بیکا نہ کرسکے گی۔ اس نے پیش گوئی کی کہ نظام ہندوستان کے ہاتھ میں قیدی بن جائیں گے اور حیدرآباد کے وزیر اعظم اور ان کے ساتھی وزرا کو سب سے پہلے گولی مار کر ہلاک کردیا جائے گا۔

مستقل معاہدہ کی شرائط پر گفتگو سے ایک روز قبل ہی مونٹ بیٹن نے لائق علی کے دل و دماغ پر اپنی تلخ گفتگو سے ایسا نفسیاتی اثر ڈالا کہ عارضی طور پر ان کا دماغ ماؤف سا ہوگیا تھا۔ بہرکیف اس پس منظر میں جو گفتگو ہوئی اور جو شرائط طے پائیں وہ لائق علی کے بموجب حسب ذیل تھیں :-

(۱) دفاع اور امور خارجہ میں متوازی قانون سازی پر لائق علی نے غور کرنے کا وعدہ کیا۔

(۲) دفاع، امور خارجہ اور مواصلات پر ہندوستانی قوانین کے مماثل حیدرآباد میں قانون نافذ کرنے پر لائق علی نے آمادگی کا اظہار کیا۔

(۳) حیدرآباد کے افواج باقاعدہ کی تعداد بیس ہزار اور بے قاعدہ کی آٹھ ہزار ہوگی۔

(۴) مذکورہ شرائط کی نظام سے قبولیت کی سفارش کرنے کی ذمہ داری لائق علی نے اسی صورت میں قبول کی جبکہ حیدرآباد کا معاشی اور اندرونی استحکام متاثر نہ ہو

اور اندرونی اور بیرونی تجارت، کرنسی اور مالی امور میں حیدرآباد کو کامل آزادی کی ضمانت دی جائے۔

(۵) ایک مشکل سوال حکومت حیدرآباد کی موجودہ ہیئت کا تھا جس کے متعلق یہ طے کیا گیا کہ ہندو اور مسلم ارکان کی مساوی تعداد پر حکومت تشکیل دی جائے گی۔

ان شرائط پر نظام کی منظوری ضروری تھی اس لئے آئندہ کے لئے گفتگو ملتوی کی گئی۔

لائق علی نے اپنی کتاب میں استصواب پر ایک مکمل باب قائم کیا ہے اور حکومت ہند کے سامنے اس پر اپنی آمادگی کو بالکل غیر متوقع بتلایا ہے۔ یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ مسئلہ مونٹ بیٹن کی جانب سے ان کے سامنے ایسا اچانک پیش ہوا کہ قبل از قبل انھوں نے نظام سے یا اپنی حکومت سے منظوری حاصل نہیں کی تھی اور نہ اتنا وقت تھا لیکن چونکہ دنیا میں استصواب رائے عامہ معلوم کرنے کا ایک مسلمہ اصول اور منصفانہ طریقۂ عمل ہے اس لئے وہ اس کے لئے آمادہ ہوگئے۔ اس میں شک نہیں کہ لائق علی نے اس مسئلہ کو اپنی کابینہ میں پیش ہی نہیں کیا تھا اور نہ قاسم رضوی سے اس کی منظوری حاصل کرنے کے بعد اس کی انھیں ضرورت تھی۔ ہم نے باب ما سبق میں استصواب کے متعلق یامین زبیری کی وزارتی کوٹھی پر ارکان اتحاد المسلمین کے ایک اجتماع کا تذکرہ کیا ہے جس کے سامنے قاسم رضوی نے استصواب کا مسئلہ رکھا تھا۔ اجلاس سے اُٹھکر وہ سیدھے لائق علی کے پاس پہنچے تھے جو طیران گاہ جانے کے قبل قاسم رضوی سے ہدایات حاصل کرنے کے لئے ان کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ قاسم رضوی نے استصواب سے متعلق اپنی رضامندی کا اظہار لائق علی پر بہر حال کر دیا تھا۔

اس مرتبہ لائق علی ۷ر جون کو مانکٹن، ریڈی اور رؤف کے ہمراہ دہلی پہنچے۔ مؤخر الذکر پہلی مرتبہ گفت و شنید سے متعلق کئے گئے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ استصواب پر گفتگو کے وقت بجز مونٹ بیٹن اور لائق علی کے کوئی دوسرا رکن وفد

موجود نہیں تھا۔ اس تصور میں کہ حیدرآباد کی ۸۵ فیصد آبادی ہندوؤں پر مشتمل ہے مونٹ بیٹن نے استصواب کا مسئلہ اس انداز میں پیش کیا جیسے لائق علی اس کے لئے کبھی تیار نہ ہوں گے لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ قاسم رضوی نے انھیں قبل از قبل قبولیت کا مشورہ دے کر ہندوستان کے ساتھ ایک شاطرانہ چال چلنے کا منصوبہ باندھا تھا لائق علی نے استصواب کے انعقاد پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ اس پر مونٹ بیٹن سکتے میں آگیا اور یہ کہا کہ حکومت ہند سے اس نے اس مسئلہ میں کوئی ہدایات حاصل نہیں کی ہیں لیکن چونکہ استصواب جمہوریت کا ایک بنیادی اصول ہے اس لئے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا اپنے کانفرنس سکریٹری کو طلب کر کے مونٹ بیٹن نے جلسہ کی روئداد لکھائی جس کو لائق علی نے پورا کا پورا اپنی کتاب میں یہ کہکر نقل کیا ہے کہ روئداد کا مسودہ مونٹ بیٹن کے معتمدِ خاص کا لکھا ہوا ہے۔

شرائط کا خلاصہ ملاحظہ ہو :۔

(۱) استصواب اس امر کا آیا حیدرآباد ہندوستان میں شرکت کرے یا آزاد رہے

(۲) ایک طویل المیعاد سمجھوتہ کی حیثیت سے استصواب سے جو بھی فائدہ حاصل ہو وہ اس وقت تک مفید نہیں ہو سکتا جب تک ہندوستان اور حیدرآباد میں پوری طور پر خوشدلانہ تعلقات بحال نہ ہوں۔ اس لئے صرف ایک ہی بنیاد ہے جس پر کام ہو سکتا ہے اور وہ ایک عارضی سمجھوتہ ہے جو دوستی کو بحال کرنے کے لئے منعقد ہونا چاہیئے۔

(۳) ایسے عارضی سمجھوتہ کی کامیابی کے لئے ہندوستان کی جانب سے امورِ ذیل انجام دئے جا سکتے ہیں۔

الف :۔ بعض عہدہ داروں کا تبادل۔

ب ۔ گورنر جنرل کا حیدر آباد جانا۔

ج ۔ نام نہاد ناکہ بندی کا خاتمہ اور فوری طور پر حیدر آباد مال کا روانہ ہونا۔

(۴) حیدر آباد کی جانب سے اس عارضی سمجھوتہ کو کامیاب بنانے اور آپس کے تعلقات کو بہتر شکل دینے کے لئے اہم قدم یہ اٹھایا جائے گا کہ مساوات کی بنیاد پر نئی حکومت تشکیل دی جائے گی ۔ یہ تسلیم کیا گیا کہ مساوات کے لئے حکومت ہند کو اعتراض ہوگا لیکن حیدر آباد کے لئے اس سے آگے جانا ممکن نہیں ہے ۔

(۵) نئی حکومت میں ۱۲ یا ۱۰ ارکان ہوں گے جن میں سے نصف بشمول وزیر اعظم بڑے فرقے کے ہوں گے ۔ قلمدانوں کی صحیح تقسیم ہوگی ۔

(۶) دو یا تین ماہ کے اندر مساوات کی بنیاد پر مجلس دستور ساز قائم کی جائیگی ۔

(۷) موجودہ مجلس مقننہ کو دستور ساز اسمبلی کے قیام تک طلب نہیں کیا جائے گا ۔

(۸) استصواب کی نگرانی کسی بیرونی ادارہ کے ذمہ کیا جائے گا ۔ اقوام متحدہ نامناسب ہے ۔ دوسرے امکانات یہ تھے ۔ (الف) دولت عامہ (ب) عالمی عدالت کے ججوں کی جماعت (ج) سوئٹزرلینڈ یا سوئیڈن جیسے غیر جانبدار ملک سے کوئی کمیشن ۔

(۹) استصواب کی تیاری کے لئے آزادئ تقریر، پریس اور ساری جماعتوں کو ریڈیو کے استعمال کی سہولت ۔ کوئی حکومت یا حکومت کا امدادی ادارہ استصواب کے قبل فراہمی آراء کے لئے رقم صرف نہیں کرے گا نہ رشوت دے گا ۔ نہ بیرون ریاست کے کسی ادارہ یا جماعت کو دخل دینے کا حق ہوگا۔

اگر حقیقتاً مونٹ بیٹن اور لائق علی کے درمیان گفتگو کے بعد ایسی کوئی روداد مرتب ہوئی تھی جس کو غلط باور کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تو یہ یقیناً لائق علی کی بڑی کامیابی تھی لیکن چونکہ مونٹ بیٹن کی یہ ایک شخصی کوشش تھی اور حکومت ہند

کی منظوری اس میں شامل نہ تھی اس لئے تاوقتیکہ مؤخرالذکر اس کو منظور نہ کرلے اس سمجھوتہ
کو وہ اہمیت نہیں دی جاسکتی جس کا وہ مستحق تھا۔ حیدرآباد کے نقطۂ نظر سے ان شرائط کا
سب سے خوش آئند پہلو وہ تھا کہ اس میں رضا کار تنظیم کی تحلیل کا تذکرہ کہیں نہیں کیا گیا
حالانکہ حکومت ہند ہمیشہ اس کو برخواست کرانے کے درپے رہی ہے۔

بہرکیف اس سمجھوتہ کے ساتھ ہندوستانی زعما کو جو سلوک کرنا چاہیئے تھا انھوں نے
کیا اور یہ صاف کہدیا کہ حکومتِ ہند استصواب پر اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی اور اگر
حیدرآباد کو اس پر اصرار ہے تو پہلے شرکت قبول کرلی جائے اور بعد میں اس کے متعلق لوگوں
کی رائے معلوم کی جائے۔

علاوہ ازیں استصواب کا مسئلہ ضمنی طور پر پیدا ہوگیا تھا اصل شرائط تو وہ تھیں جو
ماہ مئی کے اواخر میں لائق علی نظام کی منظوری کے لئے حیدرآباد لے گئے تھے اور جن پر
۹ رجون کو دہلی میں مونٹ بیٹن سے بحث ہوئی۔ منن نے حکومت ہند کی جانب سے چار
شرائط پیش کیں۔

(۱) دفاع، امور خارجیہ اور مواصلات کی حد تک حیدرآباد فوری طور پر معناً شرکت
قبول کرلے۔ اور ان تینوں امور پر ہندوستان کو قانون سازی کا اختیار دیا جائے۔

(۲) حیدرآباد میں فوری طور پر ذمہ دارانہ حکومت قائم کی جائے۔

(۳) فوری طور پر رضا کار تنظیم برخواست کی جائے۔

(۴) فوج کی مجموعی تعداد بیس ہزار رہے۔

ان شرائط کے پیش ہونے کی تصدیق وی پی منن کی کتاب[1] سے بھی ہوتی ہے۔
سہ روزہ مباحثہ کے بعد مدات شرائط اور فرمان کا مسودہ بھی تیار کرلیا گیا۔ چونکہ ان شرائط
پر نظام سے مشورہ ضروری تھا اس لئے وفد ۱۰ رتاریخ کو حیدرآباد واپس لوٹا۔ مانکٹن ۱۱ رتاریخ
کو حیدرآباد سے دہلی واپس آگئے۔ ۱۳ رجون کو حیدرآباد میں وزراء کی کونسل کا جلسہ ہوا جس نے

The Integration of States. [1]

حسب ذیل تصفیہ کیا :

(۱) اصول کی حد تک یہ طے کیا گیا کہ دفاع، امور خارجہ اور مواصلات میں متوازی قوانین حیدرآباد میں نافذ کئے جائیں گے ۔

(۲) رضاکاروں کی فوجی نوعیت ختم کردی جائے گی اور رفتہ رفتہ اس جماعت کو برخواست کیا جائے گا ۔

(۳) فوج کی ۲۰ ہزار کی تعداد بھی قبول کرلی گئی لیکن سابق کی طرح اگر اسلحہ اور امونیشن بروقت سپلائی نہ ہو تو حیدرآباد انھیں باہر سے درآمد کرے گا اور اس کی نقل و حمل کو ہندوستان میں روکا نہیں جائے گا ۔

(۴) اس امر پر سختی سے اصرار کیا گیا کہ حیدرآباد کسی صورت میں اصولاً یا عملاً براہ راست یا بالواسطہ ہندوستان کی بالادستی (پیرا مونٹسی) کو تسلیم نہیں کریگا ۔

(۵) حیدرآباد کی معاشی آزادی کے استحکام کی ہندوستان ضمانت دے ۔

(۶) ذمہ دارانہ حکومت کے جلد از جلد قیام کے سلسلہ میں نظام کے مجوزہ فرمان کا مسودہ بھی قبل از قبل حکومت ہند کے نمائندگان کو بتلادیا گیا تھا جس میں بیان کیا گیا تھا کہ ۱۹۴۹ء میں ایک منتخب دستور ساز جماعت حیدرآباد کے لئے ایک جمہوری دستور بنانے کے لئے قائم کی جائے گی جو "حیدرآباد کے روایات کے مطابق اور اس بنیاد کے بموجب جو میں (نظام) بعد میں طے کروں گا" دستور مرتب کریگی خط کشیدہ الفاظ کو مونٹ بیٹن اور زعماء ہند نے ابتدائی مباحث میں قبول کرلیا تھا اور ہندو اور مسلمانوں کی نشستوں کا جو تناسب ہونا چاہیئے وہ بھی ان کے ذہنوں میں تھا ۔

(۷) فریقین میں اختلاف کی صورت میں ثالثی کرائی جائے گی جس کے فیصلہ کے دونوں پابند ہوں گے ۔

حیدرآبادی وفد ۱۴ جون کو دہلی پہنچا حسب سابق پہلے مینن سے گفتگو ہوئی ۔

لائق علی نے بیان کیا ہے کہ منن نے سابقہ مسودات میں نمایاں تبدیلیاں کردی تھیں جن میں سب سے اہم فوج کے تعلق سے ریاستی فوج کی اسکیم بابت ۱۹۳۹ء (State Forces Scheme) کا اطلاق تھا جس کے ذریعہ انگریزوں نے حیدرآبادی فوج پر اپنا کنٹرول قائم کیا تھا ۔ دوسری جدید شرط ہندوستان کا یہ مطالبہ تھا کہ کسی ہنگامی حالت میں ہندوستان کو حیدرآباد کے کسی بھی علاقہ میں فوج متعین کرنے کا حق ہوگا۔ اس کے قبل بیرونی جنگ کی صورت میں حیدرآباد نے اس حق کو تسلیم کرلیا تھا۔ حیدرآباد کی معاشی آزادی کو جزو معاہدہ بنانے کی بجائے معاہدہ کے منسلکہ (Collateral) خط میں ہمدردانہ غور کرنے کی پیشکش کی گئی۔ اور آخر میں ثالثی کو غیر ضروری قرار دے کر اس سے انکار کیا گیا ۔

بظاہر ان شرائط کو جدید نہیں کہا جاسکتا بجز شرط ۲ کے ۔ لیکن منن اور کیمبل جانسن نے اپنی کتابوں میں کہیں اس شرط کا تذکرہ نہیں کیا ۔ البتہ اسٹیٹ فورسس اسکیم بابت ۳۹ء کا حوالہ منن کے خط مورخہ ۲۳ مارچ میں موجود ہے جو کے یم منشی کے ذریعہ وزیر اعظم حیدرآباد کو روانہ کیا گیا تھا اور جس میں معاہدہ انتظام جاریہ کی خلاف ورزیوں کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے متذکرۂ اسکیم کی خلاف ورزی کا بھی الزام لگایا گیا تھا۔ علاوہ ازیں گفت و شنید کے دوران ماؤنٹ بیٹن اور نظام کے مابین جو مراسلت ہوئی اس میں اس کا کہیں تذکرہ موجود نہیں ہے۔

لایق علی ہندوستان کے پیش کردہ مسودہ کے فریق بننا نہیں چاہتے تھے اور اس پر نظام کی منظوری ضروری تھی ۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ اگر نظام مسودہ کو قبول کریں تو معاہدہ پر اسی روز دستخط ہونی چاہیئے، دوسرے روز کا سوال پیدا نہیں ہوتا ۔ لائق علی نے اس مشورہ کو قبول کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں میں سے کسی ایک کو دہلی چھوڑ جانے پر آمادگی ظاہر کی۔ بقول رؤف کے وہ حیدرآباد کے تنسیخ نامہ پر دستخط کرنے کیلئے دہلی رکنا نہیں چاہتے تھے۔

اس لئے ریڈی کو ٹھہرنا پڑا۔

لائق علی کا بیان ہے کہ حیدرآباد واپس ہوتے ہوئے انھوں نے ان کاغذات کا سرسری معائنہ کیا جو کانفرنس سکریٹری نے ان کے حوالے کئے تھے اور انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ نظام کے مجوزہ فرمان کے الفاظ "حیدرآباد کے روایات کے مطابق اور اس بنیاد کے بموجب جو میں (نظام) بعد میں طے کروں گا" حذف کرکے جدید الفاظ اضافہ کئے گئے تھے۔ اس پر حیدرآباد میں ایک طوفان اٹھایا گیا اور نظام نے مونٹ بیٹن کو بتاریخ ۱۹ر جون اپنے تار میں بتلایا کہ تا وقتیکہ یہ الفاظ مکرر معاہدہ میں شامل نہ کئے جائیں اور حیدرآباد کی معاشی آزادی اور ثالثی کے حق کو تسلیم نہ کیا جائے وہ معاہدہ پر دستخط کرنے تیار نہیں ہیں۔

گفت و شنید کے اُن سارے مرحلوں سے جو لائق علی کی سرکردگی میں طے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ فریقین کے درمیان اب کوئی چیز تشنۂ تکمیل باقی نہیں رہی تھی بجز ان تین امور متذکرۂ بالا کے جن میں امر اول الذکر پر جو اعتراض تھا وہ مانکٹن کے بیان کے بعد ختم ہوگیا کیونکہ اس نے یہ تسلیم کرلیا کہ مسودات لائق علی کو دینے سے ایک روز قبل اس کو دئے گئے تھے اور ان میں یہ الفاظ موجود نہیں تھے۔ مجوزہ فرمان سے الفاظ محذوف ہونے پر جو غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے متعلق ۱۷ر جون کو نظام نے مونٹ بیٹن سے اپنے تار میں اظہار تاسف بھی کیا۔ گویا اس طرح تین میں سے صرف دو امور باقی رہ گئے تھے یعنی حیدرآباد کی معاشی آزادی اور معاہدہ میں ثالثی کی دفعہ کا اضافہ ان دو فروعی شرائط کے متعلق جن پر گفتگو کی تان ٹوٹی ہے ہم نے سابقہ باب میں مونٹ بیٹن کا وہ تفصیلی خط پیش کیا ہے جو مانکٹن کے ذریعہ روانہ کیا گیا تھا اور جس میں مدلل طور پر اس نے ایک التجا آمیز پیرایہ میں نظام کو ان کی کونسل کی غلط اور ناعاقبت اندیشانہ طرزِ عمل کی مذمت کرتے ہوئے معاہدہ کی قبولیت کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن جواباً ۱۷ر کو نظام کی

جانب سے جو تار روانہ ہوا اس میں یہ عذر کیا گیا تھا کہ دو ایک روز کے اندر قطعی سمجھوتہ پر پہنچنا ممکن نہیں۔ معاشی آزادی اور ثالثی کے ساتھ ایک تیسری شرط کا بھی اضافہ کیا گیا کہ کونسل کے مشورہ کی بنا پر انھوں نے (نظام) یہ طے کیا ہے کہ مفاجاتی حالات میں صرف حیدرآباد کے سرحدی علاقوں میں ہندوستانی فوج متعین کی جا سکتی ہے۔ آخر میں نظام کی جانب سے گفتگو جاری رکھنے کی پیشکش کی گئی۔ نظام کے اس تار کا بھی پورا متن گذشتہ باب میں آگیا ہے۔

لائق علی نے اپنی کتاب میں نظام کے تار اور مونٹ بیٹن کے خط کے حوالہ سے یہ تحریر کیا ہے کہ معاملہ اب مونٹ بیٹن کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور حکومت ہند کے زعماء کے پاس انگریز گورنر جنرل کی اہمیت ختم ہو چکی تھی۔ نظام کو مونٹ بیٹن کی جانب سے صرف یہ جواب ملا کہ اپنی خدمت سے فوری سبکدوش ہونے کے مدنظر وہ نظام کا تار مزید کارروائی کے لئے حکومت ہند کے حوالہ کر رہے ہیں۔ لیکن منن نے یہ لکھا ہے کہ ۱۷ جون کو نہرو نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جو معاہدہ طے ہوا ہے اس پر نظام جس وقت چاہیں دستخط کر سکتے ہیں البتہ مزید گفت و شنید نہیں ہوگی۔

لائق علی نے اپنے زمانہ کی ساری گفت و شنید کے متعلق حکومت ہند پر بار بار یہ الزام لگایا ہے کہ ہمیشہ طے شدہ امور میں اس کی جانب سے ترمیمات پیش کی جاتی رہیں۔ لیکن حالات اور واقعات سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اس الزام سے دونوں فریقین کا دامن پاک نہیں تھا۔ آخری معاہدہ میں زیادہ تر ترمیمات تو حیدرآباد کی جانب سے پیش ہوئی تھیں۔ ذمہ دارانہ حکومت قبول کرنے اور عارضی حکومت میں کونسل کی نصف نشستیں بشمول وزارتِ عظمیٰ ہندوؤں کے سپرد کر دینے کی آمادگی کے بعد حیدرآباد کا معاشی، مالیاتی اور تجارتی آزادی کے لئے اصرار کرتا اور معاہدہ انتظام جاریہ کے

وقت ثالثی کے دفعہ کی جو درگت بنی تھی اُس تجربہ کو فراموش کرکے مستقل معاہدہ میں
اس کو باقی رکھنے پر اصرار کرنا حیدرآباد کی حکومت کی ایسی غیر مآل اندیشی تھی جس نے
حیدرآباد کے مستقبل کو ہمیشہ کے لئے تاریک کر دیا۔ اس گفت وشنید کے ٹوٹنے کا الزام
بھی حیدرآباد ہی پر عائد ہوتا ہے۔

۱۵

مفاہمت کی آخری کوشش

ہندوستان اور حیدر آباد کے مابین مستقل معاہدہ کی گفت وشنید کے انقطاع کے تین روز بعد ۲۱ر جون ۱۹۴۸ء کو مونٹ بیٹن گورنر جنرل کی خدمت سے سبکدوش ہوکر انگلستان روانہ ہوگئے اور سی راجگوپال چاریہ ان کے جانشین مقرر ہوئے۔

گفت وشنید کے دوران ہی میں انقطاع کے امکانات پیدا ہونے لگے تھے۔ سر مرزا اسمٰعیل حیدر آباد کی وزارت عظمیٰ سے اگست ۱۹۴۷ء ہی میں مستعفی ہو چکے تھے لیکن نظام سے ان کے عقیدت مندانہ مراسم میں فرق نہیں آیا تھا۔ ان ہی تعلقات کے پیش نظر یکم مئی ۱۹۴۸ء کو مونٹ بیٹن سے بنگلور میں گفتگو کرنے کے بعد سر مرزا نے نظام کو یہ لکھا کہ ایسے وقت جبکہ حیدر آباد کی قسمت کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے اور سیاسی فضا انتہائی مکدر ہے وہ تصفیہ کے سلسلہ میں سازگار ماحول پیدا کرنے کے لئے مونٹ بیٹن کو حیدر آباد آنے کی دعوت دیں۔ لیکن نہ نظام کی دعوت پر مونٹ بیٹن حیدر آباد آئے اور نہ مونٹ بیٹن کی دعوت پر نظام دہلی جاسکے۔ البتہ سر مرزا کے اس خط نے ان کے اور نظام کے درمیان مراسلت کا دروازہ کھول دیا۔ دوسرا خط مرزا نے ۲۰ر مئی کو لکھا کہ ہندوستان اور حیدر آباد کی گفت وشنید انقطاع کی نوبت پر پہنچ گئی ہے۔ حیدر آباد کو ایک حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کرکے کسی سمجھوتہ پر پہنچ جانا چاہیئے ورنہ اس کے عواقب حیدر آباد کے لئے مضر ثابت ہوں گے اس لئے ہندوستان

سے نزاع کی صورت پیدا نہ ہونی چاہیئے۔ اب بھی دونوں میں ایک اطمینان بخش اور باعزت سمجھوتہ کا موقع ہے۔ سر مرزا نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ بدقسمتی سے حیدرآباد کو مستحکم اور مضبوط بنیادوں پر باقی رکھنے کے سارے زرین مواقع کھو دئے گئے اور ایسے سنگین حالات پیدا کردئے گئے جن سے حیدرآباد کے وجود ہی کو خطرہ لاحق ہوگیا۔

نظام نے سر مرزا اسمٰعیل کو دہلی جاکر گورنر جنرل اور پنڈت نہرو سے ملنے کا مشورہ دیا۔

سر مرزا اسمٰعیل ۲۸ر جولائی کو دہلی پہنچے جس کے قبل انھوں نے نظام کو یہ تحریر کیا:-

"مجھے اندیشہ ہے کہ حیدرآباد کی موجودہ حالت وہ نہیں رہی جو پہلے تھی حالیہ واقعات نے حیدرآباد کے پوزیشن کو بہت کمزور کردیا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے لئے اب صرف آخری موقع باقی رہ گیا ہے۔ اگر اس وقت ہم کو ناکامی ہوئی تو حیدرآباد کو فوجی حملہ کا مقابلہ اور اس سے جو تباہ کن نتائج برآمد ہوں گے ان کے لئے تیار رہنا پڑے گا۔ جہانتک میں پیش قیاسی کرسکتا ہوں دہلی اُس مسودہ مفاہمت سے آگے نہیں جائے گا جو لارڈ مونٹ بیٹن اور مانکٹن نے مرتب کیا تھا اور جس کے بیشتر اجزا کو حیدرآباد نے قبول کرلیا تھا۔"

سر مرزا اسمٰعیل کا بیان ہے کہ دہلی روانہ ہونے کے دو روز قبل یعنی ۲۶ر جولائی کو بھی انھوں نے نظام کو یہ لکھا تھا:-

"میں نے آج صبح آل انڈیا ریڈیو پر یہ سُنا ہے کہ حیدرآباد مجلس اقوام متحدہ میں اپنا مسئلہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس خبر میں کتنی صداقت ہے۔ کاش یہ غلط ہو کیونکہ ایسے اقدام سے حیدرآباد کو شدید نقصان پہنچے گا۔ میں اعلیٰحضرت سے پورے خلوص کے ساتھ التجا کرتا ہوں کہ وہ ایسی کسی تجویز کو قبول نہ فرمائیں جس کو میں انتہائی تنگ نظری اور غیر مآل اندیشی پر محمول کرتا ہوں۔"

نظام نے اس کا جواب دیا کہ یہ معاملہ زیر غور ہے اور اسی صورت میں اس مسئلہ کو

اُٹھایا جائے گا جب اطمینان بخش اور باعزت سمجھوتے کے امکانات ختم ہو جائیں گے لیکن حیدرآباد کی مجلس مقننہ میں لائق علی کے اس اعلان سے کہ حیدرآباد نے اپنے مسئلہ کو مجلس اقوام متحدہ میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے، سرمرزا کے شبہات نے یقین کا درجہ حاصل کر لیا۔ ہندوستان کے طرزِ عمل میں مزید شدت پیدا ہوگئی اور حیدرآباد سے گفت و شنید کے قبل چار شرائط کی تکمیل لازمی قرار دیگئی۔

(۱) رضاکار تنظیم کی فوری تحلیل۔

(۲) کامل ذمہ دارانہ حکومت کا قیام۔

(۳) موجودہ حکومت کی تبدیلی۔

(۴) امن و امان کی بحالی۔

سرمرزا اسمٰعیل دہلی میں تین روز تک گورنر جنرل کے مہمان کی حیثیت سے گورنمنٹ ہوز میں مقیم رہے اور اس کے بعد نظام ہیلیس منتقل ہوئے۔ ۲۹ جولائی کو انھوں نے نظام کو تار دیا کہ فوراً لائق علی کو دہلی روانہ کیا جائے کیونکہ ان کے تعاون کے بغیر وہ کوئی کام نہیں کر سکتے۔ لیکن لائق علی کو دہلی نہ جانا تھا وہ نہ گئے البتہ سرمرزا کے مشن کو ناکام کرنے کے لئے حیدرآباد ریڈیو سے ان کا یہ بیان نشر ہوا کہ دہلی میں سرمرزا کی آمد سے حیدرآباد کے سیاسی مسئلہ کا کوئی تعلق نہیں ہے ممکن ہے وہ اپنی شخصی حیثیت میں وہاں موجود ہوں اور اس اخباری رپورٹ میں کوئی صداقت نہیں ہے کہ اعلیٰ حضرت کے ایما پر وہ کسی خاص مقصد کے لئے دہلی بھیجے گئے ہیں۔ اپنے متعلق لائق علی نے یہ بیان کیا کہ وہ خود دہلی نہیں جائیں گے تاوقتیکہ انھیں باعزت شرائط کا تعین نہ ہو جائے۔ اس زمانہ میں حیدرآباد کے سیاسی حلقے دہلی میں سرمرزا کی موجودگی کو حیدرآباد کے لئے انتہائی خطرناک تصور کرنے لگے تھے۔ لائق علی کے بیان پر سرمرزا نے اپنی کتاب میں

جو تبصرہ کیا ہے اس کا ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے :

"چھوٹے لوگ جب بڑی خدمتوں پر مامور ہو جاتے ہیں تو ان کی یہی روش ہوتی ہے جس سے بالآخر ناگزیر تباہی رونما ہوتی ہے۔ میں نے لائق علی کو دہلی نہ بھیجنے پر نظام سے اپنی مایوسی اور افسوس کا اظہار کیا۔ میرے لئے اب یہی صورت باقی رہ گئی تھی کہ زین یار جنگ کو حیدرآباد روانہ کروں تاکہ میرے خط سے زیادہ وہ بالمشافہ دہلی کے سارے حالات بیان کر سکیں۔ میں نے نظام کو یہ پیام روانہ کیا کہ دہلی میں یہاں کے وزراء کو اپنا ہمخیال بنانا بڑا مشکل ہے۔ ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے اور وہ اب اقدام کرنے پر مائل ہیں۔ میں نے یہ بھی بتلایا کہ یہ سمجھنا بڑی غلطی ہے کہ پاکستان یا کسی اور مقام سے جیسے کہ اقوام متحدہ ہے حیدرآباد کو کوئی امداد حاصل ہو سکے گی۔ دہلی میں اپنی ملاقاتوں کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا تھا اس کو مختصراً میں اس طرح نظام کے علم میں لایا۔

حکومت ہند کو دیگر ریاستوں کی طرح حیدرآباد کی شرکت پر اصرار ہے۔ حیدرآباد کے ساتھ امتیازی سلوک کے لئے وہ تیار نہیں ہے۔ حیدرآباد کی موجودہ وزارت پر حکومت ہند کو اعتماد نہیں ہے اور اس کی فوری تبدیلی پر اس کو اصرار ہے بحران کو روکنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ کونسل کے مشورہ کی بناء پر اعلیٰ حضرت نے جس مسودہ مفاہمت کو رد فرمایا ہے اس کو فوری منظور کر لیا جائے۔ حکومت ہند ممکن ہے اس کے لئے تیار نہ ہو اور مجھے انھیں آمادہ کرنے

کے لئے بڑی تگ و دو کرنی پڑے گی۔ اگر لائق علی اعلیٰحضرت کی
جانب سے معاہدہ پر دستخط کرنے کا اختیار لے کر دہلی آجاتے تو
میرے لئے بڑی آسانی ہو جاتی۔ تاہم میں پوری کوشش کروں گا۔
..... آخر میں میں اپنے اس خط کے لہجہ کی تندی کی معافی چاہتا ہوں
لیکن میں مجبور تھا کہ اعلیٰ حضرت کے سامنے سارے واقعات من و عن
پیش کردئے جائیں۔ اب یہ اعلیٰ حضرت پر موقوف ہے کہ وہ میرے
مشورہ کو قبول یا رد فرمائیں۔ اول الذکر صورت میں مجھے مسرت ہوگی
کیونکہ آپ کا پوزیشن حسب حال بحال رہے گا بلکہ اس میں مزید
تقویت پہنچے گی اور خانوادۂ آصفی اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ
باقی رہے گا۔ ثانی الذکر صورت میں مجھے رنج ہوگا میری یہ پُر خلوص
دعا ہے کہ حضرت امیرؓ اور امام حسینؓ جن سے اعلیٰ حضرت کو غیر معمولی
عقیدت ہے آپ کو صحیح راستہ بتلائیں ؎

یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سر مرزا اسمٰعیل کو نظام نے حیدرآباد آنے کی دعوت دی لیکن اتحاد المسلمین
کی مخالفت کے اندیشہ سے وہ حیدرآباد نہ جا سکے بلکہ انھوں نے ۵ ر اگست کو پھر نظام
کے نام ایک تفصیلی خط روانہ کیا جس میں یہ تحریر کیا گیا :-

" حکومت ہند معاہدہ کے مسودہ پر اب قائم نہیں ہے اور وہ حیدرآباد کی شرکت پر
مُصر ہے لیکن میں نے انھیں یہ باور کرایا ہے کہ مسودہ کو قبول کرنے کے بعد اب حکومت
ہند اس کو رد نہیں کر سکتی۔ دہلی میں اعلیٰحضرت کے متعلق یہ خیال ہے کہ آپ اتحاد المسلمین
یا اپنی کونسل کے مقابلہ میں مجبور محض ہیں اور اب بیرونی امداد کے بغیر آپ اپنی آزاد
مرضی کو استعمال نہیں فرما سکتے۔ اس وقت آپ کی اور ریاست کی عافیت خطرہ
میں ہے جس کو بچانا ہے۔ ایسی صورت میں میرا مشورہ ہے کہ بلا تاخیر معاہدہ پر

دستخط کردی جائے۔ ۹ اگست کے قبل دستخط ہو جانا مناسب ہے کیونکہ اسمبلی کا اجلاس اس تاریخ سے شروع ہو رہا ہے اگر سمجھوتہ نہ ہوا تو آپ کا پوزیشن انتہائی مشکل اور مخدوش ہو جائے گا۔ لائق علی اور ان کے استدلال کو کوئی اہمیت نہ دیجیے وہ آپ سے انتہائی بدخدمتی کر رہے ہیں۔ اعلیٰحضرت کو میرے اور ان کے مشورہ میں سے کسی ایک کو ماننا چاہیئے۔ میں ان معاملات میں ان سے زیادہ تجربہ رکھتا ہوں اور یہاں کے سربرآوردہ لوگوں سے بھی میں نے مشورہ کیا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ معاہدہ کو قبول کر کے اس تلخ باب کو بلا تاخیر ختم کر دینا چاہیئے۔

اس امر سے بڑی آسانی پیدا ہو گی اگر اعلیٰ حضرت یہ اعلان فرمائیں کہ آپ نے بعد غور و فکر معاہدہ کو قبول کرنے کا تصفیہ فرمایا ہے۔ اتحاد المسلمین کو یہ نہ معلوم ہو کہ میرے مشورہ پر آپ نے عمل فرمایا ہے۔ میں چونکہ اس وقت حیدرآباد میں نہیں ہوں اس لئے وہ میرے خلاف کوئی مظاہرہ نہیں کر سکتے اور آپ کی دستخط کے بعد اس کو آپ کا فیصلہ قرار دے کر وہ خاموشی اختیار کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ اعلیٰ حضرت میرے اس نقطۂ نظر کو محسوس فرمائیں گے اور فوری عمل کریں گے کیونکہ اب وقت نہیں کھویا جا سکتا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ حیدرآباد کے حالات اتنے ابتر ہو جائینگے اور اعلیٰ حضرت کی شخصی عافیت کو خطرہ لاحق ہوگا اب ہم اس معاملہ میں مزید خطرات کو دعوت دینا نہیں چاہتے۔"

نظام نے سر مرزا اسمٰعیل کے مشورہ پر عمل نہیں کیا۔ سر مرزا اسمٰعیل اپنے مشن میں ناکام رہے اور ۸ اگست کو دہلی سے ایک بیان جاری کر کے بنگلور روانہ ہو گئے۔ اپنے بیان میں انھوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ اپنی شخصی حیثیت میں دہلی آئے تھے اور دونوں حکومتوں کے دوست کی حیثیت سے وہ دونوں میں سمجھوتہ کرانے کے کوشاں تھے جس کے لئے انھوں نے نظام سے اجازت بھی حاصل کی تھی۔ حیدرآباد کے مسئلہ کے متعلق انھوں نے اپنی اس

رائے کا اظہار کیا کہ حیدرآباد کی آزادی بین الاقوامی حیثیت سے بالکل علمی (academic)
نوعیت کی ہے۔ جب حیدرآباد مواصلات، دفاع اور امور خارجہ کا کنٹرول ہندوستان کو
دینے آمادہ ہوگیا تو پھر اس کی آزادی اندرون ملک تک محدود ہوگئی اور ہندوستان
کو اس امر کے تسلیم کرنے سے انکار بھی نہ ہوگا۔ ایسی صورت میں نظام کو معاہدہ پر دستخط
کرنے سے پس و پیش نہ کرنا چاہیئے۔ اپنی مشن کی ناکامی کا اعلان کرتے ہوئے انھوں نے
دونوں حکومتوں کو خونریزی سے بچ کر سمجھوتہ کرنے کا مشورہ دیا۔

نظام اور سر مرزا کے تعلقات اس کے بعد بھی باقی رہے اور ان میں مراسلت
بھی ہوتی رہی۔ سر مرزا کے مساعی کے نامشکور ہونے کے بعد حیدرآباد کے خلاف
ہندوستان کا طرزِ عمل اور بھی سخت ہوگیا۔ اس اثناء میں ملکِ معظم کی حکومت اور برطانوی
وزیر اعظم مسٹر اٹیلی کے خیالات بھی حیدرآباد کے مسئلہ کے متعلق منظرِ عام پر آئے جن میں
حیدرآباد کو ہندوستان سے سمجھوتہ پر پہنچنے کا مشورہ دیا گیا۔ اقوام متحدہ میں حیدرآباد
کا مسئلہ ۱۲ راگست ۱۹۴۸ء کو پیش ہو چکا تھا اور ہندوستان ہر لمحہ حیدرآباد کو اپنے
آہنی پنجوں میں دبوچنے کے لئے صرف اشارہ کا منتظر تھا۔ چنانچہ ۳۰ راگست کو سر مرزا
نے جو خط نظام کو لکھا اس میں ہندوستان کی برہمی اور سختی کا اندازہ اُن شرائط
سے ہوتا ہے جو اب حیدرآباد کے لئے تجویز کئے گئے تھے :-

" بلارام چھاؤنی میں ہندوستانی فوج کے داخلہ کی اجازت دی جائے جس کے بعد
ہندوستان شرکت یا معاہدہ پر اصرار نہیں کرے گا۔ یہ کہ جس علاقہ میں ہندوستانی فوج
متعین رہے گی وہ حیدرآباد کے زیر اقتدار رہے گا اور یہ کہ ہندوستانی فوج ایک
محدود عرصہ کے لئے مثلاً ایک سال کے لئے ریاست میں رہے گی اور جب حالات
معمول پر آجائیں گے تو فوج کو واپس بلالیا جائے گا۔

اپنی عادت کے بموجب سر مرزا نے ان جدید شرائط کی تائید میں دلائل بھی پیش کئے

کہ بنگلور میں آج بھی ہندوستانی فوج متعین ہے اور کسی کو اس پر اعتراض نہیں۔ بفا جاتی حالات میں جب فوج کے داخلہ کی اجازت پر حیدرآباد نے آمادگی ظاہر کی تھی تو اس کو جدید شرط بھی قبول کر لینی چاہیئے۔ علاوہ ازیں جب تک اس فوجی علاقہ پر ریاست کا اقتدار باقی ہے فوج کے داخلہ پر اعتراض نہ ہونا چاہیئے۔ اس معمولی سی چیز کو انقطاع معاہدہ کی بنیاد بنانا غلط ہے۔ سر مرزا کو اس کا بھی اعتراف تھا کہ معلوم نہیں کیوں اس معمولی مسئلہ کو حکومت ہند اتنی اہمیت دے رہی ہے۔ لیکن جب اس کے نزدیک یہ چیز اہم ہوگئی ہے تو حیدرآباد کو اپنی ضد پر قائم رہ کر اس کو رد نہیں کرنا چاہیئے۔ سر مرزا شرکت اور معاہدہ دونوں کے لئے تیار تھے کیونکہ ان کے نزدیک قوی اور ضعیف کے معاہدہ میں موخر الذکر کی بھلائی اس میں ہے کہ معاہدہ کی شرائط کی صراحت کرالی جائے۔

سر مرزا کی ناکامی کے بعد اگر نظام مسز سروجنی نائیڈو کو بیچ میں ڈالتے تو زیادہ بہتر تھا۔ کیونکہ مسز نائیڈو نہ صرف حیدرآبادی تھیں بلکہ کانگریس کے صفِ اول کے قائدین میں ان کا شمار ہوتا تھا اور اس وقت صوبۂ متحدہ کی یہ گورنر تھیں لیکن نظام کو مشورہ دینے والا کون تھا۔ البتہ ہندوستان کے حملہ کے دوران میں نظام کسی طرح سروجنی نائیڈو سے ربط پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن پیام رسانی ناممکن تھی۔ صرف ایک صورت رہ گئی تھی کہ ہندوستان کے گورنر جنرل راجگوپال چاریہ سے اپیل کی جائے۔ لیکن حکومت حیدرآباد یہ بھول گئی کہ دستور کے بموجب ان کی انفرادی رائے کی کوئی اہمیت نہ تھی، چنانچہ نظام کی جانب سے جب گورنر جنرل سے اپیل کی گئی تو ۳۱ اگست کو راجگوپال چاریہ نے اُن ہی تجاویز کا اعادہ کیا جو سر مرزا نے پہلے ہی لکھ بھیجی تھیں۔ اس میں حیدرآباد کے اندر امن و امان کی بحالی پر بہت زور دیتے ہوئے بتلایا گیا تھا کہ

> خانگی افواج کے بے لگام اعمال اور مظالم سے حیدرآباد کی آبادی کی اکثریت کی جان و مال اور عافیت خطرہ میں ہے جس کے باعث ہندوستان کی حیدرآباد

میں مداخلت ناگزیر ہوگئی ہے ۔ ہندوستانی عوام کے لئے حیدرآباد کے حالات سے چشم پوشی کرنا اخلاقی طور پر ناممکن بن گیا ہے ۔ یوں دیکھا جائے تو ہندوستان اور حیدرآباد کے عوام کا مفاد مشترک ہے اور یہ مفادات زمانہ حال اور مستقبل میں بھی مشترک رہیں گے اور حکومت ہند نے متعدد مرتبہ اس امر کا یقین دلایا ہے کہ حیدرآباد کے مسئلہ کا جو بھی تصفیہ ہوگا اس میں نظام کے وقار اور حیثیت کا تحفظ کیا جائے گا ۔ اس لئے ہز اگزالٹیڈ ہائی نس سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ حالات کا صحیح جائزہ لیں اور جرأت مندانہ اقدام کرکے دہشت اور ظلم کی فضا کو ختم کردیں ۔

اس خط میں ہندوستانی گورنر جنرل نے سر مرزا اسمٰعیل کے مساعی کی ستائش کرتے ہوئے یہ بتلایا تھا کہ :

یہ بڑے وسیع تجربہ اور متوازن رائے رکھنے والے مدبر ہیں اور حیدرآباد کے مسائل پر انھیں بڑا عبور ہے اور یہ ہز اگزالٹیڈ ہائی نس اور ہندوستان بشمول حیدرآباد کے عوام کے بہی خواہ ہیں ۔ آپ کے ایما پر یہ دہلی آئے تھے انھوں نے جو مشورے آپ کو دئے ہیں میں اُن کا اعادہ کرتا ہوں یعنی رضاکار تنظیم ختم کی جائے اور اندرون اور بیرون حیدرآباد کے لوگوں میں اعتماد پیدا کرنے اور ان کی جان و مال کے حفاظت کی خاطر سکندرآباد میں ہندوستانی فوج کے داخلہ کی اجازت دی جائے ۔ بجز اس اعتماد کی بحالی اور عافیت کے تحفظ کے کوئی دوسری تدبیر نہیں ہے ۔ یہ وقت بحث اور تاخیر کرنے کا نہیں ہے ۔ فوری فیصلہ کرنے اور دوستانہ اعتماد پیدا کرنے کی ضرورت ہے ۔ یہ خط بالکل شخصی حیثیت میں اس شخص کی جانب سے روانہ کیا جارہا ہے جس پر ہز اگزالٹیڈ ہائی نس نے ایک سچے دوست کی حیثیت

سے اعتماد کیا ہے؟"

گورنر جنرل کا خط دراصل اعلان جنگ یا اس کا پیش خیمہ تھا۔ قاسم رضوی کی زبان میں اس کو بکری کے بچّہ پر بھیڑیئے کی الزام تراشی قرار دیا جا سکتا ہے جس کے بعد بھیڑیے نے بکری کے بچے کو چیر پھاڑ کر اپنا لقمہ بنا لیا۔ بعینہٖ حیدرآباد کے ساتھ ہندوستان نے ایسا ہی سلوک کیا۔ یہ پیش نظر رہے کہ ان نازک ترین لمحات میں نظام کی جانب سے کس قسم کا جواب ادا ہوا:

"آپ کے خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں جان، عزت اور مال کے عدم تحفظ کے متعلق ہندوستان میں غلط تصورات پائے جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ چند اشخاص اور جماعتوں کے مسلسل غلط پروپگنڈہ کا نتیجہ ہے جو انڈین یونین اور حیدرآباد میں مفاہمت کے مخالف ہیں۔ سرحدوں کی حالت فوری اور مادی طور پر سدھر جائے گی اگر متصلہ صوبجات سے ہنگاموں کا سدباب کیا جائے۔ آپ نے سر مرزا کے مشوروں کا بھی تذکرہ فرمایا ہے جو انھوں نے اپنے حالیہ سفر دہلی کے بعد روانہ کئے تھے۔ سر مرزا گو میرے قدیم دوست ہیں لیکن حیدرآباد کے مخصوص مسائل سے وہ پوری طرح واقف نہیں ہیں کیونکہ بخلاف اپنے پیشروؤں کے ان کا قیام یہاں بمشکل ایک سال رہا۔ علاوہ ازیں انھیں بعد کے حالات کا کوئی علم نہیں اس لئے اُن کے مشوروں پر عمل کرنا بادی النظر میں ناممکن ہے دیگر امور کے متعلق براہ کرم مجھے اس امر کے اظہار کی اجازت دیجئے کہ میرے ملک میں ہندوستانی فوج کے تعینات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور میری فوج میری رعایا کی جان و مال کی کامل حفاظت اور حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بالکل کافی ہے۔

جہاں تک آپ کے اس مشورہ کا تعلق ہے کہ میں اپنی حکومت کو چھوڑ کر سارا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے کر فیصلہ کروں میں اس ذمہ داری کو موجودہ تغیر پذیر حالات میں قبول کرنے تیار نہیں ہوں۔ گذشتہ ماہ جون میں میں نے آپ کے پیشرو کو بھی یہی جواب دیا تھا۔ میں حقیقتاً ایک باعزت سمجھوتہ پر پہنچنا چاہتا ہوں، موجودہ تعطل کو دور کرنے کے لیے آپ کے قیمتی تعاون کی ضرورت ہے تاکہ حیدرآباد اور اطراف کے صوبجات میں امن بحال ہو جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اس معاملہ میں آپ مزید غور و تعمق سے کام لیکر جلد از جلد اس معاملہ کا تصفیہ کریں گے۔"

حالات جب زیادہ ابتر ہونے لگے تو نظام نے ۵ ستمبر کو مکرر ہندوستان کے گورنر جنرل سے تار کے ذریعہ ماہ جون کے مباحث کی روشنی میں حیدرآباد کے نقطۂ نظر پر ہمدردانہ غور کرنے کی درخواست کی۔ اس کے بھی جواب مورخہ ۸ ستمبر میں راجگوپال چاریہ نے اپنے پہلے خط کے مندرجہ شرائط پر اصرار کیا۔ اس کے بعد ۱۳ ستمبر کو تو ہندوستانی فوجوں نے حیدرآباد پر حملہ ہی کر دیا۔

قبل اس کے کہ ہم اس باب کے واقعات پر تبصرہ کریں یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ مرزا اسمٰعیل کی مساعی پر حیدرآباد کی حکومت نے کس طرح عمل کیا، پہلے ہوش بلگرامی کی زبانی سنیئے:

" دہلی سے سر مرزا نے جس اساس پر سمجھوتہ ممکن تھا اس کی اطلاع ایجنٹ جنرل (زین یار جنگ) کے ذریعہ اعلیٰ حضرت کو دی تو اس پر برافروختہ ہوکر میر لائق علی نے اپنا اور اپنی کابینہ کا استعفا پیش کر دیا۔ جس میں اہم عذر یہ کیا گیا کہ بلاتعلق کونسل کسی اور شخص کے توسط سے ہندو یونین سے گفت و شنید جاری رہنے کی وجہ سے وہ مستعفی ہو رہے ہیں۔ یہ تصفیہ کنگ کوٹھی میں میر لائق علی، میجر جنرل العیدروس

اور دین یار جنگ کی موجودگی میں عمل میں آیا. ظاہر ہے کہ اس دھمکی کا نتیجہ خرابی کے سوا کیا ہوسکتا تھا۔ اصلاح کا جو موقع پیدا ہوا تھا وہ باقی نہ رکھا۔ زین یار جنگ کو ایجنٹ جنرلی سے مستعفی اور سرمرزا کو دہلی سے واپس ہونا پڑا۔" [1]

حیدرآباد کے اخبارات نے بڑی بڑی سرخیوں سے زین یار جنگ کی غداری کے واقعات شائع کئے اور حکومت حیدرآباد اور قاسم رضوی کے حقیقت پسندانہ عمل کی ستائش کی گئی۔

حیدرآباد کے آخری لمحات کی جبکہ اس پر مرض الموت کی حالت طاری تھی، یہ روئداد ہے جس کے پڑھنے سے ایک معمولی عقل و فہم رکھنے والا بھی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ نظام کتنے بے بس تھے، انھیں اپنی آزاد مرضی استعمال کرنے کا حق نہ تھا۔ اگر وہ چپکے سے سرمرزا کے مشورہ پر عمل کرکے معاہدۂ مفاہمت پر دستخط کردیتے تو یہ سارا قصہ ختم ہوجاتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ ایسا کرسکتے تھے؟ نظام خود اپنی عافیت کو خطرہ میں محسوس کررہے تھے۔ فوج خصوصاً پولس کی وفاداری ان کے نزدیک شاہ منزل کے حادثہ کے بعد مشکوک ہوگئی تھی۔ شہر رضاکاروں سے پٹا پڑا تھا۔ قاسم رضوی کے ذہن میں بادشاہ کو تخت سے اُتارنے کا بھی منصوبہ تھا۔ نظام کو ان ساری چیزوں کی اطلاع تھی۔ اگر وہ حکومت کو نظر انداز کرکے اپنی مرضی سے معاہدہ پر دستخط کردیتے تو ممکن تھا کہ ہندوستانی فوج کے شہر حیدرآباد پہنچنے تک آصفی تخت پر کوئی نظام موجود نہ ہوتا اور ہندوستان کو حیدرآباد کے اندر امن و امان کی بحالی سے قبل نظام کی جانشینی کا پہلے تصفیہ کرنا پڑتا۔

گفت و شنید کے ٹوٹنے کے بعد واقعات انتہائی سرعت سے وقوع پذیر ہوتے

---

[1] مشاہدات از ہوش بلگرامی۔

نوٹ: لائق علی نے اپنی کتاب میں تنہا اپنا استعفا پیش کرنا بیان کیا ہے۔

تھے ہندوستان کے طرزِ روش میں سختی پیدا ہوتی جا رہی تھی، سرحدی ہنگاموں کی شدت
میں اضافہ ہوگیا تھا، ملک میں ہراج کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اور ہندوستان کے زعماء
حیدرآباد پر حملہ کرنے کا تہیہ کرچکے تھے۔ کیا ان حالات کا یہ اقتضاء نہ تھا کہ حیدرآباد
کی حکومت اگر رضاکار تنظیم کو تحلیل نہ کرتی تو کم ازکم خود مستعفی ہوکر حیدرآباد کے
مستقبل کو محفوظ کرلیتی۔ اگر قاسم رضوی یا دیگر وزراء اس کے لئے تیار نہ تھے تو کم ازکم
لائق علی وزارتِ عظمیٰ سے سبکدوش ہوجاتے جس کے بعد ان کی کابینہ بھی باقی نہ رہتی۔
لیکن حیدرآباد نے ہندوستان کو کوئی اہمیت نہیں دی، اس کی دھمکیوں کو گیدڑ
بھپکیوں سے تعبیر کیا اور اس کی طاقتور فوج کو ایسی بزدل جماعت سمجھا جس میں
رضاکاروں کے آہنی عزم ہے مقابلہ کی تاب نہیں ہے۔ سرمرزا اسمٰعیل نے سچ کہا:

"ایک بہترین دماغ (Genius) بھی چند تحدیدات کا پابند ہوتا ہے۔
لیکن بیوقوفی پر کوئی تحدید عاید نہیں کی جاسکتی"[1]

وزارتوں پر چپکے رہنے کی بدترین صورت تو وہ تھی جبکہ مجوزہ معاہدہ کے تحت
عارضی حکومت کی تشکیل کے سلسلہ میں یہ منصوبہ بنایا جارہا تھا کہ چاروں اتحادی وزراء
اور مسلم سرکاری ارکان کو باقی رکھکر بقیہ نشستیں کانگریس اور دیگر ہندو جماعتوں کو دی
جائیں اس میں بھی وینکٹ راؤ قائد پست اقوام کی نشست کو ہندو نشستوں میں
شامل کرانے کی کوشش کی گئی۔ معاہدہ کی عدم تکمیل کی وجہ سے اس منصوبہ پر بھی عمل نہ ہوسکا۔
بہرکیف مفاہمت کی آخری کوشش کا یہ حشر ہوا جس کے نتیجہ میں حیدرآباد ہمیشہ
کے لئے صفحۂ ہستی سے ناپید ہوگیا۔

---

[1] My Public Life

۱۶

قائدِ اعظم اور مسئلہ حیدرآباد

۱۹۴۶ء میں کابینی مشن کی آمد کے وقت مولانا مظہر علی کامل صدر مجلس اتحاد المسلمین کی قیادت میں ایک وفد قائدِ اعظم سے ملنے کے لئے دہلی گیا تھا جس کے ارکان سید محمد احسن احمد عبداللہ المسدوسی، یامین زبیری اور مصنف کتاب ہذا تھے۔ قائد اعظم نے پہلی مرتبہ مسئلہ حیدرآباد کے متعلق یہ فرمایا تھا کہ علاقہ جات مفوضہ (یعنی برار، کڑپہ کرنول وغیرہ) کی واپسی پر اصرار کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے البتہ حیدرآباد کی موجودہ سالمیت ہی کو اگر برقرار رکھنے کی کوشش کی جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

کابینی مشن کی سفارشات ۳ جون ۱۹۴۷ء کو شائع ہوئیں جن کو برطانوی پارلیمان نے قانون آزادیٔ ہند میں مدون کیا جس کے بعد ہی ریاستوں کے مستقبل کی صحیح تصویر نمایاں ہوئی۔ ۱۱ جون ۱۹۴۷ء کو حیدرآباد نے جدید مملکتوں میں سے کسی میں بھی شرکت نہ کرنے اور آزاد رہنے کا اعلان کیا اور ماہ جولائی میں آئندہ تعلقات کی بنیاد تلاش کرنے کے لئے ہندوستان اور حیدرآباد میں گفت وشنید کا آغاز ہوا۔

حیدرآباد کے پہلے وفد نے جو نواب چھتاری صدر اعظم حیدرآباد، علی یاور جنگ، عبدالرحیم، پنگل وینکٹ راما ریڈی اور سر والٹر مانکٹن پر مشتمل تھا، دہلی میں قائدِ اعظم سے بھی ملاقات کی تھی جس کی تفصیل علی یاور جنگ نے اپنی کتاب[1] میں اس طرح

---

[1] Hyderabad in Retrospect.

پیش کی ہے :

" قائدِ اعظم نے کسی قسم کا وعدہ نہیں فرمایا اور جاریہ معاہدات کی گفت وشنید میں معقولیت کو پیش نظر رکھنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ جبتک کشمیر ہندوستان میں شریک نہیں ہوتا میں اس کے پاکستان میں شرکت پر اصرار نہیں کروں گا۔ بلکہ اس کو رعائتیں دوں گا اور اس کی سالمیت کو تسلیم کروں گا ہندوستان کو بھی حیدرآباد کے ساتھ یہی سلوک کرنا چاہیئے۔ اگر ہندوستان نامناسب طریقہ اختیار کرے تو ریاست کو حضرت امام حسینؓ کی طرح شہادت قبول کرنی چاہیئے۔ مگر اپنی " آزادی " کو قربان نہیں کرنا چاہیئے "

ذمہ دارانہ حکومت کے متعلق قائدِ اعظم نے فرمایا :-

" ذمہ دارانہ حکومت خود ہندوستان میں بتدریج نافذ ہوئی ہے۔ اس کے لئے سیاسی تجربہ اور تربیت کی ضرورت ہے اور برطانوی ہند کی طرح ریاستوں میں بھی اس کو بتدریج آنا چاہیئے۔ بخلاف بہادر یار جنگ کے انھوں نے واضح فرمایا کہ بتدریج نفاذ کا یہ اصول کشمیر اور حیدرآباد دونوں سے متعلق ہے اور اس کو شروع کرکے عوام کو اعتماد میں لینا چاہیئے اور اس منزل کی طرف سست روی سے نہیں بلکہ تیزی سے گامزن ہونے کی ضرورت ہے "

حیدرآباد کا وفد قائدِ اعظم سے اُس خط کے متعلق مشورہ طلب کرنے گیا تھا جس کے ذریعہ بجائے شرکت کے دفاع اور امورِ خارجہ کو ایک معاہدہ کے ذریعہ ہندوستان کے سپرد کیا جا رہا تھا۔ اس سلسلے میں نواب چھتاری نے سوال کیا کہ اگر حیدرآباد کسی مصیبت میں مبتلا ہو تو کیا پاکستان اس کی کوئی مدد کرے گا۔ قائدِ اعظم نے فیصلہ کن نوعیت کا یہ جواب دیا کہ :

" اس امر میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ پاکستان مادی طور پر حیدرآباد کی کوئی مدد

نہیں کر سکتا ۔"

تقسیم ہند کے بعد قائد اعظم بحیثیت گورنر جنرل پاکستان کراچی تشریف لے گئے اور ہندوستان اور حیدرآباد کے مابین گفت و شنید کی منزلیں طے ہونے لگیں معاہدہ انتظام جاریہ کے قبل پھر ایک بار علی یاور جنگ اور عبدالرحیم کراچی آئے تھے اور انھیں یہی مشورہ دیا گیا کہ بجز شرکت کے ہندوستان سے کوئی بھی معاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

لائق علی کے وزارت عظمیٰ پر فائز ہونے کے بعد یہ امید قائم کی گئی تھی کہ چونکہ لائق علی کو قائد اعظم کا اعتماد حاصل رہا ہے اور پاکستان کی جانب سے وہ اقوام متحدہ کے وفد کے رکن بھی تھے، اس تعلق کی وجہ سے قائد اعظم حیدرآباد کے مسئلہ میں زیادہ دلچسپی لیں گے۔ یہ توقع اپنی جگہ صحیح تھی۔ آخر دم تک قائد اعظم کی اس دلچسپی میں کمی نہیں ہوئی۔ لائق علی اور اتحاد المسلمین کے ارکان ان کی وفات سے کچھ دنوں پہلے تک ان سے ملتے رہے اور قائد اعظم نے اپنے مشوروں سے دریغ نہیں فرمایا۔

ہندوستان اور حیدرآباد کی گفت و شنید کی ابتدائی نوبت پر ایک مرتبہ نظام نے مونٹ بیٹن کو اپنے ایک خط میں یہ تحریر کیا تھا کہ اگر حیدرآباد کو مناسب شرائط نہ دی گئیں تو وہ پاکستان میں شریک ہو جائے گا جس کا از روئے قانون حکومت ہند حیدرآباد کو پورا اختیار حاصل ہے۔ اس پر مونٹ بیٹن نے جغرافیہ اور اتصال (Contiguity) کا سوال اٹھایا تھا حالانکہ قانون آزادئ ہند میں ان اصطلاحات کی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی۔ بعض افراد کا خیال ہے کہ اگر حیدرآباد کی پاکستان میں شرکت منظور کر لی جاتی تو اقوام متحدہ میں پاکستان کا موقف زیادہ مضبوط ہو جاتا۔ لیکن جوناگڈھ کی پاکستان میں شرکت کے باوجود ہندوستان نے فوجی مداخلت کر کے جوناگڈھ اور مانا ودر پر قبضہ کر لیا۔ جس کے خلاف پاکستان نے کشمیر کے مباحث کے دوران میں اس سوال کو بھی اٹھایا تھا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ حیدرآباد کے پاکستان میں

شرکت کا بھی یہی نتیجہ نکلتا۔ غالباً ان ہی وجوہ کی بناء پر پاکستان میں حیدرآباد کی شرکت کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔ لیکن معاہدۂ جاریہ کی تکمیل تک ہندوستان کو یہ قوی اندیشہ تھا کہ کہیں حیدرآباد پاکستان میں شریک نہ ہو جائے جس کا وی پی منن نے اپنی کتاب میں تذکرہ بھی کیا ہے بلکہ اس کے قول کے مطابق حیدرآباد کے ساتھ رعایت اس اندیشہ ہی کے پیش نظر کی جاتی رہی۔

کشمیر کے متعلق پاکستان اور ہندوستان کی آویزش اور جنگ مسئلہ حیدرآباد کے تصفیہ میں تعویق کا باعث بنی رہی۔ ہندوستان نے کسی ریاست سے کوئی جاریہ معاہدہ نہیں کیا۔ حیدرآباد کے سوا ہر ریاست کو شرکت پر مجبور کیا گیا لیکن حیدرآباد کے متعلق ہندوستان کو دو وجوہ کی بناء پر اپنا طرز بدلنا پڑا۔ اولاً حیدرآباد ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست تھی اور اس کے مادی وسائل بھی وافر تھے۔ دوسرے یہ اس کا فرماں روا مسلمان تھا اور مسلمان نہ صرف یہاں مقتدر حیثیت رکھتے تھے بلکہ تحریک پاکستان میں انھوں نے نمایاں حصہ بھی لیا تھا۔ ہندوستان کو یہ فکر دامنگیر تھی کہ اگر حیدرآباد شرکت سے انکار کردے (اور ۱۱ر جون ۱۹۴۷ء کو نظام نے ہندوستان اور پاکستان میں شرکت سے انکار کرتے ہوئے آزادی کا اعلان کر بھی دیا تھا) تو کیا ہندوستان قوت کے ذریعہ حیدرآباد کو شرکت پر مجبور کر سکتا ہے؟ کیا کشمیر کی طرح وہ جنوب میں بھی ایک فوجی محاذ کھول کر اپنی توجہات اور فوجی قوت کو منقسم کر سکتا ہے؟ ان دونوں سوالات کے جواب نفی میں تھے اس لئے حیدرآباد سے زیادہ ہندوستان کو مسئلہ حیدرآباد کے تصفیہ کے لئے مہلت کی ضرورت تھی۔ اگر حیدرآباد اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مستقل معاہدہ کے لئے اصرار کرتا تو اس کا قوی امکان تھا کہ حیدرآباد کو نہ صرف مناسب بلکہ اپنے حسب دلخواہ شرائط مل جاتے۔

حیدرآباد کے مسئلہ کو معرض التواء میں رکھنے سے پاکستان کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہندوستان کی توجہات کو بٹا ہوا رکھکر کشمیر پر اس کو اپنی پوری قوت مرتکز کرنے کا موقع نہ دیا جائے ۔ اس لئے قائد اعظم کا ہمیشہ یہی مشورہ تھا کہ شرکت کی بجائے معاہدہ کیا جائے اور گفت و شنید میں طوالت پیدا کر کے مناسب شرائط حاصل کی جائیں ۔ لیکن انھوں نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ گفت و شنید کو منقطع کر کے تعطل پیدا کیا جائے ۔

معاہدۂ انتظام جاریہ کے باوجود جب حیدرآباد کو شرکت پر مجبور کرنے کے لئے ہندوستان کی جانب سے سرحدی ہنگاموں اور معاشی ناکہ بندی میں شدت پیدا کی جانے لگی تو اتحاد المسلمین کی جانب سے ایک وفد قائد اعظم کو حیدرآباد کی صحیح صورتِ حال بتلانے کے لئے پاکستان گیا تھا ۔ قائد اعظم نے اس وفد کو باریاب نہیں کیا بلکہ یکم جون کو کوئٹہ سے اپنی سرکاری حیثیت میں ایک اعلامیہ جاری فرمایا :

> "ریاستوں کے معاملہ میں میری رائے حکومت ہندوستان اور حکومت حیدرآباد دونوں کو معلوم ہے ۔ مملکت آصفیہ ایک آزاد اور خود مختار ریاست ہے ۔ اسے اختیار حاصل ہے کہ وہ ہندوستانی یونین میں شمولیت اختیار کرے یا آزاد رہنے کا فیصلہ کرے ۔ حکومت ہند کے لئے یہ چیز کسی طرح جائز نہیں ہے کہ وہ مملکت آصفیہ کو شمولیت پر مجبور کرنے کے لئے دباؤ ڈالے کیونکہ ایسا کرنا اخلاق ، انصاف اور دیانتداری کے اصولوں کے خلاف ہے ۔ اور آزاد ریاستوں کے معاملہ میں ان اصولوں کا پاس رکھنا لازمی ہے ۔ مجھے یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ حیدرآباد اپنی آزادی اور خود مختاری کو برقرار رکھنے کے لئے جو جد و جہد کر رہا ہے اسے پاکستان ہی کے مسلمانوں

کی نہیں بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کی ہمدردی حاصل ہے۔ حیدرآباد
کو اپنی قسمت کا مناسب فیصلہ کرنے کی آزادی دی جانی چاہیئے۔ حیدرآباد
اور ہندوستان کے اس تنازعہ میں یہی واحد اور باعزت راستہ
رہ گیا ہے۔" (رہبر دکن ۶ رجون ۴۸ء)

پاکستان کے گورنر جنرل کے عہدہ پر فائز ہونے کے بعد قائدِ اعظم نے اپنی سرکاری حیثیت میں یہی ایک بیان دیا تھا جو اعلامیہ کے طور پر شائع کیا گیا۔ اس میں بجز ہمدردی کے حیدرآباد کو کوئی مادی امداد دینے یا انڈیا یونین کو اپنی حرکات سے باز رکھنے کے لئے اشارۃً بھی کوئی دھمکی نہیں دی گئی۔ یہ بیان بالکل اسی نوعیت کا ہے جو ان ہی ایام میں برطانوی وزیرِ اعظم کی جانب سے شائع ہوا تھا جس میں ہندوستان کو جارحانہ عزائم سے باز رکھتے ہوئے حیدرآباد کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ جون کے مسودۂ معاہدہ کی شرائط حیدرآباد کے لئے باعزت ہیں۔

قائدِ اعظم کی سرکاری اور نجی زندگی میں کوئی فرق نہ تھا۔ صداقت اور دیانت ان کی زندگی کا شعار تھا۔ کانگریسی لیڈروں کی طرح انھوں نے کبھی منافقانہ بیانات نہیں دیئے کہ دل میں کچھ ہے اور زبان پر کچھ ہے۔ اس لئے ان کے سرکاری اعلامیہ کے مندرجات کے علاوہ ان کا کوئی اور نجی خیال نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوا وہ دستوری اصول کے اتنے پابند تھے کہ بغیر اپنی کابینہ کے وہ کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے۔

حیدرآباد کے قائدین خصوصاً قاسم رضوی اور ان کے رُفقاء کی جانب سے ہندوستان سے مقابلہ کا جو بار بار اعلان کیا جاتا تھا اس سے بالعموم یہ غلط فہمی پیدا ہوتی تھی کہ شاید پاکستان حیدرآباد کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ لوگ ان افواہوں کی صداقت کو باور کرنے پر مجبور ہوتے تھے کہ پاکستان میں حیدرآباد کا

ایک ہوائی اسکوڈرن بمبئی، دہلی اور احمد آباد پر حملہ کرنے کے لئے تیار کھڑا ہے اور پاکستان حیدر آباد پر ہندوستان کی فوج کشی کے وقت ایک خاموش تماشائی کی حیثیت نہیں اختیار کرے گا۔ ان خبروں میں کتنی اصلیت تھی ہم ان کا تجزیہ کر کے دیکھیں گے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تقسیم ہند کے وقت فوجی اسٹور کا جو سامان پاکستان کے حصہ میں آیا تھا وہ آج تک ہندوستان نے پاکستان کو نہیں دیا۔ قیام پاکستان کے ابتدائی زمانہ میں پاکستان کے حصہ کی افواج تک ہندوستان کے مختلف فوجی مراکز پر منتشر تھیں جو رفتہ رفتہ پاکستان تک پہنچیں۔ اس کے بعد ہی کشمیر کا قضیہ شروع ہو گیا اور پاکستان کو اپنے پورے فوجی وسائل ہندوستان کے مقابلہ کے لئے مجتمع اور تیار رکھنے کی ضرورت درپیش ہوئی۔ اس کے علاوہ پاکستان اور حیدر آباد کے درمیان ایک ہزار میل کا ہندوستانی علاقہ واقع تھا۔ اس لئے پاکستان کے لئے عملاً حیدر آباد کی مدد کرنا ناممکن تھا۔ پھر اس فوجی امداد کے لئے پاکستان کو اپنے بین الاقوامی موقف کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری تھا۔ ساتھ ہی اس کا بھی قوی امکان تھا کہ جو جنگ اب صرف کشمیر کی حد تک محدود تھی حیدر آباد کو عملی طور پر امداد دینے کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں مکمل جنگ کی صورت میں تبدیل ہو جاتی جس سے مغربی پاکستان کے علاوہ مشرقی پاکستان میں بھی جنگ کا محاذ کھل جاتا۔ اور پھر اس کی کیا طمانیت تھی کہ پاکستان کی امداد کے بعد حیدر آباد کامیاب و کامران رہتا؟ ایسی جنگ کیا پاکستان کے وجود کے لئے خطرہ کا باعث نہ بن جاتی؟ یہی وجہ ہے کہ قائد اعظم نے کھل کر کبھی اس مسئلہ پر اظہار رائے نہیں فرمایا اور نہ کبھی ان کی سرکاری اور نجی رائے میں کسی قسم کا تضاد پیدا ہوا۔

لائق علی نے اپنی کتاب میں اس مسئلہ پر جس طرح روشنی ڈالی ہے وہ ملاحظہ ہو:۔

"حیدر آباد کے لئے یہ معلوم کرنا بہت اہم تھا کہ ہندوستانی فوج کے حیدر آباد پر حملہ کی صورت میں پاکستان واقعاً کیا موقف اختیار کرے گا۔ قائدِ اعظم جناح نے ایک سے زائد مرتبہ یہ اظہار فرمایا تھا کہ حیدر آباد پر ہندوستان کے فوجی حملہ کے بعد پاکستان خاموش تماشائی نہیں بنا رہے گا۔ یہ صحیح تھا۔ لیکن ایک زیادہ ٹھوس منصوبہ کے پیش کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ حیدر آباد کے ایجنٹ جنرل متعینہ کراچی کے ذمہ یہ کام کیا گیا تھا لیکن حالات کے سرعت پذیر تبدیلیوں کے باعث ان کو اصرار تھا کہ میں خود جلد از جلد کراچی پہنچوں۔"

قائدِ اعظم کے سانحہ ارتحال کے دو تین روز قبل لائق علی کراچی سڈنی کاٹن کے ہوائی جہاز میں پہنچے اور حیدر آباد کے ایجنٹ جنرل نے انھیں ایرپورٹ پر بتلایا کہ قائدِ اعظم کوئٹہ میں ہیں اور ایک ہوائی جہاز ان کو کوئٹہ لے جانے کے لئے تیار کھڑا ہے۔ لیکن کوئٹہ روانگی سے قبل وہ غلام محمد سے ملنے ان کی کوٹھی پہنچے اور اُن سے جو گفتگو ہوئی اس کی یہ تفصیل ہے:

"انھوں نے (غلام محمد) مجھ سے مختلف امور پر گفتگو کی، متعدد خفیہ رپورٹیں جو ان تک پہنچی تھیں اُن سے واقف کرایا اور یہ بتلایا کہ ہندوستان نے بیشتر میکانی ڈویژن کو پاکستان کی سرحد سے ہٹا کر حیدر آباد کے اطراف جمع کیا ہے۔ ان کے بموجب ہندوستانی فوج کی بیشتر تعداد یا تو حیدر آباد کے اطراف ہے یا وادیٔ کشمیر میں۔ میں نے ان سے پوچھا اگر پاکستان کی فوجیں ہندوستان پر حملہ کر دیں تو ہندوستان کی کیا حالت ہوگی۔ ایسی صورت میں' انھوں نے جواب دیا 'خفیہ رپورٹوں کے بموجب ہندوستانی افواج کے حیدر آباد پہنچنے کے قبل پاکستان کی فوجیں دہلی پہنچ جائیں گی۔ میں نے صاف طور پر پوچھا کہ حیدر آباد پر حملہ کی صورت میں پاکستان کیا امداد دے گا۔ انھوں نے کہا میرے سوال کا جواب صرف ایک شخص دے سکتا ہے اور وہ جناح ہیں۔۔۔۔"

اس گفتگو کے بعد لائق علی ہوائی جہاز سے کوئٹہ پہنچے لیکن قائدِ اعظم کی خرابیٔ صحت کے

باعث چار پانچ گھنٹوں کے انتظار کے باوجود اُن سے ملاقات نہ ہوسکی اور مایوس ہوکر یہ کراچی واپس لوٹ گئے۔ یہاں لیاقت علی خان، چودھری محمد علی اور ظفر اللہ خان سے ان کی تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ان سب کو قائدِ اعظم کے اس قطعی ارشاد کا علم تھا کہ حیدرآباد پر ہندوستان کے حملہ کی صورت میں پاکستان خاموش تماشائی نہ ہوگا لیکن اس سوال کا کوئی صاف جواب نہیں دے رہا تھا کہ حیدرآباد پر حملہ کی صورت میں پاکستان کیا قدم اُٹھائیگا۔ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ اس کا جواب صرف قائدِ اعظم جناح ہی دے سکتے ہیں۔ بہرکیف لائق علی اس طرح مایوس اور ناکام کراچی سے حیدرآباد واپس ہوئے۔

دو روز کے بعد قائدِ اعظم کا سانحہ ارتحال ہوا۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ پاکستان کی کابینہ ہندوستان کے خلاف مناسب اقدام کرنے کے لئے سوچ بچار کر رہی تھی لیکن قائدِ اعظم کی مفارقت کی وجہ سے کوئی فیصلہ کُن کارروائی نہیں کی جاسکی۔ ہندوستان کا متوقع حملہ جو ۲۲ ستمبر کو ہونے والا تھا قائدِ اعظم کے انتقال کے تیسرے ہی روز ہوگیا۔ خواجہ ناظم الدین نے گورنر جنرل کا چارج حاصل کرنے کے بعد اپنی پہلی نشری تقریر میں حیدرآباد کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ بلکہ اعتذار کے طور پر اُن احباب کا ذکر کیا جن سے پاکستان کو ہمدردی ہے لیکن جن کی امداد کے وہ موقف میں نہیں ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قائدِ اعظم کو حیدرآباد سے بے پناہ محبت تھی اور وہ حیدرآباد کو موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اگر ان کی عمر وفا کرتی اور ان کی زندگی میں حیدرآباد پر حملہ ہوتا تو معلوم نہیں قائدِ اعظم کس تدبیر سے حیدرآباد کی اعانت فرماتے۔ لیکن مشیت قائدِ اعظم کو حیدرآباد کی بربادی کا منظر دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ حیدرآباد کی قسمت میں تباہی مقدر ہوچکی تھی۔

۱۷

حیدرآباد کی حربی قوت

دکن پر اسلامی تسلط کے بعد ترکی، ایرانی، مغل اور پٹھان خاندان دکن میں سپہ گری کے سلسلہ میں آباد ہونے لگے اور ان ہی کے زورِ شمشیر سے دکن میں اسلامی حکومتوں کے چراغ جلتے رہے۔ بہمنی اور دکن کی پانچ سلطنتوں کے استیصال کے بعد جب دکن پر مغلیہ سلطنت اور اس کے بعد آصفجاہی خاندان کا اقتدار قائم ہوا تو آصفجاہ اول کے ساتھ دہلی سے ایک بڑی فوج بھی ان کی کمان میں دکن منتقل ہوئی تھی جو دکن وابستہ ہوگئی اور ان ہی خاندانوں میں فوجی روایات باقی رہیں۔

ہندوستان میں برطانوی عروج کی ابتداء میں جب ٹیپو سلطان کا انگریزوں نے اپنی چالبازیوں سے خاتمہ کردیا تو حیدرآباد کی طرف انھوں نے توجہ کی۔ اس کی فوجی قوت کو کبھی بڑھنے نہ دیا بلکہ امداد کے بہانے حیدرآباد کے اندر اپنی صیانتی فوج کو متعین کردیا۔ اس فوج کے اخراجات کے لئے برطانوی حکومت نے ریاستی علاقے اپنی تحویل میں لئے اور برار پر اسی حیلہ سے قبضہ کیا گیا۔ علاوہ ازیں انگریزی فوج بھی سکندرآباد و بلگری کی چھاؤنیوں میں متعین کی گئی۔ حیدرآباد کو بھی ایک چھوٹی سی فوج رکھنے کا اختیار دیا گیا جو تربیت اور اسلحہ کے اعتبار سے قابلِ تعریف نہ تھی۔

نواب میر محبوب علی خاں آصف سادس کے زمانہ میں امپیریل لانسرز ٹروپ کا قیام عمل میں آیا جس کی تربیت برطانوی ہند کی فوج کے طور پر کی گئی۔ ۱۹۳۹ء کے نظم جدید کی اسکیم کے تحت جو حکومت ہند کی پیش کردہ تھی نہ صرف حیدرآباد کی فوج میں اضافہ نہ ہوا

بلکہ اس کو جدید اسلحہ سے لیس کر کے ہندوستانی فوج کے معیار پر لایا گیا تاکہ حیدرآباد کے خرچ پر برطانوی اغراض کی تکمیل ہوسکے۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد کے اعلیٰ فوجی عہدوں پر برطانوی افسروں کو مقرر کیا گیا اور اس طرح برطانوی نگرانی اور کنٹرول میں حیدرآباد کی فوج کی تنظیم جدید عمل میں آئی۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں حیدرآباد کی فوج نے برطانوی فوج کے شانہ بشانہ کئی محاذ جنگ پر داد شجاعت دی۔ اس طرح حیدرآباد کی فوج کو موجودہ جنگ کا تجربہ حاصل ہوگیا تھا۔ لیکن اسلحہ کے معاملہ میں انگریزوں نے اپنے اغراض کی خاطر حیدرآباد کو ہمیشہ تہی دامن اور اپنا دست نگر رکھا۔ علاوہ ازیں حکومت ہند سے معاہدہ کے بموجب حیدرآباد کی فوج کسی صورت میں ایک ڈویژن سے زیادہ نہیں بڑھائی جاسکتی تھی۔

دوسری عالمی جنگ کے زمانہ میں جبکہ ہندوستان پر جاپان کے خطرہ کا قوی امکان پیدا ہوگیا تھا، حیدرآباد کو جنوبی ہند میں اتحادیوں کا سب سے بڑا فوجی مرکز قرار دیا گیا تھا نہ صرف یہاں اتحادی اور امریکی افواج کا زبردست اجتماع تھا بلکہ جدید ترین بھاری اسلحہ کے بڑے بڑے زمین دوز ڈپو قائم کئے گئے تھے۔ برن گن فیکٹری کے نام سے ایک بڑا اسلحہ سازی کا کارخانہ بیگم پیٹھ میں، جو شہر حیدرآباد کا ایک نواحی علاقہ ہے قائم کیا گیا۔ اختتام جنگ کے بعد جب اتحادی فوجیں حیدرآباد سے رخصت ہوئیں تو بھاری اسلحہ کے ذخائر جن میں دبابے، پرچل اور شرمن ٹینک اور دیگر جنگی اشیاء شامل تھیں یا تو تلف کر دی گئیں یا انھیں منتقل کیا گیا۔ اور حیدرآباد کو ان اسلحہ سے استفادہ کا موقع نہ مل سکا۔

برن گن فیکٹری کے قیام کے وقت ہی حکومت ہند سے اگر یہ معاہدہ ہو جاتا کہ اختتام جنگ پر یہ حیدرآباد کے تحویل میں دے دی جائیگی تو اسلحہ کی ایک مکمل فیکٹری حیدرآباد کو حاصل ہو جاتی۔ لیکن اس کے باوجود حکومت ہند ایک برائے نام قیمت پر جو پانچ سات کروڑ سے زیادہ نہ تھی یہ فیکٹری حیدرآباد کو دینے آمادہ ہوگئی تھی لیکن سر مرزا اسمٰعیل کے

صدارت عظمیٰ کے زمانہ میں محکمہ فینانس نے اپنی عادتی کوتاہ بینی کی بنا پر جو اس محکمہ کی فطرت ہے۔ سرمایہ کی عدم گنجائش کے عذر پر اس کارخانہ کے لینے سے انکار کرکے حیدرآباد کے مفاد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔

تقسیم ہند کے بعد حیدرآباد کی افواج باقاعدہ کی جملہ تعداد (۲۲) ہزار بیان کی جاتی ہے جو جدید اسلحہ سے لیس تھی (بشمول (۸) پچیس پونڈی توپوں اور تین بکتر بند رجمنٹوں کے) افواج بے قاعدہ کی تعداد دس ہزار ہوگی جس کے منجملہ ربع تعداد کے پاس چھوٹی قسم کے جدید اسلحہ ہوں گے اور بقیہ کے پاس بندوقیں تھیں۔ عروب اور پائیگاہ کی فوج بھی دس ہزار ہوگی جو فوج بے قاعدہ کے مماثل تھی۔ دس ہزار پولس اور کروڑگیری کے جوان تھے جن کے پاس اسٹن گن اور رائفلیں تھیں، ان کے علاوہ رضاکاروں کا تخمینہ دولاکھ کے قریب تھا جن کے قبضہ میں مختلف نوعیت کے اسلحہ، برچھے اور تلواریں تھیں۔ حیدرآباد کی فوج کے متعلق یہ ہندوستانی فوج کا مبالغہ آمیز سرکاری تخمینہ ہے[1]۔ افواج بے قاعدہ اور پائیگاہ کی فوج تو محض خوگیر کی بھرتی تھی جو کسی کام کی نہ تھی۔ پولس اور کروڑگیری کے جوانوں سے میدان جنگ میں کوئی کام نہیں لیا جاسکتا تھا۔ عروب خزانوں کی حفاظت کے سوا کسی اور کام کے اہل نہ تھے اور پائیگاہ کی فوج مدِ فضول تھی۔ البتہ اس زمانہ میں سرحدی پٹھان پانچ سات ہزار کی تعداد میں حیدرآباد آگئے تھے یا بلائے گئے تھے۔ ہندوستان کے سرحدی حملوں کے مقابلہ میں یہی پیش پیش رہتے تھے ان کی بودوباش اور ان کو اسلحہ کی سپلائی حکومت کی جانب سے ہوئی تھی۔ رضاکاروں میں سے بمشکل پانچ سات ہزار بندوق چلانا جانتے ہوں گے۔ لیکن ان سب کے پاس جدید اسلحہ نہ تھے۔ بیشتر کے پاس زمانۂ قدیم کی بھرمار بندوقیں تھیں۔ علاوہ ازیں رضاکاروں میں کوئی فوجی تنظیم نہ تھی اور وہ یہ تک نہ جانتے تھے کہ جنگ کس چڑیا کا نام ہے، موجودہ جنگوں کی ٹکنیک ہی کچھ اور ہے۔ ہوائی جہاز اور بمبار طیاروں کے بغیر کسی ملک کی جنگی طاقت کا اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔

---

[1] Fabulous Moghul. ol

حیدرآباد کے پاس ایک جنگی طیارہ تھا نہ ہوائی حملوں سے مدافعت کرنے والی توپیں تھیں۔ قاسم رضوی اور ان کے قریبی حلقوں نے ایک شہرت یہ دیدی تھی کہ پچاس بمباروں کا ایک دستہ حیدرآباد نے پاکستان میں قائم کیا ہے جو ہندوستان سے جنگ چھڑتے ہی بمبئی اور احمدآباد پر حملہ کرے گا۔ کے یم منشی نے بھی اپنی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ حیدرآباد کے ایک ذمہ دار عہدہ دار سے انھیں معلوم ہوا کہ پچاس بمباروں کا ایک دستہ جو پیکاک ایر بورن ڈویژن (Peacock Airborne Division) کے نام سے موسوم تھا حیدرآباد کی جانب سے پاکستان یا عراق میں تیار رکھا گیا ہے[1]۔ جنرل العیدروس نے زیکو سلواکیہ یا ڈائنس سے جدید اسلحہ کی بات چیت کی تھی اور اسٹریلوی ہواباز سڈنی کاٹن کراچی سے حیدرآباد اسلحہ کی سپلائی کیا کرتا تھا۔ پھر شہر حیدرآباد اور اکناف میں چھوٹے چھوٹے کارخانے ابھر گئے تھے جو بھرمار بندوقیں اور دیسی ساخت کے ریوالور بنا کر خوب تجارت کر رہے تھے۔ سرکاری ورک شاپوں میں بھی کچھ اسی نوعیت کا کام ہونے لگا تھا۔ مسلمانوں کے حوصلے بہت بلند تھے۔ وہ قاسم رضوی کو ملک کا نجات دہندہ سمجھتے تھے جن کے ہندوستانی فوج کے متعلق تمسخر آمیز بیانات سے حیدرآباد کے جذبۂ آزادی کو ہوا ملتی تھی۔

حیدرآباد کی فوج کی تعداد کے متعلق ہندوستان کا تخمینہ تو معلوم ہو گیا لیکن اس کی حقیقی تعداد کا حال لائق علی کی زبانی سنئے:

"حیدرآباد کی افواج کا بدترین پہلو اس کا انتہائی قلیل توپ خانہ تھا۔ پچیس پونڈی توپوں کی جملہ تعداد بیس بھی نہ تھی جنھیں مختلف محاذوں پر دباؤں کو روکنے کے لئے لگایا جاسکتا تھا۔ دوسرے مقامات پر صرف انفنٹری فوج تعینات تھی جس کی تعداد کہیں ایک کمپنی اور کہیں ایک بٹالین تھی۔ مستقر (ہیڈکوارٹر) اور یونٹوں کے درمیان لاسلکی پیام رسانی کا انتظام تھا لیکن ان آلات کی تعداد اتنی قلیل تھی کہ ساری

---

[1] The End of an Era.

یونٹوں سے ربط قائم نہیں تھا۔

حیدرآباد کے پاس دس انفنٹری بٹالین سے بھی کم فوج تھی جس کو ملک کے دفاع کے لئے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ دو ایک رجمنٹیں برائے نام تھیں اور ان سے کوئی کام نہیں لیا جاسکتا تھا۔ ان دس بٹالینوں کے لئے ساز و سامان اور اسلحہ انتہائی ناکافی تھے۔ یونٹوں کے پاس بیشتر ۳۰۳ قسم کی رائفلیں اور سٹن گنیں تھیں۔ ہر یونٹ کے پاس چھوٹی ساخت کی برن گنیں اور کچھ دو اور تین انچی دستی بم (mortars) تھے۔ دبابہ شکن سرنگوں کی مقدار بہت کم تھی جو اُن یونٹوں کو سپلائی کی گئی تھی جو دبابوں کے آنے کے متوقع راستوں پر متعین تھیں۔ تمام یونٹوں کو سب سے زیادہ جس چیز کی کمی محسوس ہو رہی تھی وہ میدانی توپوں کی قلت تھی۔"

معاہدۂ انتظام جاریہ کے بعد سرکاری طور پر اسلحہ سازی کے تین کارخانے قائم ہوئے۔ موتی محل گولکنڈہ میں ۳۰۳ ساخت کی رائفلیں بنتی تھیں۔ یہ کارخانہ راست لائق علی کی نگرانی میں تھا اور اس کے افسر اعلیٰ ایک چیف انجینئر تھے۔ یہاں چار پانچ سو کاریگر کام کرتے تھے۔ ابتداء میں مہینہ میں ایک رائفل تیار ہوتی تھی اور بعد میں ہفتہ میں ایک ہونے لگی۔ پیداوار کم ہونے کی وجہ سے (۳۰) سرحدی پٹھانوں کو درآمد کیا گیا۔ یہ لوگ ہر ہفتہ دو درجن رائفلیں تیار کرتے تھے جو صفائی اور ساخت میں مشین سے بنی ہوئی رائفلوں سے بہتر ہوتی تھیں۔ اس کارخانہ سے بمشکل ڈیڑھ ایک ہزار رائفلیں تیار ہوئیں جو اتحاد المسلمین کو مفت تقسیم کی گئیں۔ دوسرا کارخانہ (Second Echelon Workshop) رسالہ جوش خیریت آباد میں قائم ہوا تھا جہاں اسٹن گن اور کارتوس کے پیتل کے خول بنتے تھے۔ اس کارخانہ نے ڈھائی تین ہزار اسٹن گن تیار کئے ہوں گے۔ تیسرا کارخانہ قادر باغ فرسٹ لانسرز میں قائم ہوا تھا یہاں کارڈائٹ اور (Fulminate of mercury) (رائفل کی گولی کا مسالہ) تیار ہوتا تھا۔

اس کے علاوہ مشہور آسٹریلوی ہوا باز سڈنی کاٹن نے اطالوی ساخت کی اسٹن گن اور Para Troop Rifles اور کچھ اسلحہ حیدرآباد پہنچائے تھے۔

جنرل العیدروس افواج باقاعدہ کے کمانڈر تھے۔ خود فوجی حلقوں میں ان کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ لیکن چونکہ یہ قاسم رضوی کے رشتہ کے بھائی تھے اس لئے قاسم رضوی کو ان پر پورا اعتماد تھا۔ خود فوج کے اندر ہندوستانی فوج سے مقابلہ کے لئے کسی قسم کی تیاری نظر نہیں آتی تھی۔ اخبارات میں جنرل العیدروس کا ایک بیان بھی شائع ہوا تھا جس میں حیدرآبادی فوج کی عالی ہمتی (morale) کی بڑی تعریف کی گئی تھی۔ جنرل العیدروس برما کے محاذ جنگ پر رہ چکے تھے اور انھیں دوسری عالمگیر جنگ کا تجربہ حاصل تھا۔ چنانچہ جب ایک انگریز جنرل سے ہندوستانی حکومت نے جنرل العیدروس کی صلاحیتوں کے متعلق مشورہ کیا تو العیدروس کو بہترین ہندوستانی جنرلوں میں شمار کرکے یہ تبلایا گیا کہ معمولی تربیت یافتہ فوج بھی العیدروس کے ہاتھوں میں کارہائے نمایاں انجام دے سکتی ہے۔ اس رائے کو انتہائی راز قرار دیکر ہندوستان کے اعلیٰ فوجی حلقوں میں گشت کیا گیا تھا۔[ل]

حیدرآباد کی افواج باقاعدہ کی تعداد کو ۲۲ ہزار اور جدید بھرتی کے بعد ۳۰ ہزار بھی قرار دیا جائے تو اس کے ذمہ بیاسی ہزار مربع میل کے رقبے کی حفاظت تھی ظاہر ہے کہ یہ فوج قطعاً ناکافی تھی۔ لائق علی جو وزیر دفاع بھی تھے فوج کی تعداد کو دس بٹالین یا تقریباً آٹھ ہزار بتلاتے ہیں گویا اس طرح حیدرآباد کے ہر دس ہزار مربع میل کی حفاظت کے لئے ایک ہزار یا ہر دس میل کی حفاظت کی ذمہ داری ایک عدد فوجی جوان پر تھی۔ حیدرآباد کے اہم سرحدی مراکز پر فوج کی جو تقسیم عمل میں آئی تھی اس کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ سقوط حیدرآباد کے ہفتہ عشرہ قبل مصنف کتاب ہذا کو حکومت اور فوج کے چند اعلیٰ عہدیداروں

ل۔ The Integration of States.

کے ساتھ گلبرگہ تا رائچور کے علاقہ کا دورہ کرنے کا اتفاق ہوا' دورہ کنندہ عہدہ داروں میں جنرل العیدروس کے نائب جنرل اشرف' برگیڈیر علی احمد ایریا کمانڈر' عبدالحمید خاں وزیر پولس' عبدالرؤف وزیر تعمیرات' عبداللہ خاں صوبیدار (چیف کمشنر) گلبرگہ اور رائچور کے مہتمم (سپرنٹنڈنٹ) پولس تھے۔ تقریباً چار پانچ روز کا یہ دورہ ایک جیپ وان میں ہوا اور رائچور اور گلبرگہ کے درمیان ساری فوجی چوکیوں کا معائنہ کیا گیا۔ اہم مراکز پر حیدرآبادی فوج کی ایک کمپنی متعین تھی جس کی تعداد بیس پچیس جوانوں سے زیادہ نہ تھی اور انھیں بندوقوں کے علاوہ ایک آدھ برن گن مہیا کی گئی تھی خود ایریا کمانڈر کو فوج کی اس قلت تعداد کا شدید احساس تھا' انھوں نے ہر مرکز پر اپنے عہدہ دار سے یہ شکایت کی کہ نہ صرف فوج کی تعداد میں اضافہ کیا جائے بلکہ انھیں کارتوس بھی وافر مقدار میں مہیا کئے جائیں۔ ایریا کمانڈر کا سب سے حیرت انگیز انکشاف تو یہ تھا کہ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس علاقہ میں اگر ہندوستانی فوجوں سے باقاعدہ جنگ کی نوبت آئے تو انھیں کیا کرنا ہے' اقدام کی کیا صورت ہوگی اور مراجعت کس طرح عمل میں آئے گی؟ ان کا بیان تھا کہ فوج کی ہر حرکت خواہ وہ اقدام ہو یا مراجعت ایک منصوبہ یا پلان کی پابند ہوتی ہے۔ جس کی تیاری بہت پہلے کی جاتی ہے۔ ہٹلر نے افریقہ پر حملہ کا منصوبہ دو سال پہلے تیار کیا تھا جس میں فوجی اقدام اور مراجعت سے قطع نظر موسم کے شدائد اور پانی کی قلت کے مقابلہ کرنے تک کی جزئیات کا پہلے سے انتظام کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جنرل رومل کے برق رفتار اقدام اور مراجعت میں منصوبہ کی معمولی خلاف ورزی نہ ہوئی اور جنگوں کی تاریخ میں رومل کا نام سنہری حروف میں محفوظ ہوگیا۔ حیدرآباد کے سپہ سالار نے اپنی فوج کے لئے ایسا کوئی منصوبہ تیار نہیں کیا تھا۔ برگیڈیر علی احمد نے حیدرآباد کی فوج کی بے بضاعتی کا جس طرح اس دورہ میں ماتم کیا تھا اس کا نقشہ آج تک میری آنکھوں میں گھومتا ہے۔ اس کے ایک ہفتہ کے بعد ہی ہماری فوجی طاقت اور فوجی قیادت کی

قلعی کھل گئی۔

ہندوستانی فوج کے حملہ کے دوران میں حیدرآبادی فوج کے اندر جو افراتفری مچی ہوئی تھی اس کی یہی وجہ تھی کہ فوج کو اس کے سپہ سالار نے کسی منصوبہ کا پابند نہیں کیا تھا۔ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی پلان ہوتا بھی تو کیا حیدرآبادی فوج جس کے پاس ایک دبابہ (ٹینک) تھا اور نہ ایک ہوائی جہاز ہندوستان کی فوجی قوت کا مقابلہ کرسکتی تھی جس کے پاس سینکڑوں ہوائی جہاز اور دبابے تھے اور جو تربیت اور تعداد کے اعتبار سے حیدرآباد کی فوج سے کہیں زیادہ تھی اور ایک سال سے حیدرآباد پر حملہ کرنے کا منصوبہ کر رہی تھی۔ ممکن ہے قاسم رضوی اور حکومت حیدرآباد اس خوش فہمی میں مبتلا ہوں کہ حیدرآباد پر حملہ کے ساتھ ہی پاکستان ہندوستان کے خلاف اعلانِ جنگ کردے گا۔ لیکن یہ خود فریبی تھی۔ قائداعظم نے غیر مبہم الفاظ میں فرما دیا تھا کہ وہ حیدرآباد کی فوجی امداد کے سلسلے میں ایک بندوق بھی نہیں دے سکتے۔ خود پاکستان میں اسلحہ کی قلت تھی کیونکہ ہندوستان نے ملٹری اسٹورس کی تقسیم سے انکار کردیا تھا۔ کشمیر میں پہلے ہی سے دونوں ملکوں کی فوجیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھیں۔ پاکستان کی ان مشکلات کا کیا حیدرآباد کے قائدین کو علم نہیں تھا اور کیا حالات اور قرائن سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا تھا؟ خود قاسم رضوی کو یہ اعتراف تھا:-

"آج ہماری حالت زار دیکھئے کہ اپنی حفاظت کے لئے ٹینک اور توپ تو کجا خودکشی کے لئے چھری بھی نہیں ہے۔"

"کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی کمزوریوں سے اغیار ناواقف ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آپ غلطی پر ہیں۔ غور سے سنئے۔ انھیں معلوم ہے کہ آپ کے ہاں کتنے کارتوس اور کارتوس کے خول ہیں۔ ہنکن کے زمانہ کی بھربار بندوقیں کتنی ہیں کتنی چالو حالت میں اور کتنی زنگ آلود ہوگئی ہیں۔"

مسلمانانِ عالم! ملتِ اسلامیہ دکن کا حال سنو۔ ہم سات سو برس سے مطمئن
اور مرفہ الحال تھے لیکن آج انتقام کی بجلیاں چمک رہی ہیں۔ ہمارا سات سو سالہ
تمدن تباہ ہونے والا ہے۔ تمہارے بھائی قتل ہونے والے ہیں، تمہاری بہنوں کی
آبرو ریزی ہونے والی ہے اور تمہارے بچے غلام ہونے والے ہیں ـــ اور ہم اپنے
چاہنے والوں سے ایک ہزار میل دور موت کا انتظار کر رہے ہیں، ہمارا مقابلہ درندوں
سے ہے، اُن سے ہے جن سے پاکستان اور کشمیر کا مقابلہ ہو رہا ہے اور جنھوں نے
آپ کے ساڑھے چار کروڑ بھائیوں کو غلام بنا لیا ہے۔"

حالات کا اتنا صحیح اندازہ رکھتے ہوئے پھر کیوں موت کو دعوت دی گئی؟ دنیا میں کمزوری
خود موت کی نشانی ہوتی ہے۔ اپنی کمزوریوں، کوتاہیوں اور بے بضاعتیوں کا پورا علم
رکھتے ہوئے کیوں پوری قوم کو آگ میں جھونکا گیا؟ ہندوستانی فوج کے حملہ کے پہلے
جس قسم کی تقاریر اور بیانات اخبارات میں قائدین کے نام سے شائع ہوتے تھے ان
سے حیدرآباد کی مستحکم حربی قوت کا اندازہ لگایا جاتا تھا اور عوام اس غلط فہمی میں مبتلا تھے
کہ حیدرآباد کی طرف ہندوستان آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ ذیل میں چند
نمونے ملاحظہ ہوں :-

"قوموں کی تقدیر نوکِ قلم سے نہیں بلکہ نوکِ شمشیر سے بنا کرتی ہے۔ اتمامِ حُجت کے
لئے گفتگوئے مصالحت کی آخری کوشش کی جا رہی ہے حیدرآباد اتمام حجت کر چکا،
ملک کی تقدیر ملک کے سیاست داں نہیں بنائیں گے بلکہ ملک کی تقدیر کے حقیقی معمار
ملک کے رضاکار سپاہی ہوں گے آزادی کا معاہدہ خون سے لکھا جائے گا۔ میں اپنے
بادشاہ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ جس طرح ان کے ساتویں دادا دہلی سے حیدرآباد آئے
تھے اور یہاں آکر انھوں نے ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی اسی طرح ان
کا دہلی کی طرف جانا مجھے ایک واضح صورت میں نظر آ رہا ہے۔ پرچم آصفی کو ہم

دہلی کے لال قلعہ پر لہرائیں گے۔ پھر ایکبار ساحل موسیٰ کو ساحل جمنا سے ملا دینے کی
ضرورت ہے۔ خاندان مغلیہ کا چراغ پھر حیدرآباد سے روشن ہوگا غزنوی اور عالمگیری
قوتیں پھر تاریخ دُھرائیں گی۔ ہم پانی پت کی لڑائیوں میں فتح یاب رہے ہیں۔ میں
اپنے سر سے کفن باندھ چکا۔ اگر آج مسلمان چاہے تو حیدرآباد میں ایک ہندو کا
بھی سر باقی نہیں رہ سکتا۔ حیدرآباد کی آزادی جمنا کے کنارے لال قلعہ میں طے نہیں
ہوگی بلکہ وہ موسیٰ ندی کے کنارے اور قلعہ گولکنڈہ میں طے ہوگی"

قاسم رضوی ۹ رجون ۱۹۴۸ء

"آج چھ مہینے سے مسلسل کہا جارہا ہے کہ حیدرآباد پر حملہ ہوگا۔ ایسے کئی چھ سو سال
ہوجائیں تو ہندویونین حیدرآباد پر حملہ نہیں کرسکتی اگر وہ حیدرآباد پر حملہ کرے گی تو
خود تباہ و برباد ہوجائے گی۔ جس دن حیدرآباد پر ایک قدم بھی بڑھایا گیا تو میں
لال قلعہ کا ذمہ دار نہیں ایک آگ ہوگی جو ہر سمت پھیل جائے گی"

قاسم رضوی ۲۷ رجولائی ۱۹۴۸ء

"حیدرآباد کے ساتھ چھیڑ چھاڑ خود ہندوستان کو تباہ کردے گی۔ ولبھ بھائی
پٹیل ہندوستانی فوجی قوت سے جوناگڈھ جیسی چھوٹی ریاست کو تباہ کرکے خوش
ہیں اور کہتے ہیں کہ حیدرآباد کا حشر جوناگڈھ جیسا ہوگا۔ یہ یاد رکھا جائے کہ حیدرآباد
کا حشر جوناگڈھ کا ایسا ہوگا تو لال قلعہ کا اس سے بدتر ہوگا"

قاسم رضوی ۲۸ رجولائی ۱۹۴۸ء

"انڈیا یونین کے حکومتی ریڈیو اور پریس کے سر میں سودا سما گیا ہے۔ وہ تو اب
رضاکار کی قسمیں کھانے لگے ہیں اور وظیفہ پڑھنے لگے ہیں۔ اب تک رضاکار
تنظیم کو بدنام کیا جارہا تھا۔

رضاکارو! اب ملک وملت کے لئے جان دینے کا وقت آگیا ہے۔ انڈیا یونین

نے ہتیہ کر لیا ہے کہ اب ملت اسلامیہ دکن کو ختم کیا جائے ۔ اب میدان کارزار ہی میں مسلمانوں کی حیات ہے ۔۔۔۔ ‘‘ (قاسم رضوی یکم اگست ۴۸ء)

" مجھ سے پوچھا گیا ہے کہ حیدرآباد کے پاس وہ کون سی طاقت ہے جس کے بل بوتے پر وہ تمام خطرات کے اُٹھتے ہوئے طوفانوں میں مضبوط چٹان کی طرح جما ہوا ہے ۔ میرے پاس اس کا جواب اخلاقی بلندی اور قوت ایمانی کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ یہی ہمارا طرۂ امتیاز ہے ، اگر یہ ہمارے پاس سے نکل گیا تو ہم سب کچھ کھو دیں گے ۔ جب ہمسایہ ملک نے ہم کو آزمانے کا ہتیہ کر لیا ہے تو ہم نے بھی بہر نوع مؤثر مقابلہ کرنے کا عزم بالجزم کر لیا ہے ‘‘

لائق علی یکم جولائی ۴۸ء

" حیدرآباد کا عزم آزادی اپنے پیچھے اُن لاکھوں انسانوں کی قوت رکھتا ہے جو آزاد رہنے اور آزاد مرنے کا اٹل اور مستحکم ارادہ رکھتے ہیں ۔ ہم اپنے ہر آرام و آسائش کو اپنی آزادی و عزت و آبرو کی خاطر ہنسی خوشی قربان کرنے کو تیار ہیں ۔ ہم نہ سرحدی حادثات سے ڈرتے ہیں اور نہ ہمیں کسی اور بات کا خطرہ ہے ۔ ہم ہر صورت حال کے مقابلہ کے لئے تیار ہیں ‘‘

لائق علی ۳ر جولائی ۴۸ء

" حیدرآباد ہندوستان میں کبھی شریک نہ ہوگا اور جتنا دباؤ ہندوستان ڈالے اتنا ہی مقاومت کا ہمارا عزم بڑھتا جائے گا ۔ ہماری فوج لڑنے کے لئے پوری طرح تیار ہے ۔ اگر ہندوستان قوت کا استعمال کرے حیدرآباد پر فوجی قبضہ سے ہندوستان میں ہر جگہ فرقہ واری آویزش کم از کم پانچ سال تک جاری رہیگی ‘‘

لائق علی ۱۱ر اگست ۴۸ء

یہ چند بیانات مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر حیدرآباد کے اُن دو زعماء کے ہیں جن

کے ہاتھ میں مسلمانوں کی قسمت کی باگ ڈور تھی۔ اگر ان کے ساتھ اتحادی وزراء اور دیگر
ذمہ دار عہدہ داران اتحاد المسلمین کے بیانات کو ملایا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ
ارباب قوم نے حیدرآباد کی آزادی کی خاطر ہندوستان سے جنگ کا فیصلہ کر لیا تھا۔
ایک وزیر با تدبیر نے ضلع ناندیڑ کے ذمہ دار عہدہ داروں کے سامنے کہا کہ اگر حیدرآباد
پر ہندوستان حملہ نہیں کرے گا تو ہم ہندوستان پر حملہ کرنے کے موقف میں ہیں۔ اسی لئے
مسلمانوں میں آزادی کا عزم اور اس کی حفاظت کے لئے ہر قسم کے ایثار اور قربانی کے
جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ عوام نے لبیک کہا اور جب ان کے سنجیدہ عناصر
نے نبض ٹٹولنے کی کوشش کی تو انھیں یہ کہکر خاموش کیا گیا کہ یہ رموز مملکت ہیں ہر کہ و
مہ کے سامنے انھیں آشکار نہیں کیا جا سکتا۔ لوگ اسلحہ کی قلت کی شکایت کرتے تو انھیں
یہ کہکر تھپکایا جاتا:

"اسلحہ! اسلحہ! ہمارے پاس نہیں ہیں لیکن یقین کیجئے کہ اگر آپ کو اپنی
ذات پر بھروسہ اور مقصد کی سچائی پر اعتماد ہے تو زمین اسلحہ اُگلے گی، آسمان
اسلحہ برسانے لگیں گے"۔ (قاسم رضوی)

رضاکاروں کے مظالم کا ہندوستان کی جانب سے جو منظم پروپیگنڈا ہوا اس کا مقصد بجز
اس کے کچھ نہ تھا کہ اپنے جرائم کو چھپا کر حیدرآباد پر فوجی حملہ کا جواز تلاش کرنے کے لئے
رائے عالم کو متاثر کیا جائے۔ اپنے مقصد کے حصول میں ہندوستان صد فی صد کامیاب
رہا لیکن حیدرآباد کے ذی ہوش قائدین نے ہندوستان کے پروپیگنڈے سے یہ مطلب
اخذ کیا کہ رضاکار قوت سے ہندوستان مرعوب ہو گیا ہے، اس کی فوج لرزہ براندام
ہے اور ہندوستان میں ان شیر دلوں سے مقابلہ کی تاب نہیں ہے۔ لیکن ان کے ذہنوں
میں کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ اسکول اور کالجوں میں پڑھنے والے یہ ہونہار نازونعم میں
پرورش پائے ہوئے نوخیز لڑکے ایک تربیت یافتہ جدید ترین اسلحہ سے لیس اور بہیمی قوت والی

فوج سے کیسے مقابلہ کرسکیں گے؟ ان قائدین کی آنکھیں اُس وقت بھی نہیں کھُلیں جب جنرل العیدروس نے جنگی محاذوں سے فوجوں کو واپس بلا کر رضاکاروں کو محاذ پر روانہ کرنا شروع کردیا۔ ایسے وقت قوم کے یہ "فیلڈ مارشل" ان نوجوانوں کو یہ تلقین فرماتے تھے کہ وہ بابے اور ٹینک کوئی چیز نہیں، تم ان کی زنجیروں میں اپنے پیر اٹکا دو تو یہ ناکارہ ہوجائیں گے اور تمہارے عزم کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ان لڑکوں نے اپنے لیڈر کے حکم کی اتباع میں یہی عمل کیا اور سینکڑوں کی تعداد میں دبابوں کے نیچے کچل کر رہ گئے۔

۱۸

حیدرآباد پر فوجی حملہ

حیدرآباد پر حملہ سے ہفتہ عشرہ قبل ہی حیدرآباد کے گلی کوچوں میں یہ افواہیں پھیلنے لگی تھیں کہ حیدرآباد پر حملہ ہوا چاہتا ہے۔ شہر پر اداسی اور ہراسانی طاری ہونے لگی تھی شولاپور کے فوجی مستقر کی بعض موثق اطلاعات حیدرآباد کے بعض بہی خواہوں نے قاسم رضوی اور لائق علی تک پہنچائیں لیکن اول الذکر کے پاس تو یہ قہقہوں کی گونج میں تحلیل ہوگئیں اور ثانی الذکر انھیں باور کرنے تیار نہ تھے۔ ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو قائد اعظم کا انتقال ہوا اور ۱۲ر ستمبر کی شام کو قائد اعظم سپرد خاک کئے گئے۔ حیدرآباد کے مسلمانوں میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی اور ابھی ان کے آنسو خشک بھی نہ ہوئے تھے کہ ہندوستان نے ۱۳ر ستمبر کو حیدرآباد پر فوجی حملہ کر دیا۔ حیدرآباد کے قائدین کو اپنی طاقت و قوت پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہندوستان کو حملہ کی دعوت دیتے تھے۔ اور ہندوستان کی فوجی قوت کو کبھی خاطر میں نہ لایا کرتے تھے۔ اب حیدرآباد کی قوت اور قیادت دونوں کی آزمائش کا وقت آگیا تھا۔ اس دن کے لئے پوری قوم ایثار و قربانی کے لئے تیار کی گئی تھی اور عامۃ الناس کو یہ توقع تھی کہ حیدرآباد کی افواج اور رضاکار ہندوستان کی فوجی طاقت کا قلع قمع کرتے ہوئے دہلی پہنچ کر لال قلعہ پر پرچم آصفی لہرا دیں گے اور ساحل جمنا اور موسیٰ میں اتصال قائم ہو جائے گا۔ دو ایک روز حیدرآباد کے ریڈیو نے مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند رکھنے کی کوشش کی لیکن ہندوستانی فوج

جس نے (۲۲) محاذوں سے حیدرآباد پر حملہ کیا تھا شہر حیدرآباد کی طرف بڑھتی ہی گئی۔
قاسم رضوی کو جنرل العیدروس کی فوجی صلاحیتوں اور کردار دونوں پر پورا
بھروسہ تھا لیکن العیدروس سے استفسار پر ہمیشہ انھیں یہ جواب ملتا رہا کہ جنگی
نقطۂ نظر سے وہ محاذ کے دائرے کو تنگ کر رہے ہیں تاکہ شہر کے قریب مؤثر مقابلہ
کیا جائے۔ اسی لئے العیدروس کے حکم کی بنا پر فوجیں محاذ سے پیچھے ہٹ رہی تھیں
اور رضاکاروں کو محاذ پر بھیجا جا رہا تھا۔ ۱۳؍ اور ۱۴؍ ستمبر کو دارالسّلام میں نوجوانوں
کے ایثار اور قربانی کے ایسے روح پرور نظارے دیکھے گئے جو حریت کی تاریخ میں ہمیشہ
زرین حروف سے لکھے جائیں گے۔ جنرل العیدروس نے کسی خاص محاذ پر بھیجنے
کے لئے غالباً ایک ہزار رضاکاروں کو طلب کیا تھا۔ قاسم رضوی نے وطن کی مدافعت
کے نام پر نوجوانوں سے اپیل کی اور کالج اور مدرسہ کے نوجوان لڑکے ایک کثیر تعداد
میں اپنے والدین سے اجازت یا بالفاظِ دیگر اپنی ماؤں سے دودھ بخشائے بغیر لاریوں
میں لدکر محاذ پر روانہ ہوگئے۔ انھیں نہ کبھی عسکری تربیت ملی تھی اور نہ انھیں یہ
معلوم تھا کہ جنگ کس چڑیا کا نام ہے۔ فوجی تربیت یافتوں کی ضرورت یوں نہیں
بتلائی گئی کہ انھیں صرف مالوٹوف کاک ٹیل" بم[۵] دشمن کے محاذوں پر پھینکنا تھا عجیب
جوش و خروش کا عالم تھا۔ آج بھی قاسم رضوی کی تقریر کے چند جملوں کی گونج میرے
کانوں میں باقی ہے۔ نوجوانوں سے یہ کہا گیا کہ ان کے آہنی عزم کے سامنے دبابوں اور
ٹنکوں کی کوئی حقیقت نہیں وہ اگر ان کی زنجیروں میں اپنے پیر اٹکا دیں تو یہ بیکار ہو جائیں گے
لیکن حیدرآبادی فوج کے محاذ سے منہ موڑنے اور رضاکاروں کے قتل عام کے باوجود ہندوستانی
فوج جب آگے بڑھتی ہی گئی تو قاسم رضوی بوکھلا گئے اور ان کی ہستی گم ہوگئی۔ قیادت کا ایوان
پاش پاش ہوگیا۔ ہزاروں مسلمان اضلاع اور دیہات سے جان بچانے کے لئے شہر میں
داخل ہونا شروع ہوئے۔ حیدرآباد کے سارے اضلاع میں ہندوستانی فوج اور ہندو غنڈوں نے

---

[۵] "مولوٹوف کاک ٹیل" کا نام دوسری عالمگیر جنگ میں اُن بموں کو دیا گیا تھا جو سوڈے کی خالی بوتلوں میں پٹرول اور دیگر کیمیائی اجزا ڈال کر تیار ہوتا تھا۔

مسلمانوں کے خلاف انتقام کے جہنم دہکائے لیکن ابھی لائق علی اور ان کی وزارت اپنی کرسیوں پر متمکن تھی۔ ہندوستان کی فوج لمحہ بہ لمحہ شہر حیدرآباد کے قریب ہوتی جا رہی تھی اور اضلاع دارالخلافہ سے کٹ چکے تھے۔ اب شہر حیدرآباد کو بچانے کا سوال تھا جو مسلمانوں کی طاقت و قوت، تہذیب و تمدن اور دولت و ثروت کا گہوارہ تھا۔ ہندوستانی حملے کے کوئی پانچویں روز لائق علی کی وزارت نے استعفا پیش کیا۔ ۱۷ ستمبر کو ریڈیو پر لائق علی کی یہ تقریر نشر ہوئی :-

" ہندویونین کی فوجوں نے کوئی اطلاع دیئے بغیر حیدرآباد کے علاقہ میں کئی سمت سے اقدام شروع کر دیا ہے۔ باوجود ہمارے محدود وسائل کے ہم نے مقدور بھر کوشش کی لیکن بقیہ پانچ دن کے تجربہ نے یہ بتلایا کہ ہندوستانی افواج نے غیر معمولی کثیر تعداد میں عصری اسلحہ خصوصاً ٹنک، دبابے اور بمبار ہوائی جہازوں کے ساتھ ایک ایسے پیمانہ پر حملہ کیا ہے جس کا کبھی بھی پیش از پیش اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ آج اس لڑائی کے آغاز کا پانچواں دن ہے اور کئی مقامات سے ہم کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ مزید مقاومت سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ اس کے معنی سوائے اپنی فوجوں کو کٹوا دینے کے اور کچھ نہ تھے اور آج اعلیٰحضرت نے ۵ بجے سے مطلع فرمایا ہے کہ ان (انڈیا یونین) کی افواج بلارم اور سکندرآباد میں داخل ہو سکتی ہیں اور نیز یہ کہ رضاکارانہ تنظیم موقوف کر دی جائیگی۔۔۔"

لائق علی کی تقریر کے قبل قاسم رضوی نے اسی دن ریڈیو سے اپنی آخری تقریر نشر کی جو شکست خوردگی اور پست ہمتی کا بدترین نمونہ تھا۔ لال قلعہ پر جھنڈا گاڑنے والا قائد جو ہمیشہ ہندوستانی فوج کو اپنے کیفر کردار پر پہنچانے کے لئے حیدرآباد پر حملہ کی دعوت دیتا رہا آج اُن سے کہہ رہا ہے :

" جاؤ مسلمانو! اپنی بدقسمتی پر روؤ۔ قوموں پر ایسا دن آتا ہے۔۔۔۔ تم نے

ہمیشہ بحیثیت صدر مملکتی مجلس اتحاد المسلمین مملکت آصفیہ اسلامیہ میری بات مانی ہے۔ آج بھی میں تم کو بحیثیت صدر مملکتی مجلس اتحاد المسلمین مملکت آصفیہ اسلامیہ حکم دیتا ہوں کہ اپنے ہتھیار واپس کر دو، تبدیل شدہ حالات کا مقابلہ کرو اور اپنی ماؤں، بہنوں کی عزت اور ناموس کی حفاظت کرو۔ ہندوستان نے اپنی عظیم تر فوجی قوت سے حیدرآباد پر حملہ کر دیا ہے جس کا ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ۔۔۔۔۔۔"

اس روز قاسم رضوی کوئی تقریر ہی نہ کرتے تو بہتر تھا۔ تقریر کر کے انھوں نے اپنی قیادت کے تابوت میں آخری کیل خود اپنے ہاتھوں ٹھونک لی۔ قوم کو ایسی ہراسانی اور شکستہ خوردگی میں مبتلا کیا جس سے آج تک اس کو چھٹکارا نہیں ملا۔ اگر شہر حیدرآباد کو بچانے کے لیے انھوں نے یہ تقریر کی تھی تو یہ بھی ان کی آخری خود فریبی تھی۔ قوم کا ان پر سے اعتماد اٹھ چکا تھا۔ نہ صرف انھوں نے اپنے وقار کو ملیامیٹ کیا بلکہ قوم کو دھوکہ دیا۔ اب ان کا حکم نہ حکم کی حیثیت رکھتا تھا اور نہ مشورہ مشورہ۔ شہر حیدرآباد پر قیامت کا سماں طاری تھا۔ ہر شخص نفسا نفسی میں مبتلا تھا اور اس کے پیش نظر صرف اپنے خاندان کا تحفظ تھا۔ شہر حیدرآباد کو بچانے کا سہرا صرف نظام کے سر ہے ورنہ قائدین اور حکومت کی ناعاقبت اندیشی سے اگر شہر ہندو فوج کے حرص و آز کا شکار بنتا تو آج شہر حیدرآباد میں مسلم تہذیب و ثقافت کے جو بچے کھچے آثار باقی رہ گئے وہ ختم ہو جاتے اور مسلمانوں کے خون سے وہ ہولی کھیلی جاتی کہ دہلی اور بہار کے واقعات ماند پڑ جاتے۔

اسی شام نظام نے پہلی مرتبہ حیدرآباد کے ریڈیو سے تقریر نشر کی۔ اس تقریر کا مسودہ کے یم منشی، ایجنٹ جنرل ہندوستان کا مرتب کردہ تھا جس سے پہلی مرتبہ ۷ ارستمبر کو نظام کی ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن واقعات یہ بتلاتے ہیں کہ آخری ایام میں جبکہ مفاہمت کا کوئی امکان باقی نہ رہا تھا اور چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی نظام نے اپنے ایک درباری

(غالباً ہوش بلگرامی) کو کے یم منشی سے ملنے بھیجا تھا جس نے یہ یقین دلایا تھا کہ اگر ہندوستانی فوجوں کو سکندرآباد میں داخلہ کی اجازت دی جائے اور حیدرآباد کی وزارت مستعفی اور رضاکار تنظیم تحلیل کردی جائے تو حیدرآباد کے اندرونی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کی جائیگی اور ہندوستان اور حیدرآباد کے آئندہ تعلقات کی تشکیل اس جدید حکومت کے ذمہ ہوگی جو لائق علی کابینہ کے بعد آئے گی۔ چنانچہ اس یقین آفرینی پر نظام نے ہندوستانی فوجوں کی آمد، کابینہ کو برخواست اور رضاکاروں کی تحلیل کے اعلان کے ساتھ ہزہائی نس پرنس آف برار کی سرکردگی میں حیدرآباد کی حکومت چلانے کے لئے ایک مجلس مشاورت کا اعلان کیا جس کو سابقہ حکومت کا جانشین تصور کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جب ہندوستانی فوجیں سکندرآباد میں داخل ہوگئیں اور حیدرآبادی فوج نے ہتیار ڈال دئے تو نظام اور کے یم منشی کے درمیان جو سمجھوتہ ہوا تھا اس کو یک لخت پس پشت ڈال دیا گیا۔ ملٹری گورنر پورے نظم ونسق کا ذمہ دار بن گیا' ملک میں مارشل لا کا نفاذ ہوگیا اور مسلمانوں پر فوج اور غنڈوں کو ظلم اور بربریت کا مظاہرہ کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا۔

حیدرآباد پر فوج کشی کو ساری دنیا کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے لئے ہندوستان نے "پولس ایکشن" کا نام دیا۔ ہندوستان نے حیدرآباد پر اس نام نہاد پولس کارروائی کے لئے جو فوج استعمال کی اس کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ حیدرآباد پر فوجی کارروائی کا منصوبہ فروری ۱۹۴۸ء سے تیار ہونا شروع ہوا جبکہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کی ایما پر فوجی ہیڈ کوارٹر نے جنرل آفیسر کمانڈنگ جنوبی کمانڈ لفٹنٹ جنرل سر گوڈارڈ کو منصوبہ کی تیاری کا حکم دیا جس نے حملہ کے لئے ذیل کی افواج کا انتخاب کیا۔

۱۔ ایک بکتر بند بریگیڈ جس میں "پونہ ہارس" تیسری کیولری اور سترھویں ڈوگرہ رجمنٹ کی نویں بٹالین شامل تھی۔

۲۔ ساتویں انفنٹری بریگیڈ جس میں تین انفنٹری بٹالین تھے۔

۳۔ نویں انفنٹری برگیڈ جس میں تین انفنٹری بٹالین تھے۔

۴۔ مزید تین انفنٹری بٹالین۔

۵۔ فیلڈ آرٹلری کے تین رجمنٹ بشمول ایک اینٹی ٹیانک رجمنٹ۔

۶۔ اٹھارویں کیولری کا ایک ٹروپ

۷۔ ایک بکتر بند ڈویژن (H.Q.I) مع ایک بکتر بند برگیڈ کے جو اپریل ۱۹۴۸ء میں جنوبی کمانڈ کو روانہ کیا گیا۔ میجر جنرل جے ین چودھری کو ڈویژن کی کمان دی گئی اور برگیڈیر ڈی یس ورما کو بکتر بند برگیڈ کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔

۸۔ اس کے علاوہ اس فوج کے لئے جتنی ذیلی سروسوں کی ضرورت تھی اُن کو مہیا کیا گیا تھا۔

مارچ ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد پر فوجی حملہ کا منصوبہ مکمل ہوچکا تھا اور فوجیں حیدرآباد کی سرحدوں کے اطراف متعین کرکے جزئیات کی تکمیل میں مصروف تھیں۔ ابتداء میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ دو محاذ کھولنے کی اسکیم تھی۔ ایک شولا پور روڈ جہاں سے فوج کا بڑا حصہ شہر حیدرآباد کی طرف اقدام کرنے والا تھا اور دوسرا ذیلی محاذ بجواڑہ روڈ سے لیکن بعد میں دو محاذوں کی بجائے (۲۲) محاذ کھولے گئے۔ فوج کی حقیقی نفری تعداد کا علم نہ ہوسکا لیکن یہ کسی صورت میں ۶۰۔ ۷۰ ہزار سے کم نہ تھی جس پر محاذ کی ذمہ داریاں عائد تھیں۔ پوری فوج تین حصوں میں تقسیم کی گئی تھی ایک اقدامی فوج تھی Strike Force دوسری انہدامی فوج تھی Smash Force اور تیسری قاتل فوج Kill Force اور ایک امدادی فوج (Air Force) تھی اور ان کے علاوہ ایک محفوظ فوج تھی (Rear Division Force)۔ صرف شولاپور اور بجواڑہ کی سڑکوں سے ہندوستان کی ۲۵ ہزار فوج اور (۷۰) شرمن ٹینک بمبار طیاروں کے سایہ میں حیدرآباد میں داخل ہوئے۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس اقدامی فوج کی قطار انیس میل لانبی تھی۔ ہندوستانی

فوج کا اندازہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ تین ہفتوں میں یہ فوجی کارروائی ختم ہو جائے گی لیکن جب حیدرآبادی فوج نے کوئی مقابلہ ہی نہیں کیا اور (جنگ کے پہلے دو روز فوج کے چند منچلے دستوں نے جان پر کھیل کر مزاحمت کی کوشش کی تھی جنھیں اپنے سپہ سالار کے حکم پر یا امونیشن نہ ہونے کی وجہ سے پیچھے ہٹنا پڑا تھا) رضاکاروں میں تاب مقاومت تھی ہی نہیں تو پانچ روز کے اندر ہی حیدرآباد پر ہندوستان کا قبضہ مکمل ہو گیا۔ ہندوستان نے اس جنگ کے متعلق دعویٰ کیا کہ اس کے صرف سات فوجی کام آئے اور (۹) زخمی ہوئے جس کے برخلاف حیدرآباد کے باقاعدہ اور بے قاعدہ فوج کے (۸۰۰) آدمی مارے گئے۔ یہ اعداد و شمار قطعاً صحیح نہیں ہیں۔ صرف نلدرگ کے محاذ پر جہاں پہلی مڈبھیڑ ہوئی ہندوستانی فوج کے چھکے چھوٹ گئے تھے اور مبصروں کا اندازہ ہے کہ صرف یہاں ہندوستان کے تین چار سو فوجی مارے گئے اس نقصان نے ہندوستانی فوج کے آتش انتقام کو تیز تر کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اقدام کے وقت جتنے بھی مقامات سے یہ فوج گذری ہے وہاں کے مسلمانوں کو بالتخصیص تہ تیغ کیا گیا۔

حیدرآباد پر فوجی حملہ کی تفصیل جو لائق علی نے اپنی کتاب میں بیان کی ہے وہ صرف معلومات آفریں ہی نہیں بلکہ انکشافات سے بھری ہوئی بھی ہے۔ قائداعظم کے انتقال کے ساتھ ہی ہندوستان کے متوقع فوجی حملہ کے جلد ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا لیکن نظام اور العیدروس اس خیال کے حامی نہیں تھے۔ موخرالذکر کی اطلاعات کے بموجب حملہ کی تاریخ ۲۰ ستمبر تھی اور انھیں اس کا یقین تھا کہ دو تین ماہ تک وہ ہندوستان کے فوجی حملہ کو روک لیں گے۔ لائق علی کا خیال تھا کہ اگر صرف دو ہفتے ہی ہندوستانی فوج کو روک لیا گیا تو صیانتی کونسل اس کھلی جارحیت کے خلاف مؤثر قدم اٹھانے کے موقف میں ہوگی۔ العیدروس کی بیجا رجائیت نے لائق علی کو ان کی فوجی صلاحیتوں ہی کے متعلق شبہات میں مبتلا کر دیا تھا۔ ملک کے مختلف علاقوں کے جغرافیائی اور ارضی حالات سے کما حقہ قطعاً واقف نہ تھے اور بالعموم مقامی نقشوں کے مطالعہ میں لائق علی کو رہبری کرنی پڑتی تھی ان خیالات کا جب نظام پر

اظہار کیا گیا تو جدید سپہ سالار مقرر کرنے کا مشورہ دیا گیا جو عملاً ناممکن تھا۔

۱۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کی صبح ہندوستانی فوج کا حملہ شروع ہوا جس کی اطلاع لائق علی کو سب سے پہلے کمانڈر نے دی[۵]۔ حملہ کا پورا زور مغرب میں شولاپور۔ حیدرآباد سڑک اور مشرق میں سولیپٹم حیدرآباد سڑک پر تھا۔ شمال مغرب اور شمال مشرق میں پانچ محاذ تھے۔ مشرق میں سولیپٹم روڈ والی حملہ آور فوج متعدد مقامات پر حیدرآباد کی سرحد میں گھس گئی تھی اور دریائے تنگبھدرا کی سرحد کو ریلوے پل کے ذریعہ عبور کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

شولاپور سے حیدرآباد پہنچنے کے لئے حملہ آور فوج کو نلدرگ، ہمناباد اور ظہیرآباد کی مقررہ سڑک سے گزرنا ضروری تھا۔ اس کی پہلے سے پیش قیاسی کر کے نلدرگ کے درہ پر دفاع کی پہلی لین قائم کی گئی تھی جہاں ایک بٹالین فوج اور چار پچیس پونڈی توپیں مہیا کی گئی تھیں۔ جب حملہ آور فوج کے دبابوں کا اقدامی دستہ حیدرآبادی توپوں کی زد میں آیا تو چھ یا آٹھ شرمن ٹینک ڈھیر کر دئے گئے جس کے باعث حملہ آور فوج واپس لوٹ گئی۔ یہ واقعہ صبح کا تھا لیکن دوپہر میں جب لائق علی آرمی ہیڈ کوارٹر پہنچے تو کمانڈر نے بتلایا کہ نلدرگ کی دفاعی فوج کا ہندوستانی فوج کی ہوائی بمباری سے صفایا ہو گیا اور بچی کچھی فوج کو دالم مراجعت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ چار میدانی توپوں میں سے دو ناکارہ ہو گئیں، ایک کو اس کے توپچی نے دشمنوں کے ہاتھ میں پڑنے سے بچانے کے لئے اڑا دیا اور خود بھی ختم ہو گیا اور ایک میدانی توپ غائب ہے۔ مراجعت کے قبل نلدرگ کے پل کو نہیں اڑایا گیا جس کو پوری طرح ڈائنامیٹ کر دیا گیا تھا اور صرف آگ دکھانے کی ضرورت تھی۔ ہندوستانی فوج کی پیش قدمی کے مدنظر حیدرآباد کی فوج کو دالم سے ہمناباد مراجعت کا حکم دیا گیا کیونکہ یہ پہاڑی علاقہ تھا اور یہاں سے موثر مدافعت ہو سکتی تھی۔

---

[۵] نظام ریلوے کے سابق چیف انجینئر (جو آجکل کراچی میں انجینئرنگ کالج کے پرنسپل ہیں) کا بیان ہے کہ ہندوستانی حملہ کی اطلاع لائق علی کو سب سے پہلے انھوں نے دی اور ہندوستانی فوج کے اقدام کی تفصیلات بھی۔ ریلوے ہی کے ذرائع سے آخر وقت تک خبریں ملتی رہیں کیونکہ حیدرآبادی فوج کا لاسلکی پیام رسانی کا نظام معطل ہو چکا تھا۔

حملہ کے دوسرے روز ہندوستانی فوج جو نلدرگ سے قائم بڑھ رہی تھی اور جس سے ہمنا باد میں مقابلہ کی پوری تیاری کی گئی تھی وہ ہمنا باد آنے کی بجائے جانب شمال کلیانی کی طرف مڑ گئی۔ حملہ آور فوج کا یہ اقدام بالکل غیر متوقع اور لائق علی اور آرمی کمانڈر دونوں کے لئے ناقابلِ فہم تھا کیونکہ نقشہ میں اس علاقہ کو انتہائی دشوارگذار اور دبابوں اور لاریوں کے لئے ناقابلِ عبور و مرور بتلایا گیا تھا۔ پھر کلیانی جانے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا؟ یہ چیز کسی کے سمجھ میں نہیں آئی۔

اس کو ملک کی بدبختی نہیں تو اور کیا نام دیا جا سکتا ہے کہ فوجی کمانڈر اور حکومت کے سربراہ دونوں کو اس چیز کا علم نہیں تھا اور نہ اس کے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی کہ کلیانی اور بیدر کے درمیان ایک بہترین سڑک ایک عرصہ سے زیر تعمیر تھی۔ جو ہندوستانی فوج کے اقدام کے دو ایک روز قبل پبلک آمد و رفت کے لئے کھول دی گئی تھی۔ اُس نقشہ میں جس پر جنگ کی منصوبہ بندی کا انحصار تھا اس سڑک کو زیر تعمیر تک نہیں بتلایا گیا تھا اور افسر متعلقہ سے استفسار کرنے پر لائق علی کو معلوم ہوا کہ آئندہ نقشہ میں اس سڑک کو بتلایا جائیگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سڑک ہندوستانی فوج کی پیش قدمی ہی کے لئے بطور خاص تعمیر کی گئی تھی۔ یہ تو فوج کے مشاہداتی دستوں کا کام تھا کہ اقدام اور مراجعت کے سارے راستوں کا وہ قبل از قبل جائزہ لیتی! علاوہ ازیں حملہ آور فوج کے کلیانی کی جانب رخ کرنے پر بھی اس کے عندیہ کو مشاہداتی دستوں کے ذریعہ نہیں معلوم کیا گیا۔ اس غفلت اور لاپروائی کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ حملہ آور فوج بلا کسی مقابلہ کے بیدر میں داخل ہو گئی اور آل انڈیا ریڈیو کے اعلان پر یہ چیز لائق علی کے علم میں آئی۔

مشرقی اور دیگر محاذوں سے بھی حیدرآبادی فوج کی پسپائی کا یہی عالم تھا۔ شمال میں اورنگ آباد پر ہندوستانی فوج نے قبضہ کر لیا تھا اسی طرح دریائے وردھا کے پُل کو پار کرکے حملہ آور راجورہ میں داخل ہو گئے تھے۔ ہندوستانی اور حیدرآبادی علاقہ کے درمیان آمد و رفت

کے لئے صرف یہی ایک ریلوے پُل تھا جس کو اڑانے کا کام ایک ریلوے انجنیر کے تفویض تھا لیکن عین وقت پر ڈائنامیٹ کو آگ دینے والا کوئی موجود نہ تھا اور متعلقہ انجنیر پُل سے کوئی چھ میل کے فاصلہ پر سوتا ہوا پڑا تھا۔[1]

البتہ مشرقی محاذ پر دریائے موسیٰ کے پُل کو اُڑا کر حیدرآبادی فوج کو دریا کے مغربی جانب ہٹا لیا گیا تھا لیکن شکستہ پُل کی حفاظت اور دفاع کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا مشرق سے حملہ آور فوج کے اقدام کو روکنے کے لئے حمایت ساگر کے پانی کو کھول دیا گیا تھا لیکن چونکہ پُل کے اس مقام اور تالاب کے درمیان سو میل سے زائد کا فاصلہ تھا اور تین روز سے قبل پانی یہاں نہیں پہنچ سکتا تھا اس لئے کمانڈر کے منشا کے خلاف لائق علی نے اس منصوبہ کو ترک کرنے کا حکم دیا۔ ثریا پیٹھ اور جنوب سے بڑھنے والی مریال گوڑیہ اور نلگنڈہ والی ہندوستانی فوج کے مقابلہ کے لئے نکریکل کا انتخاب کیا گیا اور حیدرآبادی فوج کو اس مقام پر ہٹنے کا حکم دیا گیا۔ ابھی اس منصوبہ پر عمل نہ ہوا تھا کہ اطلاع ملی۔ کہ حملہ آور فوج نے پُل کی ٹوٹی ہوئی کمانوں پر ایک عارضی پل تیار کر کے اس علاقہ کو عبور کرنا شروع کر دیا ہے۔ فوجی کمانڈر نے یہاں بھی پل کی دفاع کا انتظام نہ کر کے بڑی غلطی کی۔[2]

---

[1] اس واقعہ کی تصدیق جب نظام ریلوے کے چیف محمود عالم سے کی گئی تو انھوں نے بتلایا کہ لائق علی نے پل کو ڈائنامیٹ کرنے کا اختیار بالکلیہ اپنے ہاتھ میں رکھا تھا اور آخر وقت تک اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ ہندوستان کبھی حیدرآباد پر حملہ نہیں کرے گا ہندوستانی فوج کا اجتماع باندا پر تھا وردھا کے پل کے قریب جب مشین گنوں اور برن گنوں سے لیس فوجی ٹرین پہنچی تو فوراً لائق علی کو ٹیلیفون کیا گیا اور ان سے منظوری حاصل کرنے تک حملہ آور فوج نے پل کو پار کر لیا۔

[2] اس محاذ کے حیدرآبادی فوج کے افسر اعلیٰ کے حوالہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ تین روز قبل انھوں نے آرمی ہیڈکوارٹر کو حمایت ساگر کا پانی چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا جس پر آخر وقت تک توجہ نہیں دی گئی علاوہ ازیں فوج کی مراجعت کے قبل پل کو ڈائنامیٹ کرنے کی کوشش کی گئی لیکن بجز ایک آدھ کمان کو خفیف سا نقصان پہنچانے کے ڈائنامیٹ نے کام ہی نہیں کیا۔

جنوب مغربی محاذ بھی ایک ایسا محاذ تھا جہاں ہندوستانی فوج کو جو میسور آرمی پر مشتمل تھی، پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔ منیر آباد کے اطراف اور منیر آباد ہوبلی ریلوے لائن کے اوپر حیدر آبادی فوج کے ایک چھوٹے دستے نے محکمۂ آبپاشی کے رضا کاروں کی امداد سے میسور کے ایک پورے بٹالین کا صفایا کر دیا اور دریائے تنگبھدرا کو عبور کر کے ہاسپٹ تک پہنچ گیا۔ لیکن یہ کامیابی عارضی تھی کیونکہ ہندوستانی فوج ہر محاذ پر تعداد اور اسلحہ میں اتنی زیادہ تھی کہ اس کی کوئی مقاومت نہیں کی جا سکی اور وہ دارالخلافہ کی طرف بڑھتی ہی گئی۔

۱۷ ستمبر کی صبح چار بجے کے قریب لائق علی کو ریلوے کے افسر اعلیٰ نے یہ اطلاع دی کہ حملہ آور فوج بی بی نگر۔ حیدر آباد والی سڑک سے جس پر دفاع کے کوئی انتظامات نہیں تھے، گزر رہی ہے اور دارالخلافہ سے بمشکل تیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس خبر سے لائق علی کو بڑا دھچکا پہنچا اور وہ یہ سمجھے کہ مشرقی محاذ کی نکریکل کی دفاعی فوج کا یا تو بالکل ہی صفایا کر دیا گیا یا ہندوستانی فوج نے اپنا رخ بدل کر نکریکل۔ جنگاؤں یا نارکٹ پلی بھونگیر والی سڑک کو اختیار کر لیا۔ بیدر میں ظہیر آباد کے قریب جس طرح اقدام ہوا تھا بالکل اسی طرح مشرقی محاذ پر اس کا اعادہ کیا گیا۔ فوج کی رفتار سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ چار پانچ گھنٹوں میں وہ حیدر آباد میں داخل ہو جائے گی۔ فیصلہ کن گھڑی پہنچ چکی تھی۔ صبح ۸ بجے نظام کو لائق علی نے اپنے استعفا کی اطلاع دی۔ دس بجے کونسل نے بھی مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس اجلاس کے بعد جب لائق علی باہر آئے تو فوج کے دو عہدہ داروں نے انھیں بتلایا کہ بی بی نگر تک ہندوستانی فوج کے پہنچنے کی اطلاعات غلط ہیں کیونکہ ابھی ابھی فوج کے خبر رساں دستے اس علاقہ کا چکر لگا کر آئے ہیں۔ ہندوستانی حملہ کو ابھی کچھ دنوں روکا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ حکومت مستعفی ہو چکی تھی اس لئے اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ فوج کے خبر رساں دستوں کے مقابلہ میں ریلوے چیف کی فراہم کردہ خبر زیادہ موثق معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہندوستانی فوج دارالخلافہ

سے اتنی قریب پہنچ گئی تھی کہ ۱۷ کو حیدرآبادی فوج نے ہتیار ڈال دئے اور اس طرح حیدرآباد کا سقوط عمل میں آیا۔ حکومت کے مستعفی ہونے کے بعد نظام نے اپنے اثر سے ہندوستانی فوج کو شہر حیدرآباد میں داخل ہونے سے روکا اور شام میں حیدرآبادی فوج کے ہتیار ڈالنے کی رسم شہر سے کئی میل کے فاصلہ پر عمل میں آئی۔

لائق علی نے حیدرآباد کے فوجی کمانڈر کی نااہلیتوں کا بڑا ماتم کیا ہے جن کی وجہ سے کمانڈر کی فوجی صلاحیتوں ہی سے وہ بدظن ہو گئے تھے۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آرمی کمانڈر نے ہندوستانی فوج کے حملہ کے مقابلہ کے لئے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی تھی حتیٰ یہ کہ میڈیکل سروس، مواصلات اور فوج کو راشن، اسلحہ، گولی بارود اور دوسری اشیاء پہنچانے کا انتظام نامکمل تھا۔ حملہ کے تیسرے روز تک فوج کو تازہ غذا پہنچانے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا جس کو محض سربند ڈبوں کے راشن پر اکتفا کرنا پڑا تھا۔ لائق علی نے پہلی مرتبہ تازہ غذا پکوا کر محاذوں پر بھیجنے کے احکام صادر کئے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ حیدرآباد کی فوج لاسلکی پیامات کے نشر کے لئے جو راز کی زبان (Code) استعمال کرتی تھی وہ انگریزوں کے زمانہ کی تھی جس سے ہندوستانی فوج بھی واقف تھی۔ چنانچہ ان پیامات کو بوجھنے (decode) کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

دوران جنگ فوجی کمانڈر اپنا دماغی توازن کھو چکے تھے۔ ان میں خود اعتمادی باقی نہ تھی۔ وہ ہر چیز میں لائق علی سے امداد کے طالب تھے۔ چنانچہ حملہ کے تین چار روز لائق علی نے اپنا بیشتر وقت فوج کے کنٹرول روم میں صرف کیا اور آرمی کمانڈر نے کوئی اہم قدم ان کے مشورے کے بغیر نہیں اٹھایا۔ ابتدا میں آرمی کمانڈر تین مہینوں تک ہندوستانی فوج سے مقابلہ کا یقین دلاتے تھے یا حملہ کے تیسرے ہی روز وہ ہمت ہار چکے تھے اور علانیہ کہنے لگے تھے کہ فوج میں لڑنے کی سکت ہی نہیں ہے، ہندوستان سے کسی بھی مناسب شرائط پر صلح کر لی جائے۔

حیدرآبادی فوج کی بے بضاعتی اور مسلسل پسپائیوں نے لائق علی کو حملہ کے تیسرے ہی روز یعنی ۱۵ ستمبر کو ہندوستانی زعماء سے خونریزی بند کرنے کی اپیل کرنے پر مجبور کیا اور ہندوستان سے مناسب شرائط پر صلح کر لینے کی پیشکش کی گئی ۔ پاکستان کو بھی ایسا سمجھوتہ کرانے پر مائل کرنے کے لئے حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل کراچی کو ہدایت کی گئی ۔ لیکن ہندوستان نے اس اپیل کو سرے ہی سے نظر انداز کر دیا ۔ نہ اپنے ریڈیو پر اس کا تذکرہ کیا نہ اخبارات نے اس کو شایع کیا ۔

۱۶ ستمبر کو نظام نے لائق علی سے صاف طور پر کہدیا تھا کہ وہ اور ان کی حکومت مستعفی ہو کر سارا معاملہ نظام پر چھوڑ دیں یا نہیں تو نظام حکومت سے اپنی بے تعلقی کا پبلک طور پر اعلان کر دیں گے تاکہ نتائج اور عواقب کی ساری ذمہ داری لائق علی اور ان کی حکومت پر رہے ۔ ۱۷ کی صبح دونوں کا استعفا پیش ہو الیکن نظام کو اس فیصلہ کی اطلاع دینے کے قبل لائق علی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ اگر کامیابی کی ذرا بھی توقع ہو تو نظام یا ان کے بغیر بھی جنگ کو جاری رکھا جائے ۔ لیکن انھیں اس کا بھی احساس تھا کہ حیدرآباد کی بچی کھچی فوج سے کیا توقع وابستہ کی جا سکتی ہے اور فوجی کمانڈر کا طرز عمل اس منصوبہ کے متعلق کیا رہتا ہے ؟ انھیں کسی پر اعتماد نہیں تھا ۔ اچھا ہوا کہ ان کے اس خیال نے عمل کی کوئی صورت اختیار نہیں کی ورنہ اس کا حیدرآباد پر بڑا برا ردعمل ہوتا ۔

بہرکیف حیدرآباد کو جنگ کے لئے قطعاً تیار نہیں کیا گیا تھا ۔ حیدرآباد آخر وقت تک اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ ہندوستان حملہ ہی نہیں کرے گا ۔ صیانتی کونسل اور پاکستان کی امداد پر بھی بڑا تکیہ کیا گیا ۔ اول الذکر سے کسی قسم کی توقع رکھنا ہی بے جا تھا ۔ البتہ قائد اعظم کی موت واقع نہ ہوتی تو ممکن ہے پاکستان کوئی سخت قدم اٹھاتا ۔ لیکن جب یہ دونوں توقعات پوری نہ ہو سکیں تو حیدرآباد کے لئے بجز ہتیار ڈال دینے کے اور کوئی صورت باقی نہ تھی ۔

فوجی کمانڈر سے جو کوتاہیاں اور نا اہلیتیں منسوب کی جاتی ہیں وہ ایسی سنگین اور مجرمانہ نوعیت کی ہیں کہ فوج کے معمولی بٹالین کمانڈر سے بھی سرزد نہیں ہوسکتیں۔ لیکن انھیں محض اس وجہ سے گوارا کیا گیا کہ فوجی کمانڈر پر قاسم رضوی کو پورا اعتماد تھا اور دونوں کی آپس میں عزیز داری بھی تھی۔ ہندوستانی حملہ کے بہت پہلے حیدرآباد کے کوچہ و بازار میں کمانڈر کی غداری کے افسانے مشہور ہونے لگے تھے۔ چنانچہ راقم الحروف نے بھی ایک وزیر باتدبیر کو جو اتفاق سے کمانڈر کے گھر کے قریب رہتے تھے یہ واقعات بتلائے تھے جس کے جواب میں کہا گیا تھا کہ دفاع کا قلمدان چونکہ وزیر اعظم کے پاس ہے اس لئے وہ کیا کرسکتے ہیں۔ اب دورانِ جنگ کے واقعات کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فوجی کمانڈر میں یا تو کوئی صلاحیت تھی ہی نہیں یا اس نے ہندوستانی فوج سے سازباز کرلی تھی۔
حکومت پر یہ پوری ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ اس نے فوج کی جنگی تیاریوں سے جنگ شروع ہونے تک کیوں چشم پوشی کی تھی؟ اس کا فرض تھا کہ فوج کے بعض سینیر عہدہ داروں کو اعتماد میں لیکر سارے انتظامات کا جائزہ لیتی۔ یہاں تک بیان کیا جاتا ہے کہ فوج کی تقریباً (۳۰) فیصد تعداد رخصت پر تھی اور قبل از قبل ان کی رخصتیں منسوخ نہیں کی گئیں فوج کے نقل وحمل اور رسل و رسائل کا انتظام اتنا ناقص تھا کہ بعض محاذوں پر فوج کو ریلوے کی مسافر بسوں میں روانہ کیا گیا۔ جنگ کی قبل از قبل کوئی منصوبہ بندی نہیں کی گئی اور فوج کے ذیلی عہدہ داروں کو ہمیشہ تذبذب میں رکھا گیا۔ جس طرح فوجی کمانڈر کو ان الزامات سے بری الذمہ قرار نہیں دیا جاسکتا اسی طرح حکومت بھی غفلت اور نا اہلی کے الزام سے بچ نہیں سکتی۔

۱۹

صیانتی کونسل میں حیدرآباد کا مسئلہ

حیدرآباد نے بتاریخ ۲۱ر اگست ۱۹۴۸ء صیانتی کونسل میں اپنا مسئلہ پیش کیا جس کے قبل ۱۷ر اگست کو لائق علی نے پنڈت نہرو پر معاہدۂ انتظام جاریہ کی خلاف ورزیوں، حیدرآباد کی معاشی ناکہ بندی اور ہندوستانی فوج کی جانب سے حیدرآباد کی سرحدوں کو عبور کرنے کے الزامات عائد کرتے ہوئے یہ اطلاع دی کہ حیدرآباد نے صیانتی کونسل میں اپنا مسئلہ پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ ہندوستان اور حیدرآباد کے تنازعات صیانتی کونسل کی امداد سے طے پائیں اور دونوں ملکوں میں خوشگوار تعلقات پیدا ہوں۔ یہ شکایت حیدرآباد کے معتمد امور خارجہ ظہیر احمد کی دستخط سے پیش کی گئی تھی جنھیں بتاریخ ۱۹ر اگست نظام نے صیانتی کونسل میں حیدرآباد کا مسئلہ پیش کرنے کے لئے اپنا نمائندہ نامزد کیا تھا۔ ۲۶ر اگست کو صیانتی کونسل میں شکایت کے پہنچنے کی حیدرآباد کو اطلاع مل گئی۔

۲۳ر اگست کو حکومت ہند نے حیدرآباد کو یہ اطلاع دی کہ اس کے اور حیدرآباد کے درمیان جو اختلافات ہیں، ان کی نوعیت بالکلیہ گھریلو ہے اس لئے ہندوستان اس امر کو تسلیم کرنے تیار نہیں ہے کہ قانون بین الاقوام کے تحت حیدرآباد کو ادارۂ اقوام متحدہ کی مداخلت طلب کرنے کا حق حاصل ہے یا کوئی دیگر بیرونی جماعت اس مسئلہ کا تصفیہ کرسکتی ہے۔

اقوام متحدہ میں اپنا مسئلہ پیش کرنے کے بعد نظام نے ہندوستان کے گورنر جنرل سی راجگوپال چاریہ سے آپس کے اختلافات کی خلیج کو پاٹنے کی اپیل کی۔ ہندوستان کی جانب سے جون ۱۹۴۸ء کے معاہدہ کو پس پشت ڈال کر سکندرآباد میں ہندوستانی فوج کے داخلہ پر اصرار کیا گیا جس کی تفصیلات "مفاہمت کی آخری کوشش" والے باب میں آچکی ہیں۔ اقوام متحدہ میں جانے کے بعد ہندوستان کے گورنر جنرل سے اپیل کرنے کا کوئی محل ہی نہ تھا۔ ہندوستان کے زعماء معمولی قابلیت کے لوگ نہیں تھے، وہ برطانیہ کے سیاستدانوں کو ناک چنے چبوا چکے تھے اور حیدرآبادی قائدین کو کیا خاطر میں لاتے تھے۔ چنانچہ ادھر صیانتی کونسل میں حیدرآباد کا مسئلہ پیش ہوا ادھر ہندوستان نے اپنے آخری منصوبۂ جنگ کو روبہ عمل لانے کی فوری تدابیر شروع کردیں۔ پہلے ہی سے حیدرآباد کے امن وامان کی کونسی اچھی حالت تھی اس میں مزید انتشار پیدا کردیا گیا، معاشی ناکہ بندی اور سرحدی ہنگاموں میں اضافہ کیا گیا اور اخباری پروپگنڈے نے حیدرآباد کے خلاف زمین وآسمان کے قلابے ملا دئے۔ پنڈت نہرو، سردار پٹیل اور ہندوستان کے دیگر زعماء کے بیانات نے حیدرآباد کے خلاف ہندوستان میں ایک عام منافرت کی فضا پیدا کردی۔ اس میں مزید سنگینی اور شدت رضاکاروں کی "مجاہدانہ سرگرمیوں" اور قاسم رضوی، لائق علی اور دیگر وزراء اور لیڈروں کے بیانات سے پیدا ہوئی۔ بظاہر ہندوستان کی یہ کوشش معلوم ہوتی تھی کہ صیانتی کونسل میں حیدرآباد کے مسئلہ پر اس وقت تک مباحث کا آغاز نہ ہو جب تک کہ حیدرآباد پر ہندوستان کے فوجی حملہ کی کارروائی مکمل نہ ہوجائے۔ ان کی تدبیر کارگر بھی رہی کیونکہ ۱۰ ستمبر تک حیدرآبادی وفد صیانتی کونسل کے لئے سفر اور زرمبادلہ کی عدم سہولتوں کی وجہ سے روانہ نہ ہوسکا تھا اور قائداعظم کے انتقال کے بعد ہی حیدرآباد پر حملہ کی تاریخ ۱۳ ستمبر مقرر ہوچکی تھی۔

حیدرآباد سے صیانتی کونسل کا وفد معین نواز جنگ کی سرکردگی میں ۱۰ ستمبر کو

سڈنی کاٹن کے ہوائی جہاز میں روانہ ہوا۔ اس وفد کے دیگر ارکان میں عبدالرحیم صدالمہام شیام سندر قائد پسپت اقوام، سری پت راؤ ہائی کورٹ جج اور میر نواز جنگ ایجنٹ جنرل حیدرآباد متعینہ برطانیہ تھے لیکن وفد کے لیڈر کے ساتھ صرف شیام سندر تھے اور دیگر ارکان دو ایک روز میں نکلنے والے تھے۔ لیکن دوسرے ہی روز یعنی ۱۱ ستمبر کو قائد اعظم کا سانحہ ارتحال پیش آیا اور اس کے ایک دو روز بعد حیدرآباد پر فوجی حملہ ہوگیا۔ وفد کے مابقی ارکان کو حیدرآباد رک جانا پڑا۔ البتہ معین نواز جنگ اپنے ساتھی کے ساتھ ۱۲ ار کو پیرس پہنچ گئے جہاں صیانتی کونسل کا اجلاس منعقد ہو رہا تھا۔ ظہیر احمد اور میر نواز جنگ پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔

۱۳ ار ستمبر کو ہندوستان نے حیدرآباد پر حملہ کردیا اور اسی تاریخ حیدرآبادی وفد نے صیانتی کونسل کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے فوری بحث کے لئے تاریخ مقرر کرنے کی درخواست کی اور ۱۴ ار کو بھی اس کا اعادہ کیا۔ بالآخر ۱۶ ار ستمبر کو بحث کی تاریخ مقرر کی گئی معین نواز جنگ نے حیدرآباد کا مقدمہ پیش کیا۔ ہندوستان نے حیدرآباد کو شرکت پر مجبور کرنے کے لئے جو رکیک طریقے اختیار کئے تھے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فوجی حملہ کی تفصیلات بتلائیں کہ کس طرح ہندوستان نے ایک زبردست جدید اسلحہ سے لیس فوج اور ہوائی بیڑے کو حیدرآباد کے خلاف استعمال کرکے کشت و خون اور غارت گری کا بازار گرم کر رکھا ہے جس کی وجہ سے حیدرآباد کا وجود خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ صیانتی کونسل سے اپیل کی گئی کہ وہ امن عالم کی ذمہ دار ہے اس کا فرض ہے کہ اس حملہ کو روکے اور فریقین میں باعزت سمجھوتہ کی فضا ہموار کرائے۔ اپنی تقریر کے آخر میں معین نواز جنگ نے حیدرآباد کی آزاد حیثیت کی تفصیل بتلاتے ہوئے حیدرآباد کی صیانتی کونسل میں اپنے مسئلہ کو پیش کرنے کی اہلیت کا ثبوت بھی بہم پہنچایا۔

ہندوستان کے نمائندہ سر راماسوامی مدلیار نے ایک انتہائی مختصر تقریر میں

حیدرآباد کی آزادانہ حیثیت کو چیلنج کیا اور مزید بحث کے لئے مہلت طلب کی۔
چنانچہ بہ اتفاق آراء صیانتی کونسل نے ۲۰ر ستمبر کی تاریخ مقرر کی۔

اس اثناء میں ۱۸ر ستمبر کو حیدرآباد کا سقوط عمل میں آچکا تھا اور حیدرآباد میں ہندوستان کی فوجی حکومت قائم ہوچکی تھی اور اسی تاریخ نظام کے نام سے ایک تار صیانتی کونسل سے مسئلہ واپس لینے کے لئے حیدرآبادی وفد کے نام روانہ کیا گیا۔ اس طرح صیانتی کونسل کے پہلے اور دوسرے اجلاس کی نوعیت میں بڑا فرق پیدا ہوگیا تھا۔ چنانچہ ۲۰ر ستمبر کو جب صیانتی کونسل میں یہ مسئلہ پیش ہوا تو صدرنشین نے اخباری اطلاعات کا حوالہ دیتے ہوئے حیدرآبادی وفد سے سرکاری طور پر ان خبروں پر تبصرہ کرنے کے لئے کہا۔ ظہیر احمد معتمد وفد نے بتلایا کہ نظام کی جانب سے انھیں کسی قسم کی ہدایات وصول نہیں ہوئیں البتہ اخبارات سے انہیں یہ معلوم ہوا ہے کہ نظام نے جنگ بند کرنے کا حکم دیا ہے حیدرآباد کی فوجوں نے ہتیار ڈال دئے ہیں، ہندوستانی فوج دارالخلافہ میں داخل ہوگئی ہے اور حیدرآباد کا نظم ونسق ایک ملٹری گورنر کے حوالہ کرکے پورے ملک میں مارشل لا کا نفاذ کیا گیا ہے لیکن چونکہ وفد کو سرکاری طور پر کوئی ہدایات موصول نہیں ہوئیں اس لئے مسئلہ کو ایجنڈہ سے خارج نہ کیا جائے بلکہ واقعات کی صحیح تصویر سامنے آنے تک مباحث کچھ دنوں کے لئے ملتوی کئے جائیں۔

ہندوستان کے نمائندہ سر راماسوامی مدلیار نے صیانتی کونسل کو بتلایا کہ معاہدۂ انتظام جاریہ کے بموجب ہندوستانی فوجیں پھر سکندرآباد میں داخل ہوگئی ہیں جہاں گذشتہ فروری کے قبل وہ مقیم تھیں۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ نظام سابع نے ۱۸ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو صیانتی کونسل سے حیدرآبادی مسئلہ کو واپس لینے کے متعلق اپنے وفد کو تار کے ذریعہ اطلاع دی ہے۔ یہ تار ہندوستان کے ایجنٹ جنرل برائے حیدرآباد

نے ہمارے نام اس ہدایت کے ساتھ روانہ کیا تھا کہ اسے حیدرآبادی وفد تک پہنچا دیا جائے۔ لیکن ہم حیدرآبادی وفد سے ربط پیدا نہیں کر سکے۔ ہندوستان نے حیدرآباد کی صیانتی کونسل میں اپنے مسئلہ کو پیش کرنے کی اہلیت پر اعتراض کرتے ہوئے کسی بھی ملک پر کسی وقت بھی طاقت کے استعمال کی مذمت کی لیکن ہندوستان کے طاقت کے استعمال کا یوں جواز پیش کیا کہ حیدرآباد میں امن و امان تباہ ہو گیا تھا جس کی بحالی کے لئے ہندوستان کو مداخلت کرنی پڑی۔ فوجی گورنر کے اس اعلان سے ہندوستان پر جارحانہ الزام کی تکذیب ہو جاتی ہے جس میں یہ بتلایا گیا کہ جوں ہی ہمارا کام ختم ہوگا حیدرآباد کے عوام کو اپنے مستقبل کے فیصلہ کا موقع دیا جائے گا۔ بشمول اس امر کے تصفیہ کا کہ حکومت کی نوعیت اور ہندوستان سے تعلقات کی بنیاد کیا ہو۔ ہندوستان کی فوج اپنا کام ختم کرتے ہی اور حالات کے معمول پر آتے ہی واپس ہو جائے گی۔

ان مباحث میں ارجنٹائن کے نمائندہ نے جو حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کیا اس سے اقوام متحدہ کی جمہوریت اور کمزور اقوام سے اس کی عدم دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ حیدرآباد میں فوجوں کے داخلہ کے وقت جو اعلان کیا گیا وہ بالکل اس اعلان کے مماثل ہے جو مسولینی کی فوجوں نے حبشہ میں داخل ہوتے وقت کیا تھا۔ ہندوستانی نمائندہ نے فوج کیساتھ نظام اور حیدرآباد کے عوام کے تعاون کا جو تذکرہ کیا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسی کہ کسی کے گردن پر پاؤں ہو اور ہاتھ میں بھرا ہوا پستول تو تعاون سے انکار کرنے کی کس میں ہمت ہو سکتی ہے تقریر جاری رکھتے ہوئے انھوں نے کہا کہ گزشتہ اجلاس میں ہندوستانی نمائندہ نے حیدرآباد کے مسئلہ کو ہندوستان کا اندرونی مسئلہ قرار دیا تھا حالانکہ اس کے قبل جنوبی افریقہ میں ہندوستانی اقلیتوں کے حقوق کی اس نے حمایت کی تھی۔ ہندوستانی حکومت کی یہ حالت ہے کہ کتب خانہ

کی ایک سمت کی کتابیں تو وہ جوناگڈھ کے مسئلہ کے تصفیہ کی تائید میں پیش کرتی ہے اور دوسری سمت کی کتابیں کشمیر کے مسئلہ کی حمایت میں پیش کی جاتی ہیں اور یہ دونوں مسائل ایک دوسرے کے بالکل مغائر ہیں۔ اگر بڑی طاقتیں چھوٹی اقوام سے اپنے تنازعات کے لئے ایسے معیار مقرر کریں تو پھر اس قدیم مقولہ کو یاد دلانا پڑتا ہے کہ بڑی مچھلی ہمیشہ چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے۔ ادارۂ اقوام متحدہ اسی راستہ پر گامزن ہے جس پر سابقہ مجلس اقوام چلتی رہی اور جیسا کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ دنیا کی پانچ بڑی طاقتوں کو مراعات (Privileges) اور ویٹو کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ حقیقتاً انھیں اپنی قوت برتری اور زبردست افواج، سمندری اور ہوائی بیڑے کے رکھنے کی وجہ سے قدرتی ویٹو از خود حاصل ہے۔ بالآخر مسئلہ مکرر بحث کے لئے ملتوی کیا گیا۔

۲۲ ستمبر کو ادارۂ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کے نام نظام سابع کا یہ تار وصول ہوا:

"میں نے آج صیانتی کونسل کے سکریٹری کے نام حسب ذیل خط روانہ کیا ہے:—

آج صبح اخبارات میں میں نے صیانتی کونسل کے روبرو ظہیر احمد کا بیان پڑھا کہ انھیں حیدرآباد کے مسئلہ کو صیانتی کونسل سے واپس لینے کے لئے میری ہدایات وصول نہیں ہوئیں حقیقت یہ ہے کہ ۱۸ ستمبر ۱۹۴۸ء کو میں نے حیدرآباد کا مسئلہ صیانتی کونسل سے اٹھا لینے کے متعلق معین نواز جنگ کے نام ایک پیام روانہ کیا تھا میں نے اپنے ایجنٹ جنرل متعینہ دہلی کو بھی ہدایت کی تھی کہ معین نواز جنگ سے ربط پیدا کرکے انھیں میرے حکم کی اطلاع دی جائے۔ اب سارے شبہات کو دور کرنے کے لئے میں یہ خط آپ کے نام اس استدعا کے ساتھ بھیج رہا ہوں کہ صیانتی کونسل میں میری حکومت کی جانب سے جو شکایت پیش ہے اس کو میں نے واپس لے لی ہے۔ آپ کے مزید علم کے لئے میں یہ بتلاتا ہوں کہ جب مجلس وزراء

کی جانب سے یہ شکایت پیش ہوئی تھی وہ ۱۷ ستمبر کو مستعفی ہوچکی ہے اور شخصی
طور پر زمام حکومت میں نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ صیانتی کونسل کو جو وفد
اس وزارت کے ایما پر روانہ کیا گیا تھا اس کو اب میری یا میری ریاست کی
جانب سے کسی قسم کا اختیار باقی نہیں رہا۔"

نظام سابع

اسی تاریخ معین نواز جنگ نے بھی سکریٹری جنرل کے نام ایک خط لکھا جس میں حیدرآباد
میں ملٹری گورنمنٹ کے مظالم اور نظم ونسق میں اہم تبدیلیوں اور نظام کے ہاتھ سے
حکومت چھین لینے کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے صیانتی کونسل کا اجلاس طلب
کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔

۲۸ ستمبر کو صیانتی کونسل میں مسئلہ پیش ہوا اور صدرنشین نے متبدلہ حالات
کے پیش نظر حیدرآبادی وفد کے اسناد نمائندگی کی صحت پر بحث کا آغاز کیا بالآخر
یہ طے کیا گیا کہ قطع نظر اس کے کہ حیدرآباد کے وفد کی نمائندہ حیثیت باقی ہے یا نہیں صیانتی
کونسل امن عالم کی سلامتی کی ذمہ دار ہے اور اس کو واقعات کا مزید علم حاصل کرنے
کے لئے فریقین کے نمائندوں کو اپنے بیانات جاری رکھنے کا موقع دینا چاہیئے۔ چنانچہ
معین نواز جنگ کو اپنے خط موسومہ صیانتی کونسل کی وضاحت کرنے کی دعوت دی گئی
انھیں یہ بتلایا گیا کہ صیانتی کونسل کے سامنے اس وقت اسناد نمائندگی کی صحت
یا عدم صحت کی بحث پیش ہے اس لئے حیدرآباد کے عام مسئلہ پر بحث نہیں کیجائیگی۔
معین نواز جنگ نے اپنی تقریر میں بتلایا کہ ایک ملک جس پر حملہ ہونے والا تھا اپنی
آزادی کی حفاظت کے لئے اپنا ایک وفد اقوام متحدہ روانہ کرتا ہے اور جب یہ وفد
اپنا مقدمہ پیش کرتا ہے یا اس کے پیش کرنے کے قبل ہی اس ملک پر حملہ ہو جاتا ہے
اور حملہ آور کمانڈر یا والئی ملک جو حملہ آور کمانڈر کے زیر حکم ہے، اپنے وفد کو صیانتی

کونسل سے شکایت واپس لینے کا حکم دیتا ہے۔ کیا اقوام متحدہ اس صورت حال کو قبول کرنے کے لئے تیار ہے؟ ایسا نہیں ہے کہ ایک حکومت اپنے پیش رو حکومت کے مقرر کردہ وفد کو واپس بلاتی ہے بلکہ ایک جائز حکومت کے مقرر کردہ وفد کو حملہ آور واپس بلا رہا ہے ..... معین نواز جنگ نے اس خیال کی تردید کی کہ ہندوستان کے حملہ کی غرض وغائت حیدرآباد میں امن و امان کی بحالی تھی۔ لاقانونیت کو مبالغہ آمیز اہمیت دی گئی تاکہ حملہ کا جواز تلاش کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان نے ایک طے شدہ منصوبہ کے تحت ہندوستان کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے فوج کشی کی ہے۔ حیدرآباد کا وفد صیانتی کونسل کی امداد کا طالب ہے تاکہ ہندوستان اور حیدرآباد کے تعلقات فوری اور مستحکم بنیادوں پر قائم ہو سکیں۔ ہندوستان کے نمائندے سر راما سوامی مدلیار نے پورا زور اسناد نمائندگی پر صرف کیا اور ایجنڈہ سے حیدرآباد کے مسئلہ کے خارج کرنے کی درخواست کی۔ وقت ختم ہونے کی وجہ سے اجلاس ملتوی کیا گیا۔

ہندوستان نے ۶ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو پیرس سے اپنے وفد کو واپس بلا لیا جس کے قبل سر راما سوامی مدلیار نے صدر نشین صیانتی کونسل کو یہ لکھا:۔

"۱۶ ستمبر کو حیدرآباد کی شکایت کو عارضی طور پر ایجنڈہ میں اس امر کے تصفیہ کے لئے شریک رکھا گیا تھا آیا حیدرآباد کو اس طرح شکایت کرنے کا حق ہے کہ نہیں۔ یہ شکایت جیسی بھی تھی واپس لے لی گئی اور ۲۸ ستمبر کے اجلاس میں ہندوستان کے وفد نے یہ ثابت کر دیا کہ نظام نے اپنی مرضی سے یہ دستبرداری کی تھی۔ صورت حال یہ ہے کہ شکایت جس کے پیش کرنے کا حیدرآباد کو کبھی حق نہ تھا اب صریحاً واپس ہو گئی ہے۔ ہندوستان اور حیدرآباد میں کبھی کوئی نزاع تھی نہ بین الاقوامی امن کو خطرہ تھا اور نہ کبھی ہندوستان نے جارحانہ حملہ (aggression) کیا۔ ہر وقت جب کونسل کے سامنے یہ مقدمہ

کسی نہ کسی معمولی عذر پر پیش ہو۔ بیشتر لوگ واقعات کی صحیح تصویر سامنے نہ ہونے کی وجہ سے اپنے حق تقریر سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ہندوستان کی توہین کرتے رہے ہیں۔ اس سے لازمی طور پر ہندوستان میں سخت برہمی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ان حالات میں کونسل یہ محسوس کرے گی کہ ہندوستان کی جانب سے پیرس میں حیدرآباد کے مسئلہ کے متعلق اپنے وفد کو باقی رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا کونسل سے درخواست کی جاتی ہے کہ ۱۶ ستمبر کے عارضی حکم کو منسوخ کر کے ہمیں حسبہٗ اطلاع دی جائے۔"

(شرعد دستخط) راماسوامی مدلیار

صیانتی کونسل کے مباحث نے نظام کی دست برداری کے بعد جو صورت اختیار کی اس سے معین نواز جنگ بھی کونسل سے بددل ہو گئے اور معاملات کو پاکستانی وفد کے حوالہ کر کے صدر نشین صیانتی کونسل کو انھوں نے حسب ذیل تحریر ۱۲ اکتوبر ۴۸ء کو روانہ کی :-

"رقیم ہے کہ حیدرآبادی وفد اسناد نمائندگی اور دیگر متعلقہ واقعات کے بارے میں صیانتی کونسل کے گذشتہ اجلاس میں اپنا نقطۂ نظر پیش کر چکا ہے اس لئے اب حیدرآباد کے مقدمہ کے مباحث کے وقت مجھے صیانتی کونسل میں نمائندگی کا مسئلہ اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

(شرعد دستخط) معین نواز جنگ

صیانتی کونسل سے جو توقعات حیدرآباد نے وابستہ کی تھیں وہ نقش بر آب ثابت ہوئیں ہندوستان نے ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک کر حیدرآباد پر فوج کشی کی، حیدرآباد پر قبضہ کیا، نظام کو اپنی مرضی کے تابع کر کے حیدرآباد کے مسلمانوں پر فوج اور ہندو غنڈوں کی مدد سے ایسے بہیمانہ مظالم کئے جو انسانیت

پر ہمیشہ ایک بدنما داغ رہیں گے۔ اور دنیا کا یہ سب سے بڑا ادارہ جس پر امن عالم کی ذمہ داری ہے ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے اس ظلم کو دیکھتا رہا۔ اس سے یہ تک نہ ہوسکا کہ حیدرآباد کے حالات کے مطالعہ کے لئے غیر جانبدار مبصر ہی روانہ کرتا۔ دنیا کی اس سب سے بڑی جماعت نے جب انصاف سے پہلو تہی کی تو ہندوستان سے انصاف کی کیا توقع کی جا سکتی تھی جس نے بھیڑیئے کے روپ میں حیدرآباد کی بکری کو ساری دنیا کے سامنے چیر پھاڑ کر ہضم کرلیا۔

ادارۂ اقوام متحدہ میں حیدرآباد کے مسئلہ کی اب صرف علمی (academic) حیثیت باقی رہ گئی تھی۔ پاکستان کے وزیر خارجہ سر محمد ظفر اللہ خان کی کوششوں سے بالآخر ۱۹ مئی ۱۹۴۹ء کو حیدرآباد کا مسئلہ صیانتی کونسل میں پیش ہوا۔ ہندوستان کے اقوام متحدہ کے مستقل مندوب سر بینگل ین راؤ نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے صیانتی کونسل سے رجوع ہونے کے متعلق حیدرآباد کی قانونی حیثیت کو چیلنج اور حیدرآباد کے اندر لاقانونیت اور بدامنی کے واقعات کو پیش کیا جن کی بنا پر ہندوستان حیدرآباد کے معاملات میں مداخلت کرنے پر مجبور ہوا۔ حیدرآباد میں جو کچھ ہوا اور اب ہو رہا ہے اس کو بین الاقوامی اہمیت حاصل نہیں ہے اس لئے حیدرآباد کے مسئلہ کو ایجنڈہ میں شامل رکھنے سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔ اس کے جواب میں سر محمد ظفر اللہ خاں نے صیانتی کونسل میں جو تقریر کی اس کا اس ادارہ کی تاریخ میں چند بہترین تقریروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ تقریر کیا تھی فصاحت کا بہتا دریا تھا۔ قانونی استدلال اور منطق کے زور سے قانون حکومت ہند کے بعد سے حیدرآباد کے سقوط تک کے واقعات کو اس انداز میں پیش کیا گیا کہ ہندوستان صیانتی کونسل اور ساری دنیا کے سامنے ظالم بن کر رہ گیا۔ سر ظفر اللہ نے بتلایا کہ حیدرآباد پر فوج کشی کرنے کے لئے ہندوستان نے حیدرآباد کے اندر لاقانونیت کی حوصلہ افزائی کی اور سرحدی ہنگاموں، معاشی ناکہ بندی

اور دیگر تخریبی کارروائیوں کے ذریعہ حیدرآباد کو اولاً شرکت پر مجبور کیا اور حیدرآباد کے انکار کرنے پر اس نے "پولس ایکشن" کے نام سے فوجی حملہ کردیا۔ فوجی حملہ کے دوران میں اور فوجی حکومت کے قیام کے بعد حیدرآباد کے مسلمانوں پر جو انسانیت سوز مظالم کیے گئے ان کی ساری تفصیلات سر ظفراللہ خان نے پیش کیں۔

حیدرآباد پر ہندوستان کا جب تک قبضہ رہے گا سر ظفراللہ خان کی یہ تقریر ہندوستان کے خلاف ہمیشہ ایک دستاویزی ثبوت بہم پہنچائیگی اور آئندہ نسلوں کے لئے ہندوستان کی بہیمیت، بربریت اور سفاکیوں کی یاد تازہ کرے گی۔ اس تقریر کے اختتام پر کونسل کے صدرنشین کا یہ بلیغ تبصرہ ملاحظہ ہو:-

"کیا اس مسئلہ پر کوئی اور تقریر ہوگی؟ پاکستان کے ممتاز نمائندہ نے دو اجلاسوں میں اس مسئلہ کی مکمل تصویر پیش کرنے کی جو کوشش کی ہے اس کا میں پوری کونسل کی جانب سے شکرگذار ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ارکان کونسل ان معلومات کو اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھیں گے۔"

مجلس اقوام متحدہ کے ارکان کے ذہنوں میں آج تک یہ مسئلہ محفوظ ہے۔ اس کے ایجنڈہ پر بھی باقی ہے لیکن آج تک اس مسئلہ کا کوئی تصفیہ نہیں کیا گیا اور نہ آئندہ کئے جانے کی توقع ہے۔

حیدرآباد کے مسئلہ کو اقوام متحدہ میں لے جانا ہی سب سے بڑی غلطی تھی۔ لیکن نہ معلوم حکومتِ حیدرآباد کو صیانتی کونسل سے اتنی خوش فہمی کیوں پیدا ہوگئی تھی۔ اگر مسئلہ صیانتی کونسل میں نہ جاتا تو ممکن ہے ہندوستان سے تعلقات کی کوئی اور صورت پیدا ہو جاتی۔ لیکن حیدرآباد کی قسمت پر مہر لگی ہوئی تھی اور اس کے قائدین کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ خود قاسم رضوی کا یہی خیال تھا۔ ملاحظہ ہو:-

"اگر حیدرآباد اقوام متحدہ سے دادخواہ ہوا تو ہندوستان حیدرآباد کے ساتھ

وہی کرے گا جو اس نے کشمیر میں کیا ہے۔ اقوامِ متحدہ میں کشمیر کا مقدمہ پیش ہے لیکن اس کے باوجود اس کو تلوار سے طے کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ حیدرآباد کے تعلق سے بھی یہی حکمتِ عملی اختیار کی جائے گی۔ مقدمہ کے پیش ہوتے ہی ہندوستان کی فوجیں حیدرآباد کی سرحدات میں داخل ہو جائیں گی۔ خدا وہ دن جلد لائے تاکہ یہ کشمکش جلد ختم ہو جائے یا تو ہم ختم ہو جائیں یا وہ فنا ہو جائیں۔ میں آپ کو دہشت زدہ نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو صرف آپ کو خطرہ سے آگاہ کر رہا ہوں جو بہت نزدیک آگیا ہے۔ ہندوستان حیدرآباد کو ختم کرنے پر آمادہ ہے کیا آپ ختم ہونے پر تیار ہیں۔ کیا آپ ہاتھ پاؤں مارنے پر تیار نہیں، آپ کے خون کو گرم اور عمل کو تیز ہونا چاہیئے۔ یہ آخری وارننگ ہے جو میں مسلمانوں کو دے رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ مسلمان آزاد رہنے پر آمادہ ہے لیکن ابھی مرنے پر تیار نہیں ہوا ہے۔ اگر وہ مرنے پر تیار نہیں ہے تو بے موت مارا جائے گا۔ ہندوستان جنگ کے نتائج و عواقب پر اچھی طرح غور کر لے۔ حیدرآباد مرتے مرتے ہندوستان کو بھی تباہ کر جائے گا۔ حیدرآباد نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے لئے بھی خطرہ بن جائے گا۔ ہندوستان کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے ہیں۔ حیدرآباد کا مسئلہ سارے عالم کا مسئلہ ہے۔ حیدرآباد میں جو ڈائنا میٹ تیار ہو رہے ہیں اور زمین کے نیچے جو بارود کے خزانے ہیں اس سے امریکہ تک الامان والحفیظ کہے گا۔ اب انگلستان اور امریکہ کے ہاتھ میں ہے کہ حیدرآباد کو خطرہ بنائے یا عالم کے امن کے لئے اس کو ایک مرکز بنائے گا"

(رہبرِ دکن ۱۹ اگست ۱۹۴۸ء)

قاسم رضوی کو پہلے ہی سے اس بات کا اندازہ تھا کہ صیانتی کونسل میں حیدرآباد کا مسئلہ پیش ہوتے ہی ہندوستان حیدرآباد پر حملہ کر دے گا۔ اور بالکل ایسا ہی ہوا۔ اس

بیان ہے، رضوی نے یہ دعا مانگی تھی کہ ہندوستان اور حیدرآباد کی کشمکش جلد ختم ہو تاکہ دونوں میں سے کوئی ایک فنا ہو جائے۔ انھیں اس کا بھی علم تھا کہ قوی اور ضعیف کی کشمکش میں ضعیف ہی خسارہ میں رہتا ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے حیدرآباد کو جو کسی طرح ہندوستان سے جنگ کرنے کے موقف میں نہ تھا، فنا کے گھاٹ اتار دیا۔

۲۰

حیدرآباد پر فوجی قبضہ

حیدرآباد کی فوج کے ہتیار ڈالنے کے بعد حکومت ہند نے نظام اور منشی کے سمجھوتہ کو طاق نسیاں کر دیا۔ ہندوستانی فوج فاتحانہ انداز میں سکندرآباد اور بلارم کی چھاؤنیوں میں داخل ہوئی حالانکہ فوجی مبصرین کو اب تک ہندوستانی فوج کی اس کامیابی کو فتح سے تعبیر کرنے میں پس و پیش ہے۔ جنگ کے نتائج اور فتح و نصرت کو ہم پلہ قوتوں کی نبرد آزمائی کے بعد جانچا جاتا ہے۔ قوی اور ضعیف کے مقابلہ میں اول الذکر کی کامیابی ہمیشہ جارحیت ہی کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔

حیدرآباد کے قبضہ کے بعد ہی ملٹری گورنر نے ایک حکمنامہ جاری کیا کہ فوج نے آزادی اور جمہوریت کو بحال کرنے کے لئے حیدرآباد میں قدم رکھا ہے' امن و امان کی بحالی اس کا مطمح نظر ہے اور اب ملک میں لاقانونیت اور غنڈہ گردی کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اس حکم کا اطلاق صرف مسلمانوں کی حد تک تھا۔ شہر حیدرآباد' سکندرآباد اور بعض مستقرہائے اضلاع کو چھوڑ کر مواضعات اور دیہاتوں میں ہندو غنڈوں نے فوج کی امداد سے قیامت برپا کر دی۔ ضلع عثمان آباد اور لاتور میں ایک مسلمان مرد بھی زندہ نہیں بچا۔ ضلع بیدر میں سقوط کے ایک ہفتہ کے اندر دس ہزار مسلمان مارے گئے۔ قتل عام ایک منظم منصوبہ کے تحت کیا جاتا تھا۔ کسی مقام پر فوج داخل ہوتے ہی اعلان کرتی کہ مسلمان ہتیار حوالہ کر دیں جس کے بعد ان سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ ہتیار

حوالہ کرتے ہی ہندو غنڈے اور فوج ان پر جھپٹ پڑتی اور ان کا قتلِ عام کیا جاتا۔ دیوِی ضلع بیدر، شوراپور ضلع گلبرگہ اور کنورہ تعلقہ بھوکردن اورنگ آباد اور اکثر مقامات پر ایسا ہی عمل کیا گیا۔ اس کے بعد مسلمان گھروں کو لوٹا جاتا اور انھیں آگ لگا دی جاتی۔ عورتوں کی آبرو ریزی کی جاتی۔ ہزاروں مسلم عورتوں نے تالابوں اور کنوؤں میں گر کر جانیں دیدیں۔ بعض مقامات پر ہندوؤں نے مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کی تو انھیں بھی تہ تیغ کیا گیا۔

سقوطِ حیدرآباد کے ابتدائی چند ہفتوں تک امدادی جماعتوں، اخباری نمائندوں اور رفاہی کارکنوں کو اضلاع میں داخلہ کی اجازت نہ تھی۔ اضلاع سے جو ریلیں شہر پہنچتی تھیں ان کے ڈبے خون سے تر ہوتے تھے۔ ملٹری حکومت نے انجمن صلیب احمر کو امدادی کام کے لئے اندرون ملک جانے سے منع کر دیا تھا۔ یہی سلوک بیرون ملک کے اخبار نویسوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ سکندرآباد کے نواحی علاقہ تملگری میں مسلم گرفتار شدگان کے لئے ایک بہت بڑا کیمپ قائم کیا گیا تھا جہاں بارش اور سردی سے بچاؤ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ قیدیوں کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ اس کیمپ نے جرمنی کے نازی زمانہ کے مشہور بلسن کیمپ کو شرما دیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پنڈت سندرلال کا اتحاد المسلمین کے غیر گرفتار شدہ قائدین سے ملاقات کا قاضی عبدالغفار مرحوم نے جو انتظام کیا تھا تو دوران گفتگو میں ایک رکن وفد نے تملگری کیمپ کو بلسن کیمپ سے تشبیہ دی تھی جس پر قاضی صاحب بڑے چراغ پا ہوئے تھے۔ ہندوستانی قائدین میں پنڈت سندرلعل کی وہ واحد ہستی ہے جنھوں نے علی الاعلان مسلمانوں پر ہندو مظالم کے واقعات کو بلاکم وکاست پیش کیا۔ ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے انھیں ایک خیرسگالی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے حیدرآباد بھیجا تھا۔ پنڈت نہرو اور ملٹری حکومت تو دنیا کو یہ باور کراتی تھی کہ حیدرآباد میں نام نہاد پولس ایکشن کے بعد امن وامان قائم ہوگیا ہے اور کوئی ناخوشگوار واقعات پیش نہیں آئے لیکن اسی زمانہ میں پنڈت

سندر لال پبلک اجتماعات میں رو رو کر یہ کہہ رہے تھے :-

"طریقہ کار یہ تھا کہ ہندوستانی فوج آگے بڑھتی جاتی اور اس کے پیچھے کانگریسی غنڈے ہر موضع پر حملہ کر دیتے۔ بالغوں کو پہلے قتل کیا جاتا، پھر عورتوں کی عصمت دری کی جاتی اور اس کے بعد زیورات، نقد، فرنیچر، غلہ، جانور اور جائداد کی عام غارت گری ہوتی۔ میں نے بے چھت کے مکانات دیکھے، عورتیں دیکھیں جنھیں بیوہ کیا گیا، بچے دیکھے جو یتیم کر دئے گئے۔ میں نے مواضعات کے کنوؤں کو عورتوں کی نعشوں سے بھرا ہوا دیکھا۔ میں نے ایک ایک موضع کا دورہ کیا لیکن تباہی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ شام کے وقت میں نے ہاتھ اٹھا کر اپنے خدا سے پوچھا کہ کیا تو نے مجھے لاشوں کا شمار کرنے کے لئے بھیجا ہے؟"

پنڈت سُندر لال کے بعد حیدرآباد کے بعض مقامی ہندو لیڈروں نے انصاف پسندی کو کام میں لاکر صحیح واقعات پیش کئے جن میں مسٹر نرسنگ راؤ ایڈیٹر رعیت جو بعد میں حکومت آندھرا پردیس کے وزیر بھی ہو گئے تھے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں:

"میرے ہندو بھائیوں نے پندرہ روز کے عرصہ میں کئی گنا زیادہ ایسے مظالم ڈھائے ہیں جن کے پندرہ مہینوں میں رضاکار مرتکب نہ ہو سکے۔ ہم بہت المناک دور سے گذر رہے ہیں ہماری مسرتیں بیواؤں، یتیموں اور کمزوروں کی آہ و بکا میں گم ہو گئی ہیں ... میں نے اکثر مقامات ایسے دیکھے ہیں جہاں بجز عورتوں اور بچوں کے ایک بھی مسلمان نظر نہیں آیا۔ مسلمانوں کو مواضعات میں زراعت سے اور شہروں میں سرکاری ملازمت سے آپ محروم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ۲۵ لاکھ کی اقلیت کو ذرائع معاش سے محروم کر دیا جائے تو کیا اکثریت ایک رات بھی امن کے ساتھ گذار سکتی ہے؟"

انتقام کے لئے آنکھ کے لئے آنکھ اور دانت کے لئے دانت کی کبھی دنیا میں

تخصیص نہیں کی گئی۔ انتقام اور پھر اکثریت کا انتقام اقلیت پر بے پناہ ہوتا ہے اور اس کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔ اگر رضا کاروں نے ایک حصہ ظلم کیا تھا تو اس کا سو حصہ انتقام لیا گیا۔ لیکن حیرت اور سخت حیرت اس پر ہے کہ ہندوستان کی فوج اس بربریت کی فریق بن گئی۔ ہلاکو اور چنگیز کے قتل عام کے قصے تاریخوں میں محفوظ ہیں لیکن جب غنیم نے ہتیار ڈال دیے تو پھر نہتے لوگوں سے ان کی فوج نے بھی کبھی تعرض نہیں کیا۔ ہندوستانی فوج کا معاملہ برعکس تھا۔ وہ صرف نہتوں ہی کو قتل کرتی رہی۔ لوٹ اور غارت گری میں ہندوستان کی فوج زیورات اور نقدی پر قبضہ کرتی تھی اور غنڈے دیگر سامان کا صفایا کرتے تھے۔

ہندوستان کی مختلف غیر جانبدار جماعتوں نے حیدرآباد پر ہندوستان کی جانب سے قتل و غارت گری کے جو اعداد و شمار جمع کئے ہیں ان سے یہ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ کم از کم پانچ لاکھ مسلمان ہندوستان کی فوج اور ہندو غنڈوں کی بربریت کا شکار ہوئے اور مسلمانوں کی بیس ارب روپیہ کی جائیداد کو لوٹا گیا۔ عورتوں کی عصمت دری اور اغوا کا تو حساب ہی نہیں کیا گیا۔ ہزاروں عورتوں نے باؤلیوں اور تالابوں میں گر کر خودکشی کرلی۔ ضلع عثمان آباد اور نواحی علاقوں کی تین ہزار عورتوں کو گرفتار کر کے صوبۂ بمبئی کے ڈونگری جیل میں منتقل کیا گیا جو بعد میں اورنگ آباد جیل لائی گئیں۔ یہ شریف مسلمان عورتیں اور ان کے چھوٹے بچے جس بیچارگی اور بے بسی کے عالم میں جیل میں داخل ہوئے اس کی تفصیل ایک چشم دید گواہ نے مصنف سے رو رو کر بیان کی جس کو سن کر جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اس وقت وہ خود جیل میں محبوس تھے۔ مہتمم جیل ایک حیدرآبادی ہندو تھا جس نے راوی کے علاوہ تین سربرآوردہ لوگوں کو (محبوسین) ان قیدیوں کی تعداد کے شمار کرنے پر مامور کیا۔ عورتوں کی یہ حالت تھی کہ ان کے جسم کے کپڑے تار تار تھے۔ اپنے سینوں کو وہ اپنے ہاتھوں سے چھپائی ہوئی تھیں۔ کئی دن کے

فاقوں نے انھیں نیم جان کر دیا تھا۔ کوئی جوان عورت ایسی نہ تھی جو غنڈوں اور فوج کی بہیمیت کا شکار نہ بنی ہو۔ اکثر نا کتخدا لڑکیاں حاملہ تھیں بچے بھوک سے بلک رہے تھے۔ اس حالت کو دیکھکر جیل کے سارے مسلمان قیدی اور عہدہ دار زار وقطار رونے لگے۔ شمار کنندوں میں سے ایک سربرآوردہ ایڈوکیٹ بیہوش ہوگئے۔ مہتمم جیل خدا ترس انسان تھا۔ اس نے فوری ان عورتوں اور بچوں کے کھانے پینے اور علحدہ رہائش کا انتظام کیا۔ ان کے لباس کے لئے اس نے سرکاری رقم سے کپڑا خریدا اور درزیوں کو مامور کرکے ان معصومین کی تن پوشی کا انتظام کیا۔

جس طرح فوجی حملہ کے لئے ایک منظم منصوبہ تیار کیا گیا تھا اسی طرح سیول نظم و نسق چلانے کے لئے بھی ایک مکمل اسکیم پہلے سے تیار کرلی گئی تھی بلکہ حملہ کے قبل عہدہ داروں کا انتخاب اوران کے مقامات کا تعینات بھی کردیا گیا تھا۔ حملہ کے دوران میں اور اس کے بعد جو مسلم عہدہ دار قتل کردیے گئے، فرار ہوگئے یا پاکستان چلے گئے تھے ان کی جگہ تو خالی نہیں رہ سکتی تھی لیکن جہاں مسلم عہدہ دار موجود تھے وہاں بھی ان کے بالادست کی حیثیت سے ہندو لائے گئے۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے مختلف صوبہ جات سے پولس کے دستے سیکڑوں کی تعداد میں حیدرآباد میں درآمد کئے گئے جنھوں نے مسلمانوں پر ظلم و زیادتی کی انتہا کردی۔ سقوط کے پہلے حیدرآباد کی پولس پر حکومت ستر لاکھ روپیہ سالانہ خرچ کرتی تھی لیکن بعد میں یہ خرچ ساڑھے پانچ کروڑ ہوگیا جس کا اعتراف حیدرآباد کے ہندو وزیر فینانس نے کیا تھا۔ ان نئے عہدہ داروں اور پولس نے ملک میں رشوت ستانی اور مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیوں کا ایسا سلسلہ شروع کیا کہ سقوط کے بعد چند ماہ ہی کے عرصہ میں مسلمانوں کی معاشی اور اقتصادی حالت ختم ہوکر رہ گئی۔

مس پدمجا نائیڈو دختر مسز سروجنی نائیڈو آنجہانی نے جو آجکل بنگال کی گورنر ہیں ہندوستان کی پارلیمنٹ میں ۴؍اپریل ۱۹۵۱ء کو ہندوستانی پولیس کے مظالم کی مذمت

کرتے ہوئے بتلایا کہ حیدرآباد پر ایسے سیول عہدہ دار مسلط کئے گئے ہیں جو یہاں کے لوگوں اور ان کے کلچر سے واقف نہیں ہیں اور جو عوام میں اعتماد بحال کرنے میں قطعاً ناکام رہے ہیں۔ اس کے برخلاف یہ عہدہ دار حکومت کے خزانہ پر بار ہیں۔ فرقہ داری بنیاد پر ہزاروں آدمیوں کو ملازمت سے برطرف کیا گیا اور صرف شہر حیدرآباد میں اس وقت بے روزگاروں کی تعداد ایک لاکھ ہے۔ حکومت نے آبادکاری کی کوئی اسکیمات نافذ نہیں کیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عورتیں فاحشہ ہونے پر اور بچے بھیک مانگنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔

ملٹری حکومت نے حیدرآبادی فوج کو تحلیل کر دیا، پولس اور ملازمتوں سے اتنے زیادہ مسلمان تخفیف کئے گئے کہ تناسب آبادی کے لحاظ سے بھی ان کی تعداد گھٹ گئی۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو جائداد منقولہ و غیر منقولہ کے انتقال پر تحدید عاید کرنے کے لئے ایک قانون نافذ ہوا جس کی رو سے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد کے ایسے سارے انتقالات کو کالعدم قرار دیا گیا جو مسلمانوں نے یا ان کے رشتہ داروں نے کیا۔ رشتہ دار کی تعریف میں (۲۶) قسم کے اناث اور ذکور رشتہ دار شامل تھے۔ سرکاری جریدہ میں ایسے (۵۰۰) نام شائع کئے گئے جن کی تعداد رشتہ داروں سمیت پچاس ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ متمول مسلمانوں پر مختلف الزامات عاید کرکے انھیں پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا تاکہ ان کی غیر منقولہ جائداد شرنارتھیوں میں تقسیم کی جائے۔ مساجد کی بے حرمتی کا سلسلہ شروع کیا گیا، مساجد کو بت خانوں میں تبدیل کیا گیا اور اکثر مقامات پر مسجدیں منہدم کی گئیں۔ مسجدوں کے سامنے باجا نوازی کے امتناعی حکم کو منسوخ کیا گیا۔ مدارس سے اردو تعلیم ختم کی گئی۔ مسلمان بچوں کو تلنگی، مرہٹی، کنٹری زبانیں سیکھنے پر مجبور کیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ جو ہندوستان میں مادری زبان میں تعلیم کا ایک عہد آفریں کارنامہ تھا جس کی ستائیش تقسیم ہند کے قبل سی راجگوپال چاریہ گورنر جنرل ہند، ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور،

سر تیج بہادر سپرو جیسے لوگوں نے کی تھی وہاں اردو ذریعہ تعلیم کو ختم کرکے اس کی بجائے انگریزی کو رائج کیا گیا مسلمان طالب علموں کے داخلوں پر پابندیاں عائد کی گئیں گذشتہ تیس سال میں جامعہ عثمانیہ نے ہندوستانی جامعات میں جو منفرد حیثیت حاصل کی تھی اس کو ختم کر دیا گیا اور اُردو کی توسیع و اشاعت کو جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان تھی ہمیشہ کے لئے روک دیا گیا۔ سرکاری دفاتر میں ہندی کو لازمی قرار دے کر مسلمانوں کو ملازمت سے برطرف کرنے کا بہانہ تراشا گیا۔

لائق علی اور ان کے ساتھی وزراء کو نظر بند کیا گیا لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ہندو وزراء رہا کر دئے گئے۔ قاسم رضوی پر تقریری جرائم کے ارتکاب کے الزامات عائد کئے گئے اور بعد میں بی بی نگر کے مقدمہ میں انھیں سات سال کی قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ سر عبد الرحمٰن کو وکالت کی یوں اجازت نہیں دی گئی کہ وہ پاکستانی تھے۔ انگلستان کے مشہور بیرسٹر رابرٹس اور مدراس کے مسٹر وینکٹ چاری کو اس لئے وکالت سے منع کیا گیا کہ وہ اردو سے نابلد تھے حالانکہ حیدر آباد کی عدالتوں میں بیسیوں مرتبہ قائد اعظم، سر تیج بہادر سپرو، سر آلاڈی کرشنا سوامی، مسٹر نارٹن جیسے پایہ کے وکلاء نے عدالت العالیہ سے اجازت کے بعد انگریزی میں پیروی کی اور انھیں اجازت دی گئی۔ ستم ظریفی تو یہ تھی کہ مقدمہ چلانے کے لئے جو عدالت مقرر کی گئی تھی اس کا جج اردو سے نابلد تھا اور اس عدالت کی زبان بھی انگریزی تھی۔

اقوام متحدہ میں ہندوستانی نمائندہ نے اپنی حکومت کی جانب سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہندوستان اور حیدر آباد کے تعلقات اور حیدر آباد کے مستقبل کی حکومت کی نوعیت کا تصفیہ عوام الناس کی رائے معلوم کرنے کے بعد کیا جائے گا جس کے لئے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر مجلس دستور ساز کی تشکیل عمل میں آئے گی۔ لیکن ہندوستان ان سارے مواعید سے منحرف ہو گیا۔ حیدر آباد کو ہندوستان میں ضم کرکے یہاں

ہندوستان کا دستور لوگوں کی رائے معلوم کئے بغیر نافذ کر دیا گیا۔

ملٹری حکومت کے قیام کے ساتھ ہی نظام کو ہندوستان میں دیگر ریاستوں کی طرح شرکت پر مجبور کیا گیا۔ نظام کے نام سے حیدرآباد پر ملٹری گورنر کی حکومت قائم کر دی گئی۔ نظام کی حیثیت ایک قیدی سے زیادہ باقی نہ رہی۔ ملٹری گورنر نے اپنے خط مورخہ یکم فروری ۱۹۵۰ء اور اس کے بعد کے ایک خط کے ذریعہ نظام کی خدمت میں چند شرائط پیش کیں جن کو بعد میں ایک "مقدس" معاہدہ کی صورت میں تبدیل کیا گیا جس کے ایک فریق حکومتہائے ہند اور حیدرآباد تھے اور دوسرے فریق نظام۔ ملٹری گورنر نے نظام کو حیدرآباد ہندوستان اور بین الاقوامی رائے عامہ میں اپنا وقار بلند کرنے کے لئے ان شرائط کو قبول کرنے کا مشورہ دیا۔ اور اسی وقار کی بلندی کا نام لے کر نظام سے ایک کثیر رقم قرض کے نام سے وصول کی گئی۔

معاہدہ کے ذریعہ نظام اور ان کے اہل خاندان کو ان کے سارے شخصی اعزازات، مراتب اور خطابات جو آزادی ہند کے قبل انہیں حاصل تھے اندرون و بیرون ملک استعمال کرنے کی اجازت دی گئی۔ یکم اپریل ۱۹۵۰ء سے نظام کو جیب خاص کے لئے ۵۰ لاکھ کی رقم جو تمام ٹیکسوں سے بری ہوگی منظور کی گئی۔ یہ رقم چار مساوی اقساط میں ہر سہ ماہی پر پیشگی قابل ایصال قرار پائی اور اس کی ادائی کی ذمہ داری حکومت ہند نے قبول کی۔ یہ رقم موجودہ نظام کو تا حیات ایصال ہوگی۔ ان کے بعد جانشینوں کے لئے حکومت ہند بعد میں گنجائش فراہم کرے گی۔ اس کے علاوہ ۲۵ لاکھ کی ایک رقم محلات کے اخراجات کی ادائی کے لئے بھی منظور ہوئی۔ مزید (۲۵) لاکھ کی رقم اس آمدنی کے معاوضہ میں دینا طے کیا گیا۔ جو صرف خاص سے ہوتی تھی اور جس کو ریاست میں ضم کر لیا گیا تھا۔ نیز دو شہزادوں، دو شہزادیوں، دو پوتوں اور ایک بھائی کے لئے مزید (۲۵) لاکھ سالانہ کی ادائیگی کی طمانیت دلائی گئی اس طرح ایک کروڑ پچیس لاکھ سالانہ نظام کو دینے کا اقرار کیا گیا لیکن محلات اور شہزادگان

کو ایصال شدنی (۵۰) لاکھ سالانہ کی رقم آج تک ادا نہیں کی گئی۔ علاوہ ازیں صرفخاص کا بہت ہی قلیل معاوضہ مشخص کیا۔ اس کی سالانہ آمدنی بعد وضع اخراجات (۲۴) لاکھ سالانہ تھی۔ قانون انضمام جاگیرات کی رو سے دس سالہ آمدنی بطور معاوضہ ادا ہونی چاہئے تھی جس کی مقدار ۲ کروڑ ۲۵ لاکھ ہوتی ہے۔ اگر بیس سالانہ اقساط میں بھی یہ رقم ادا کی جاتی تو سالانہ (½ ۲ ۶) لاکھ کا معاوضہ ادا ہوتا لیکن اس کی بجائے نظام کو تاحیات صرف ۲۵ لاکھ سالانہ دئے گئے۔ پھر صرفخاص کو دیوانی علاقہ میں ضم کر لیا گیا لیکن اس کے واصلات اور واجبات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اس آمدنی سے شاہی خاندان اور ان کے متوسلین کی پرورش کا بار برداشت کیا جاتا تھا جن میں حیدرآباد کے سابق فرمانرواؤں کی اولاد اور ان کے متوسلین بھی شامل ہیں جن کی مجموعی تعداد (۱۴) ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ اب ان سب کی پرورش کا بار نظام کے جیب خاص پر عائد ہو گیا ہے۔ معاہدہ کی رو سے نظام کو اپنی جائداد منقولہ و غیر منقولہ کی فہرست بھی حکومت ہند کو روانہ کرنی پڑی۔ راج پرمکھ کی حیثیت سے نظام کے ہاتھ میں کوئی سیاسی اقتدار باقی نہ رہا اور جب کانگریس کی معلنہ پالیسی کے تحت لسانی بنیادوں پر حیدرآباد کی تقسیم عمل میں آئی تو حیدرآباد شہر تلنگانہ کے اضلاع کے ساتھ آندھرا پردیش میں ضم ہو گیا اور ریاست کے دیگر اضلاع صوبجات مہاراشٹر اور کرناٹک میں شریک کر دئے گئے۔ سابقہ ریاست حیدرآباد میں مسلمانوں کا تناسب ۱۵ فیصد تھا لیکن اس جدید آندھرا صوبہ کے قیام نے اس تناسب کو اور بھی گھٹا دیا۔ مسلمان اب یہاں ۵-۶ فیصد سے زیادہ نہیں ہے اس جدید صوبہ میں نظام کی حیثیت ایک معزز شہری سے زیادہ نہ رہی۔

انڈین گورنمنٹ نے حیدرآباد میں قدم رکھتے ہی مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو تو ختم ہی کر دیا تھا لیکن معاشی اور اقتصادی حیثیت سے بھی انھیں اپنی مختلف اسکیمات کے ذریعہ اتنا تباہ کیا کہ مسلمان پست اقوام سے بھی زیادہ پس افتادہ ہو گئے ہیں۔ اسلام

کے خلاف ہندو مذہب کی یہ ایک منظم سازش ہے۔ اس کی حیدرآباد کی حد تک تخصیص نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے تمام صوبجات میں مسلمانوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جارہا ہے۔ شدھی اور تبدیلیٔ مذہب کا بھی ایک منظم پروگرام بنایا گیا ہے اور مسلمانوں کو آہستہ آہستہ ہندومت میں جذب کیا جارہا ہے۔ اقتصادی اور معاشی بدحالی کے اخلاق و کردار پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ اس وقت حیدرآباد کی مسلم آبادی میں بدرجہ اتم موجود ہیں

حیدرآباد کے مسلمانوں پر جو سفاکانہ مظالم اور انسانیت سوز جرائم کئے گئے اور آج بھی انھیں کسی نہ کسی نوعیت میں روبہ عمل لایا جارہا ہے وہ عہد قدیم یا ازمنۂ وسطی کے تاریک دور کے واقعات نہیں ہیں بلکہ بیسویں صدی میں جبکہ سائنسی ایجادات نے دنیا میں فاصلہ کو کالعدم کر دیا ہے، جبکہ دنیا کے سارے ممالک سمٹ کر ایک دوسرے سے اتنے قریب ہوگئے ہیں کہ ان کے دل کی دھڑکنیں ایک دوسرے کو سنائی دیتی ہیں؛ جبکہ اخبارات نے رائے عالم کو اتنا بیدار کر رکھا ہے کہ دنیا کے کسی گوشہ میں بھی ظلم اور تشدد کو برداشت نہیں کیا جاسکتا، جبکہ انسانی حقوق کی حفاظت ہی کے لئے اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آیا ہے اور دنیا کی اس سب سے بڑی اور ذی مرتبت جماعت کے سامنے سر محمد ظفر اللہ خاں کی اعلیٰ خطیبانہ صلاحیتیں حیدرآباد پر ہندوستان کے مظالم بیان کرنے میں ضائع گئیں اور اس جماعت کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ حقیقت یہ ہے کہ طاقتور اور کمزور کی جنگ میں قوی ہی کی سب تائید کرتے ہیں لیکن قدرت کے انتقام کو کوئی نہیں روک سکتا۔ ہندوستان نے طاقت و قوت کے زعم میں حیدرآباد پر جو سفاکیاں کی ہیں وہ ایک روز رنگ لا کر رہیں گی اور ہندوستان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے اور مظلوم کو ایک نہ ایک دن انصاف ملتا ہے۔

۲۱
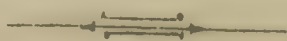
ذمہ داری کا تعین

حیدرآباد کی تباہی کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے ؟ دکن میں مسلمانوں کے جاہ وجلال کا آفتاب کیسے دیکھتے دیکھتے غروب ہوگیا ؟ لاکھوں مسلمانوں کے قتل اور ان کی اربوں روپے کی جائداد کے اتلاف کے کون ذمہ دار ہیں ؟ کس کی ناعاقبت اندیش پالسی نے حیدرآباد کو ختم کیا ۔ یہ ایسے سوالات ہیں جو سقوط حیدرآباد سے آج تک ذہنوں میں پیدا ہوتے رہے ہیں لیکن کبھی حقائق کی روشنی میں ان کے جواب نہیں ملے ۔ اس کتاب کی ابتدا میں ہم نے دکن میں مسلم اقتدار کے انحطاط اور اس کے خاتمہ کے اسباب وعلل پر سیر حاصل بحث کی ہے لیکن اس باب میں ہم حیدرآباد کے سقوط کے فوری اسباب کو متعین کرنا چاہتے ہیں ۔ کیونکہ عام طور پر یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حیدرآباد نظام کی غداری کا شکار ہوا لیکن ہم واقعات اور حقائق کی روشنی میں دیکھیں گے کہ واقعۃً نظام ذمہ دار ہیں یا حکومت حیدرآباد اور اس کی مسلم قیادت ۔

ہندوستانی یونین اور حیدرآباد کی گفت وشنید کی ساری تفصیلات سامنے رکھنے کے بعد یہ چیز روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ گفتگو کے کسی مرحلہ پر نظام نے اپنی حکومت کے کسی فیصلہ کے خلاف عمل نہیں کیا ۔ ۱۱ جون ۱۹۴۷ء کی آزادی کا فرمان نہ صرف قانون حکومت ہند کی پوری اتباع میں تھا بلکہ ملک کے دو بڑے فرقوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے جذبات کا آئینہ دار بھی تھا ۔ اس میں ہندوستانی حکومت سے

اشتراک کی پیشکش بھی موجود تھی۔ اس فرمان کو جس کے جاری ہونے میں اتحاد المسلمین کا کوئی ہاتھ نہیں ہے حیدرآباد کی آزادی کے منشور کی حیثیت حاصل ہے اور چونکہ یہ مسلمانوں کے احساسات اور تمناؤں کا مظہر تھا اس لئے اتحاد المسلمین نے سب سے زیادہ اس کا خیر مقدم کیا۔ اس فرمان کو ہندوستان نے بھی بہت زیادہ اہمیت دی کیونکہ ہندوستان کی وحدت اور ریاستوں کے انضمام کے منصوبہ کی اس سے صریح نفی ہو رہی تھی یہی وجہ ہے کہ ہندوستان نے گفت و شنید کے ابتدائی مرحلہ میں حیدرآباد کو دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں زیادہ مراعات دینا گوارا کیا تاکہ کسی نہ کسی طرح حیدرآباد کو انڈیا یونین سے مربوط اور وابستہ کر لیا جائے۔ نظام نے مونٹ بیٹن کے نام تاج برطانیہ کے نمائندہ کی حیثیت میں جو دو خط لکھے تھے اُن سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ حیدرآباد کو نظام وہ مقام دلانا چاہتے تھے جو آصفجاہ اول کے زمانہ میں اس کو حاصل تھا ساتھ ہی حیدرآباد کے جغرافیائی محل وقوع کے لحاظ سے اور ہندوستان سے اچھے تعلقات قائم کرنے کے مدنظر وہ امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کی حوالگی پر بھی آمادہ ہو گئے تھے جس سے لائق علی کابینہ نے بھی کبھی اختلاف نہیں کیا۔

یوں تو کئی سال سے سر والٹر مانکٹن حیدرآباد کے دستوری مشیر تھے لیکن مونٹ بیٹن کے ہندوستان کے گورنر جنرل پر نامزد ہونے کے بعد سر والٹر سے حیدرآباد کی دستوری گتھیوں کے سلجھانے کی بڑی توقعات وابستہ کی گئی تھیں کیونکہ وہ نہ صرف مونٹ بیٹن کے شخصی دوست تھے بلکہ حکومت برطانیہ پر بھی ان کا اچھا اثر تھا اور دستوری مسائل میں ان کی رائے کو ماہرانہ حیثیت حاصل تھی۔ یہی حال سر سلطان احمد کا تھا جو قانونی اور دستوری معاملات میں ہندوستان کے منتخب لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان دونوں نے حالات اور واقعات کا جائزہ لے کر حیدرآباد کے لئے مناسب ترین شرائط حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن شاہ منزل

کے واقعہ نے جس کے ذریعہ وفد کو دہلی جانے سے جبراً روکا گیا گفت وشنید ہی کو بدمزہ کردیا اور بعد کے کسی وفد کو حکومتِ ہند کے پاس برخواست شدہ وفد کے مقابلہ میں عشر عشیر وقعت اور اہمیت حاصل نہ ہوسکی۔

معاہدۂ انتظام جاریہ پر اصرار کرکے حیدرآباد نے سب سے بڑی غلطی کا ارتکاب کیا۔ یہی موقع مستقل معاہدہ کے لئے سب سے زیادہ سازگار تھا۔ ہندوستان حقیقت میں مشکلات اور مصائب میں گھرا ہوا تھا۔ اس کو سب سے بڑا خدشہ اس امر کا تھا کہ کہیں حیدرآباد پاکستان میں شریک نہ ہوجائے۔ علاوہ ازیں تقسیم کی وجہ سے شمالی ہند خصوصاً دہلی سے لاہور تک کے علاقے بدترین قسم کے فرقہ وارانہ فسادات کے شکار تھے، ہندوستانی ریاستوں میں چند ریاستیں انضمام کی اسکیم کے خلاف عمل کررہی تھیں، کشمیر کا قضیہ ایک بھیانک صورت اختیار کرگیا تھا لیکن حیدرآباد نے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اس کو عارضی معاہدہ کی ایک سالہ مدت میں طاقت و قوت بہم پہنچا کر ہندوستان سے ہمسری کرنے کا خیال پیدا ہوگیا۔ معاہدۂ جاریہ کے لئے چھتاری والے وفد نے جو شرائط حاصل کی تھیں ان کی نوعیت عارضی ہی تو تھی۔ اس عارضی انتظام کے لئے وفد کو جبراً دہلی جانے سے روکنے کی کوشش ایک ایسی سنگین غلطی تھی جس کا بعد میں کبھی ازالہ نہیں کیا جاسکا۔ وفد کی تبدیلی سے نہ صرف حیدرآباد کے وقار کو صدمہ پہنچا بلکہ جدید وفد کو اپنے پیشرو کے مقابلہ میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوسکی اور حیدرآباد کو ہندوستان سے بدظنی ظاہر کرنے کا موقع مل گیا۔ گفت وشنید کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے عزائم کو چھپا کر فریقین ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں۔ حیدرآباد کے قائدین خصوصاً قاسم رضوی اپنے آپ کو اس اصول سے مستثنیٰ سمجھتے تھے۔ اگر تاش کا کھلاڑی اپنے سارے پتے مقابل کو دکھادے تو کیا وہ کبھی جیت سکتا ہے؟ حیدرآباد میں شروع سے آخر

تک یہی ہوتا رہا۔

مستقل معاہدہ کی گفت وشنید کی ناکامی اور ۱۶ر جون کے معاہدہ کے ٹوٹنے کی ساری ذمہ داری حکومت حیدرآباد پر عائد ہوتی ہے۔ نظام نے اپنی کابینہ کے کسی فیصلے سے انحراف نہیں کیا۔ نظام سے اپنی کابینہ کے پس پشت صرف ایک حرکت سرزد ہوئی اور وہ سر مرزا اسمٰعیل کو مفاہمت کی زمین ہموار کرنے کے لئے دہلی روانہ کرنا تھا۔ سر مرزا کی تجاویز خواہ کتنی ہی حقیقت پسندانہ کیوں نہ ہوں وہ ہندوستان ہی کے خیالات کی ترجمان تھیں لیکن نظام نے انھیں شرف قبولیت عطا نہیں کیا اور اپنی کابینہ کی متعینہ پالسی سے روگردانی نہیں کی۔

آخری گفت وشنید کے انقطاع کے بعد جب سیاسی مطلع بالکل تاریک ہو گیا تھا اور کہیں سے بھی کوئی شعاع امید نظر نہیں آتی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حیدرآباد کی کشتی اب ڈوبنے والی ہے تو نظام نے کے یم منشی کا سہارا لیا۔ ایک بادشاہ جس نے اپنے ملک کے خزانے اور سارے وسائل[له] اپنی حکومت کے لئے وقف کر رکھے ہوں اگر یہ محسوس کرے کہ حکومت نے ملک اور بادشاہ دونوں کو تباہی کے آخری کنارے پر لا کھڑا کر دیا ہے تو بادشاہ کو فطرتاً اپنی حفاظت کا خیال پیدا ہوگا خصوصاً جبکہ یہ بادشاہ دنیا کا متمول ترین شخص بھی تھا۔ سوال یہ ہے کہ اگر نظام کے یم منشی سے کوئی سمجھوتہ نہ کرتے تو کیا حیدرآباد فوج کشی سے بچ جاتا؟ نظام کا یہی وہ عمل تھا جس نے شہر حیدرآباد کو تباہی سے بچالیا۔ دکن کی سات سو سالہ مسلم اقتدار کی پونجی اس شہر میں جمع تھی۔ یہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور ان کے گھر آباد اور خاندان خوش حال تھے۔ نظام کے لمحہ آخر کے فیصلہ نے ہندوستانی فوج کو (جس کے منہ کو قتل وغارت گری کا مزہ لگ چکا تھا) شہر میں فاتحانہ داخلہ سے روکا۔ حالانکہ قیادت وزارت

[له] وی پی منن نے اپنی کتاب میں بتلایا ہے کہ حکومت حیدرآباد نے ۲۲ کروڑ روپیہ غلط طریقوں پر خرچ کئے۔

کے مرکز کی حیثیت سے اس کی پامالی میں شبہ نہ تھا اور اس کا ہندوستانی فوج کے لیٹروں اور غنڈوں کی ہوسناکیوں سے محفوظ رہنا ناممکن تھا۔

نظام نے خلاف امید اتحاد المسلمین کا بہت ساتھ دیا۔ ان کے لئے بہت آسان تھا کہ وہ لائق علی کی وزارت کو برطرف کردیتے اور ہندوستان سے اپنے حسب دلخواہ سمجھوتہ کر لیتے۔ قاسم رضوی کے متعلق ان کے خیالات اچھے نہ تھے۔ لیکن نظام خاموش کیوں رہے؟ اس کے کئی وجوہات ہیں۔ سب سے زیادہ نمایاں سبب نظام کا جذبۂ آزادی تھا۔ برطانوی پیرامونٹسی اور رزیڈنسی کی ریشہ دوانیوں نے انھیں تخت نشینی کے بعد سے اب تک کبھی چین لینے نہیں دیا تھا۔ اب ان دونوں کے دفع ہونے کے بعد وہ ہندو یونین کو اس منصب پر فائز ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کو انگریزوں سے امداد کی توقع تھی اور حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل برائے انگلستان کی کوششوں سے یا بقول علی یاور جنگ حیدرآباد ہوز کی پُرتکلف ضیافتوں کی وجہ سے مسٹر چرچل یا دوسرے برطانوی لیڈروں کے بیانات یا مضامین اخباروں میں شائع ہوتے تو نظام کی امیدوں کو سہارا ملتا لیکن انگریزوں کی طوطا چشمی کو وہ فراموش کر گئے تھے۔ حیدرآباد سے اپنے دو سو سالہ تعلقات کے زمانہ میں انگریزوں نے کب حیدرآباد کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا؟ ہمیشہ حیدرآباد کو اپنے اغراض کے لئے استعمال کیا اور جب حیدرآباد کو امداد اور تعاون کی ضرورت محسوس ہوئی تو انگریزوں نے کھلی بدعہدی کی۔ علاوہ ازیں ہندوستان سے قدم اکھڑنے کے بعد انگریز مادی طور پر حیدرآباد کی کوئی اعانت کر بھی نہیں سکتے تھے۔ دوسری وجہ پاکستان کا قیام تھا۔ نظام کو یہ باور کرایا گیا تھا کہ اگر حیدرآباد پر ہندوستان نے فوج کشی کی تو پاکستان خاموش نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح صیانتی کونسل سے بیجا توقعات وابستہ کی گئیں۔ اس ادارہ میں حیدرآباد کا مسئلہ پیش کرنا ہی غلط تھا۔ تیسری وجہ رضاکار تنظیم تھی جس نے قاسم رضوی کو اتنا طاقتور کر دیا تھا کہ نظام سے زیادہ قاسم رضوی کا طوطی بول رہا تھا۔ جذبۂ آزادی اور قائدین کی

جذبات انگیز تقریروں نے مسلم عوام کو عواقب سے غافل کر دیا تھا۔ فوج اور پولیس کی
وفاداری کو بھی نظام مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ وہ اتحاد المسلمین کی مرضی پر چلنے
کے لئے مجبور تھے اپنی مرضی سے اگر وہ ایسا قدم اُٹھاتے جو اتحاد المسلمین کے خلاف ہوتا تو
ان کی اپنی عافیت اور دولت دونوں کو خطرہ تھا۔ اس کے علاوہ دربار کی سازشیں بھی تھیں۔
اتحاد المسلمین اور رضاکاروں کی طاقت و قوت کے افسانے اس انداز سے پیش کئے جاتے
تھے کہ نظام انفرادی طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکیں۔ ان ساری چیزوں نے مل کر نظام کو
دیوار کی بلی بنا دیا تھا۔ تاہم آخر وقت تک انھوں نے اتحاد المسلمین اور اپنی حکومت کا
ساتھ دیا لیکن جب انھوں نے محسوس کیا کہ قیادت اور حکومت دونوں ناکام ہو گئے تو
کے یم منشی کا دروازہ کھٹکھٹانے کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ نہ تھا جس سے انھیں اپنی
اور اپنے خاندان کے عارضی تحفظ اور شہر حیدرآباد کو موقتی طور پر قتل و غارتگری سے بچانے
کا موقع مل گیا۔

حیدرآباد کے سقوط کی پوری ذمہ داری اتحاد المسلمین اور حکومت حیدرآباد پر عائد ہوتی
ہے جس سے انکار کرنا حقائق کی پردہ پوشی کے مرادف ہے۔ بہادر یار جنگ کو اپنی زندگی
میں یقین کامل تھا کہ انگریز ہندوستان کو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن جنگ کے اختتام کے
پہلے ہی ان کی موت واقع ہو گئی اور وہ یہ دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہے کہ جنگ جیتنے کے
باوجود انگریزوں کے اقتدار کا جنازہ نکل رہا تھا۔ ان کے پاؤں ہندوستان سے اکھڑ چکے
تھے۔ زمانہ بدل چکا تھا۔ جنگ کے پہلے کے اور بعد کے حالات میں زمین آسمان کا فرق
پیدا ہو گیا تھا۔ عوامی قوت ہر جگہ اُبھر رہی تھی۔ اس قوت کو حیدرآباد میں کیسے دبایا جا سکتا
تھا۔ بہادر یار جنگ زندہ رہتے تو ہندوستان کے ان تغیر حالات سے وہ مطابقت پیدا
کرتے اور کسی باعزت سمجھوتہ پر آمادہ ہو جاتے۔ ڈوبتا کیا نہ کرتا۔ علاوہ ازیں حیدرآباد کے
ہندوؤں کے دلوں پر ان کی عظمت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے اخلاق و کردار سے وہ متاثر

تھے اور ان کو اپنی زبان و قلم پر پورا قابو حاصل تھا ان کی زبان سے ہندوؤں کی بے جا دل آزاری نہ ہوتی اور ان کی رہبری میں رضا کار تحریک بے لگام نہ ہوتی۔ غرض یہ کہ ہندوؤں کے دلوں میں آتشِ انتقام نہ بھڑکتی اور نہ قتل و غارت گری کے عام مواقع ہاتھ آتے۔

ابو الحسن سید علی کے اثر سے نکل کر قاسم رضوی کو اپنی عقل و فراست کے متعلق غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی۔ اتحاد المسلمین کے اندر جتنے سنجیدہ اور صائب الرائے عناصر تھے انھیں قاسم رضوی نے اپنے ساتھ نہیں رکھا بلکہ اپنا مخالف بنا کر انھیں دار السلام میں قدم رکھنے نہ دیا اور اپنے اطراف ناتجربہ کار، کم عقل اور خوشامدی لوگوں کو جمع کرلیا۔ ہندوستان سے گفت و شنید کے دوران متعدد ایسے نازک لمحات آئے تھے کہ اتحاد المسلمین سے باہر دوسری مسلم جماعتوں اور دانشوروں کو جمع کرکے ان سے مشورہ کیا جاتا۔ ملک میں ایسی بیسیوں قابل ہستیاں تھیں جن کے دل میں قاسم رضوی سے بڑا درجہ زیادہ حیدرآباد کا درد تھا اور جو علم، تجربہ، عمر اور قابلیت، فراست اور تدبر میں قاسم رضوی سے کہیں زیادہ بڑھے ہوئے تھے لیکن جہاں مجلس ہی کے ذی فہم لوگوں کو قریب نہ آنے دیا جاتا ہو وہاں مجلس سے باہر والوں کا کیا گذر ہوسکتا تھا۔ اسی طرح ایسے ہنگامہ خیز دور میں ایسے ارکان کو بابِ حکومت میں لیا گیا جن کے اندر حکومت کی گرانبہا ذمہ داریوں کو اٹھانے کی اہلیت ہی نہ تھی۔

نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے زمانہ سے حیدرآباد کا دفاع انگریزوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔ حیدرآباد کی فوجی قوت صفر کے برابر تھی۔ خارجی تعلقات کے قیام کا حیدرآباد کو حق نہ تھا اور آخر وقت تک برطانوی بیرا مونٹسی حیدرآباد کے ہر شعبۂ زندگی پر مسلط تھی۔ آزادئ ہند کے وقت حیدرآباد کے پاس برائے نام جدید طرز کی فوج تھی ملک میں اسلحہ کے کوئی کارخانے نہیں تھے اور دو سو سالہ فوجی جمود نے حیدرآباد کے فوجی خاندانوں کی عسکریت کو ختم کرکے رکھ دیا تھا۔ ہندوستان کے قبضہ میں جدید طرز کی بہترین تربیت یافتہ

تین لاکھ فوج تھی جس کو انگریزوں نے اپنے شہنشاہی اغراض کے لئے تیار کر رکھا تھا۔ ایسی فوج سے مقابلہ کی جرأت کو جرأت رندانہ ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

رضاکار تنظیم کو کوئی عسکری اہمیت حاصل نہ تھی۔ حیدرآباد پر حملہ کا جواز تلاش کرنے کے لئے ہندوستان نے رضاکاروں کو اہمیت دینی شروع کی جس کا حیدرآباد میں یہ مفہوم لیا جانے لگا کہ ہندوستان اس تنظیم سے خائف ہے۔ ہندوستان نے رضاکاروں کو آمادۂ پیکار کرنے کے لئے سرحدی ہنگامے اور اندرون ملک تخریبی کارروائیاں شروع کیں۔ خدمت ملک کے صحیح جذبے نے رضاکاروں کو مقابلہ کے لئے آمادہ کیا لیکن جلد ہی ان میں نظم و ضبط ختم ہوگیا۔ اور اُن سے ملک میں اہل ملک کے خلاف ایسے جرائم سرزد ہوئے جن سے مسلمانوں کی گردنیں شرم سے جھک جاتی ہیں۔ جب یہ تنظیم کنٹرول سے باہر ہونے لگی تھی تو اس کا تحلیل کر دیا جانا ہی بہتر تھا لیکن آخر وقت تک اس کو باقی رکھنے کے لئے ایسی تاویلات کی جاتی رہیں۔ جو کسی اچھی حکومت کے لئے سزاوار نہ تھیں۔

ایک جدید عارضی حکومت کی تشکیل پر ہندوستان کو اصرار تھا لیکن چونکہ اس سے اتحادالمسلمین کے اقتدار پر ضرب کاری لگتی تھی اس لئے نہ قاسم رضوی اپنی قیادت چھوڑنے تیار تھے اور نہ وزراء اپنی کرسیاں۔ ملک کے اجتماعی مفاد کو انفرادی منفعت کی قربان گاہ کے بھینٹ چڑھا یا گیا۔

آخری گفت و شنید کی تفصیلات معلوم ہونے کے بعد تو یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حیدرآبادی حکومت اور قیادت دونوں معقولیت سے کوسوں دور تھے۔ یہ سب ہی جانتے تھے کہ ہندوستان ایک عظیم طاقت ہے اور حیدرآباد کو شرکت پر مجبور کرنے کے لئے اس نے اصول و انصاف ہر چیز کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ اس کو نہ اقوام متحدہ کی پرواہ ہے نہ رائے عالم کو وہ خاطر میں لاتا ہے۔ بھیڑیے اور بکری کے بچّے کے قصّے کو

بار بار پلیٹ فارم سے دہراتے ہوئے حیدرآباد کی قائدین نے اس کہانی سے سبق حاصل نہیں کیا۔ قاسم رضوی نے اپنی اشتعال انگیز تقاریر سے انڈیا یونین اور عام ہندوؤں کو حیدرآباد اور مسلمانوں کا جانی دشمن بنالیا تھا۔ ہندوستانی فوج کے دل میں بھی آتشِ انتقام بھڑک اٹھی تھی چنانچہ جب حیدرآباد پر حملہ ہوا تو مسلمانوں سے کسی قسم کی رعایت روا نہیں رکھی گئی۔ مرد، عورتیں، بچے لاکھوں کی تعداد میں تہ تیغ کئے گئے، جائدادیں لٹیں اور عورتیں رسوا ہوئیں۔ حیدرآباد کے پاس ہندوستان کی فوجی قوت سے زیادہ مہیب ایک طاقت تھی جس کو ایک عالی دماغ سیاس ہی بہتر طور پر استعمال کرسکتا تھا اور یہ تھی حیدرآباد کی (۸۵) فیصد ہندو آبادی۔ فوجی حملہ سے بہت پہلے ہندوستان کو سب سے زیادہ تشویش اس امر کی تھی کہ حیدرآباد پر فوجی حملہ کے ساتھ ہی کہیں ہندوؤں کے قتل عام کا سلسلہ شروع نہ کردیا جائے۔ اس لئے ہندوؤں کو حیدرآباد کے متصلہ صوبجات میں منتقلی کی کوشش کی گئی اور اکثر خوشحال اور متمول خاندان منتقل بھی ہوگئے لیکن ان کی تعداد عام ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت ہی کم تھی۔ ہندوستانی حکومت کو دوسرا خدشہ ہندوستانی مسلمانوں کی بغاوت کا تھا۔ چنانچہ حیدرآباد پر حملہ کے قبل متصلہ صوبجات ہند میں جن مسلم عناصر سے شورش کا اندیشہ تھا ان پر ہندوستانی حکومت نے نہ صرف کڑی نگرانی ہی قائم کی بلکہ اکثر و بیشتر لیڈر قسم کے لوگوں کو نظربند کرلیا۔ لیکن حیدرآباد کے مقامی ہندوؤں سے حکومت ہند کو آخر وقت تک تعلق خاطر تھا۔ قاسم رضوی نے اپنی بعض تقاریر میں اس جانب اشارہ بھی کیا تھا کہ ہندوستان نے حملہ کیا تو یہاں اس کو بجز راکھ کے ڈھیر اور لاشوں کے کچھ نہ ملے گا۔ یہی وجہ تھی کہ حیدرآباد پر حملہ میں طوالت ہوتی جارہی تھی۔ حیدرآباد کے مقامی ہندو بھی انتہائی دہشت زدہ تھے۔ لیکن عام مسلمانوں میں ہندوؤں کے خلاف کسی قسم کا جذبۂ منافرت نہ تھا۔ آخر وقت تک ہندو مسلم روایتی اتحاد میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا لیکن

ہندوستانی حکومت کو مسلمانوں خصوصاً رضاکاروں سے یہ خدشہ لگا ہوا تھا کہ وہ ہندوؤں کو تہ تیغ کردیں گے۔ یہ اندیشہ حقیقتاً کتنا ہی بے بنیاد کیوں نہ ہو لیکن اس کو تجارتی طور پر لین دین کا ذریعہ ضرور بنایا جاسکتا تھا۔ ہندوؤں کی جان و مال کی حفاظت کے معاوضہ میں مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کا سودا کیا جاسکتا تھا۔

حیدرآباد کی فوج جنرل العیدروس کے زیر کمان تھی جنھیں نہ صرف حیدرآباد کی فوجی بے بضاعتی کا علم تھا بلکہ ہندوستانی فوج کی طاقت و قوت کا بھی بخوبی اندازہ تھا لیکن اپنی اہمیت جتانے کے لئے بادشاہ، وزیر اعظم اور قائد قوم سب کو انھوں نے اس فریب میں مبتلا رکھا کہ حیدرآباد کی فوج کا مورال (Morale) اتنا بلند ہے کہ وہ آسانی سے تین مہینوں تک ہندوستانی فوج کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ لیکن فوج کو جنگ کے لئے تیار کرنے میں جو جتن کئے جاتے ہیں اس سے جو مجرمانہ غفلت انھوں نے برتی اس سے ان کی وفاداری ہی مشکوک ہو جاتی ہے۔ لائق علی نے اپنی کتاب میں ان کی کوتاہیوں اور نااہلیتوں کا جو تذکرہ کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ العیدروس ہندوستانی فوج سے لڑنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ گوریلا جنگ سے تو حیدرآباد کی فوج کو کسی نے نہیں روکا تھا، صورت اسی وقت اختیار کی جاتی ہے جب اپنی بے بضاعتی یا اسلحہ کی قلت کی وجہ سے کوئی فوج رو در رو مقابلہ نہ کرسکتی ہو۔ لیکن جبکہ اس فوج کے کمانڈر ہی کے دل میں کھوٹ ہو اور اس کے قول و فعل میں تضاد تو ایسی صورت میں نہ فوج پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے نہ اس کے کمانڈر پر۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ حکومت نے فوج کی تیاریوں پر کوئی نظر نہ رکھی۔ چونکہ العیدروس قائد قوم قاسم رضوی کے عزیز تھے اور انھیں ان پر کامل اعتماد تھا اس لئے حکومت بھی اعتماد کرنے پر مجبور ہوگئی۔ لیکن قومی معاملات میں تو یہ چیز قابل معافی نہیں قرار پاسکتی۔

ہندوستانی فوج سے مقابلہ نہ کرکے چار روز کے اندر اپنی پسپائی قبول کر کے ہتیار ڈال دینا العیدروس کا ایسا جرم ہے جو مسلمانوں اور قاسم رضوی کے نزدیک بھی قابل معافی نہیں ہے۔ لیکن حالات اور واقعات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ العیدروس کو اپنی اور ہندوستانی فوج کی طاقت وقوت کا پورا اندازہ تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ہندوستانی فوج جدید ترین اسلحہ جنگ سے لیس ہے' اس کے پاس سینکڑوں شرمن ٹینک، دبابے، بمبار طیارے اور دیگر سازوسامان ہے۔ العیدروس شخصی طور پر ہندوستان کے فوجی کمانڈروں کی صلاحیتوں سے بھی واقف تھے۔ حیدرآبادی فوج کی بے مائگی' تعداد کی قلت، اسلحہ کا فقدان اور بمبار طیاروں کی عدم موجودگی کا بھی انھیں علم تھا۔ دیانتداری کا اقتضا یہ تھا کہ وہ قاسم رضوی اور لائق علی دونوں کو اچھی طرح جتلا دیتے کہ حیدرآباد کی فوج ہندوستان کی فوج کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ لائق علی اور ان کی "اندرونی کابینہ" کے سامنے انھوں نے یہ صورت حال واضح کردی تھی۔ لیکن اس کو انکساری پر محمول کرکے بیرونی امداد پر تکیہ کیا گیا۔ جنگ کے پہلے ہی روز سے انھوں نے حیدرآبادی فوج کو پیچھے ہٹانا شروع کیا اور جب کبھی اُن کے قائد بھائی استفسار فرماتے تو ان سے ٹھیٹ فوجی زبان میں یہ کہا جاتا کہ حیدرآبادی فوج اتنے وسیع محاذ پر قلت تعداد کے باعث جنگ نہیں کرسکتی اس لئے محاذ کے دائرہ کو تنگ کیا جارہا ہے تاکہ شہر حیدرآباد کے قریب اسٹالنگراڈ کی جنگ لڑی جاسکے۔ لیکن ہندوستانی فوج کے برق رفتار اقدام نے چھکے چھڑادیئے اور مقابلہ کے خیال ہی کو ترک کردینا پڑا۔ اس نظریہ اور ان واقعات کے پیش نظر العیدروس پر مقابلہ نہ کرکے حیدرآباد کی جوانگی کی ذمہ داری عاید کرنا مشکل ہے

بعض لوگ اس خیال کے بڑے شدومد سے حامی ہیں کہ انڈیا یونین سے اگر معاہدہ ہو بھی جاتا تو حیدرآباد کا وہی حشر ہوتا جو آج ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ انڈیا یونین سے ہمیں نہ پہلے حسنِ ظن تھا نہ اب ہے۔ سقوطِ حیدرآباد کے قبل بھی ہم اپنے ناقص خیالات

ارباب مقتدر کی خدمت میں پیش کرتے رہے ہیں' بارگاہِ قیادت میں تو ان کے باریابی کا موقع ہی نہ تھا البتہ دو تین وزرائے "تقرب" کی سعادت حاصل تھی اور ان کو قائل معقول کرنے کی کوشش کی جاتی تھی لیکن ان بیچاروں کے اعصاب پر قیادت کا بھوت ایسا سوار تھا کہ وہ مجبور تھے اور ہماری آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ہو کر رہ جاتی تھی۔ وہ چند مخلصین جنھیں دربار قیادت میں باریابی نصیب تھی جب کبھی اپنے وسوسوں اور اندیشوں کا اظہار کرتے تو "خضر راہ" کے انداز میں ان کی پیٹھ تھپک کر یہ تسکین دی جاتی کہ کیا تم لوگوں کو مجھ پر اعتماد نہیں؟ انڈیا یونین کی فوجیں قیامت تک حیدرآباد پر حملہ نہیں کر سکتیں۔ تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اس سے زیادہ میں تمہیں کچھ بتلا نہیں سکتا۔ مجھ پر بھروسہ کرو! فتح و نصرت ہمارے قدم چومے گی! دارالسلام میں عقیدتمندوں کے ساتھ گفتگو کا عام انداز یہی ہوتا تھا۔

ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ انتظام جاریہ کے بعد ہندوستان سے مستقل معاہدہ ہو جاتا تو اس میں شک نہیں کہ ہمارا سیاسی موقف اور اقتدار تو ختم ہو جاتا لیکن ہمیں پھر بھی حیدرآباد میں ایک باعزت زندگی بسر کرنے کا موقع کم از کم چند سالوں تک حاصل رہتا معاشی حیثیت سے مسلمان تباہ نہ ہوتے' ان کی جائدادیں محفوظ رہتیں اور لاکھوں کی تعداد میں وہ قتل و غارتگری کا شکار نہ ہوتے۔

اس باب کو ختم کرتے ہوئے ہم حکومت اور قیادت کے اس دعوٰی کا بھی تجزیہ کریں گے آیا حیدرآباد کی آزادی کے لئے انھوں نے جنگ لڑی اور کیا مستقل معاہدہ نہ ہونے کی بھی یہی وجہ تھی؟ اس سے زیادہ خود فریبی کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ دفاع' امور خارجہ اور مواصلات کو ہندوستان کے حوالہ کرنے اور حیدرآباد میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام پر آمادگی کے بعد نظام اور مسلمانوں کا اقتدار ہی کہاں باقی رہتا ہے حکومت کی باگ ڈور مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر ہندوؤں کے ہاتھ منتقل ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں جس نام نہاد معاشی آزادی کا تصور حکومت حیدرآباد کے ذہن میں تھا وہ سمجھ میں نہیں آتا۔ مستقل معاہدہ میں معاشی آزادی اور ثالثی کی دفعہ پر اصرار حکومت حیدرآباد کی وہ غیر آل اندیشی ہے جس سے مستقبل کے حیدرآباد کے مسلمانوں کو کوئی فائدہ ہی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس پر جو بیجا اصرار کیا گیا وہ حکومت حیدرآباد کا ایسا ناقابل معافی جرم ہے جو حیدرآباد کے مسلمان اور ان کی نسلیں کبھی نہیں معاف کریں گی۔

حصّہ دوم

اتحاد المسلمین کے صدور

باب

ضمیمہ

۲۲

بہادر یار جنگ کا دورِ صدارت

اسلامیانِ ہند کی سیاسی تاریخ میں جس طرح سرسید، مولانا محمد علی، علامہ اقبال اور قائدِ اعظم اپنے عہد آفریں کارناموں کی وجہ سے زندۂ جاوید ہیں اسی طرح مسلمانانِ دکن کی حیات سیاسی میں بہادر یار جنگ نے غیر فانی شہرت حاصل کی ہے۔ دکن میں سلطان شہید ٹیپو علیہ الرحمہ کے بعد اتنا بڑا مجاہد کوئی پیدا نہیں ہوا۔ حیدر آباد کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار اور سیاسی حیثیت سے منظم کرنے کے بعد ان کی آواز تنگنائے دکن سے نکل کر وسعتِ بیان کی خاطر ہندوستان کے وسیع و عریض خطہ کے ایک ایک گوشہ میں پھیل گئی۔ تحریک پاکستان کو آگے بڑھانے میں انھوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا اور اپنی بے مثل خطابت، خلوص، جذبۂ خدمت اور سوزِ دروں سے مسلمانانِ ہند کے قلوب کو اس طرح گرمایا کہ برصغیرِ ہند کے مسلم زعماء کی صفِ اول میں ان کا شمار ہونے لگا جس کی سرفہرست سرسید کا نام ہے۔

بہادر یار جنگ ایک عالم باعمل تھے۔ علوم دینیہ بالخصوص تفسیر قرآن، حدیث، فقہ سیرتِ پاک اور تاریخ اسلام پر انھیں غیر معمولی تبحر حاصل تھا۔ اقبال کی شاعری کے رموز و نکات سے شاعرِ مشرق کے بعد شاید ہی کوئی اتنا واقف ہو۔ علم و فضل کے ساتھ وہ ایک بے مثال خطیب تھے۔ اردو میں آج تک اتنا بلند پایہ فصیح البیان مقرر اور صاحبِ طرز خطیب پیدا نہیں ہوا۔

علم وفضل اور خطابت کے ساتھ ان کی وجاہت، قد و قامت اور ان کی شخصیت عام لوگوں سے انھیں ایک ممتاز درجہ عطا کرتی تھی۔ ان کا قد چھ فٹ سے زیادہ اونچا، جسم بھرا ہوا، آواز گرج دار، چہرہ پر داڑھی اور اس پر جامہ زیبی — یہ چیزیں انھیں ہر محفل میں جاذبِ توجہ بنا دیتی تھیں۔

خلوص و محبت، اخلاق و آداب، تہذیب و شائستگی اور میل ملاپ میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ہر کس و ناکس سے عمدگی سے پیش آنا، دوسروں کی گفتگو اور نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرنا اور اپنی رائے منوانے سے قبل اپنے مخالف سے اپنی تائید حاصل کرنا — ایسے اوصاف تھے جو ان کی شانِ قیادت کو دوبالا کر دیتے تھے۔ ان سب سے زیادہ وہ ایک پیکرِ خلوص تھے۔ رقیق القلب اتنے کہ معمولی سے معمولی واقعہ سے اتنے متاثر ہوتے تھے کہ آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو جاتا تھا۔

بہادر یار جنگ کی نشو و نما امارت کے گود میں ہوئی۔ تعلیم میٹرک تک پائی تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا اور جاگیر کا سارا انتظام ان کے نوجوان کندھوں پر آ پڑا۔ پانچ سات سال کی شبانہ روز محنت کے بعد جاگیری قرضوں، مستحقین کی حق رسی اور متوسلین کی پرورش کا خاطر خواہ انتظام کر کے جاگیر کے مالیہ کو انھوں نے مستحکم بنیادوں پر قائم کر دیا جس کے بعد ہی وہ حج بیت اللہ اور بلادِ اسلامیہ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ مدرسہ کی تعلیم ہی کے دوران میں ان کے اندر غیر معمولی تقریری صلاحیتیں اُجاگر ہو گئی تھیں اور ذاتی مطالعہ اور شوق نے انھیں علم کا ایسا شیدائی بنا دیا تھا کہ علومِ اسلامی کی کوئی ایسی صنف نہ تھی جس میں انھوں نے کمال درک حاصل نہ کیا ہو۔ اردو کے علاوہ عربی اور فارسی زبان پر انھیں اتنا عبور تھا کہ ان زبانوں میں تقریر کرتے تھے۔ انگریزی میں بھی بڑی صلاحیت پیدا کر لی تھی اور اس میں بے تکان گفتگو فرماتے تھے۔ حج سے واپسی کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر لیا۔ میلاد النبی کی محفلیں سب سے پہلے ان کی خطابت کی جولانگاہ

بنیں اور دکن کا گوشہ گوشہ اور متصلہ صوبجات کا ایک ایک علاقہ ان کی سحر انگیز خطابت اور اسلام کی خدمت گذاری کے جذبۂ بے پایاں سے گونجنے لگا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے مطلع سیاسی پر انقلاب انگیز تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔ قانون وفاق ہند کے تحت اکثر صوبجات ہند میں کانگریسی وزارتیں قائم ہو چکی تھیں اور مسلمانوں کے حقوق پر چیرہ دستیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ کانگریس نے ہندوستانی ریاستوں میں اپنی عدم مداخلت کی پالیسی کو ختم کر کے ذمہ دارانہ حکومت کی تحریک شروع کردی تھی تاکہ وفاق کے مرکزی ایوانوں میں رؤسا کی نمائندگی کا حق ریاستوں کے عوام کو حاصل ہو جائے۔ اس تحریک سے کانگریس خود الگ رہی اور دیسی ریاستوں کی رعایا کے حقوق کے لئے ایک علحدہ جماعت بنائی جس کے کارفرما جواہر لال نہرو تھے۔

حیدرآباد ایک اسلامی ریاست ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ ہندوؤں کے آنکھوں میں کھٹکتی تھی جہاں کا روایتی ہندو مسلم اتحاد مہاسبھا اور آریہ سماجیوں کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ ان دونوں اداروں نے حیدرآباد کے طول و عرض میں فرقہ وارانہ منافرت کی ایسی آگ پھیلائی کہ ۱۹۳۸ء میں پہلی مرتبہ شہر حیدرآباد میں فساد پھوٹ پڑا اور خود بہادر یار جنگ کے دو نوجوان بھانجے ہندوؤں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ یہ ایسا وقت تھا کہ بہادر یار جنگ کے ایک ادنیٰ اشارہ پر حیدرآباد کی گلی کوچوں میں ہندوؤں کے خون سے ہولی کھیلی جا سکتی تھی لیکن انھوں نے انتہائی ضبط سے کام لیکر مسلمانوں کے جذبات کو اپنے قابو میں رکھا۔ ان کا یہی وہ پہلا کارنامہ ہے جس نے انھیں مسلمانوں کا سیاسی قائد بنا دیا اور قیادت کے اس منصب جلیلہ پر وہ اپنی موت تک فائز رہے۔

اس وقت حیدرآباد میں مسلمانوں کی کوئی سیاسی تنظیم نہ تھی۔ ایک ادارہ اتحاد المسلمین کے نام سے قائم تھا جو مسلمانوں کے مذہبی، ثقافتی اور معاشرتی معاملات سے دلچسپی لیتا تھا۔ بجائے کسی جدید سیاسی جماعت قائم کرنے کے اتحاد المسلمین کے اغراض و مقاصد میں

ضروری ترمیمات کے بعد اس کو مسلمانوں کی واحد سیاسی تنظیم کی حیثیت سے باقی رکھا گیا بہادر یار جنگ کے جوش عمل نے اس تنظیم کو چار چاند لگائے۔ ابوالحسن سید علی اس کے معتمد منتخب ہوئے۔ اس جماعت کے دستور میں صدر کا عہدہ ہی نہ تھا۔ لیکن دنیا کے ترقی پذیر جمہوری اداروں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اس کے دستور میں ترمیم کی ضرورت محسوس کی گئی۔ صدر کا عہدہ قائم ہوا جس کو اپنی عاملہ کے انتخاب کا حق دیا گیا۔ اس طرح بہادر یار جنگ اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔

بہادر یار جنگ کا عروج ایسے زمانہ میں ہوا جب قانون وفاق ہند.. ۱۹۳۵ء کا ہندوستان میں نفاذ ہو چکا تھا۔ کانگریس اب تک ریاستوں کے معاملات میں دخیل نہ تھی لیکن اس قانون کے بعد اس نے وفاقی مقننہ میں عوامی نمائندوں کو نمائندگی دلانے کے لئے ریاستوں میں ذمہ دارانہ حکومت کی تحریک کو ہوا دینے لگی۔ یہ تحریک حیدرآباد میں ابھی شروع ہی ہوئی تھی اور بہادر یار جنگ کا ابھی اتحاد المسلمین کی صدارت پر انتخاب عمل میں بھی نہیں آیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت کی ایک کوشش کی گئی۔ مسلمانوں نے بہادر یار جنگ کو حقِ اعتماد (mandate) دیا اور ہندوؤں کی جانب سے نرسنگ راؤ نے نمائندگی کی۔ ذمہ دارانہ حکومت کے ہندو مطالبہ پہ یہ گفتگو نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود ہندو مسلم اتحاد کی اساس تلاش کرنے کی سرگرم کوششیں جاری تھیں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو دو نمائندوں (یعنی کاشی ناتھ راؤ ویدیہ، یم ہنمنت راؤ، بہادر یار جنگ اور اکبر علی خاں) کی ایک کمیٹی مفاہمت کے فارمولے کی تلاش میں مصروف تھی۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ کمیٹی سمجھوتہ کے قریب پہنچ گئی تھی لیکن سر اکبر حیدری کی حکومت نے آئینی اصلاحات کے لئے ایک کمیشن کا اعلان کر کے اس کمیٹی کے دو ارکان کاشی ناتھ راؤ ویدیہ اور اکبر علی خاں کو اس کا رکن نامزد کر دیا۔ اس طرح باہمی خوشدلی کی فضا میں جو سمجھوتہ ہو رہا تھا اس میں روڑا پڑ گیا۔ اصلاحات

کے کمیشن کے صدر دیوان بہادر آرموداینگار تھے اس لئے اس کو اینگار کمیٹی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مسلمان اصلاحات کی تائید میں نہ تھے کیونکہ اس سے ان کے سیاسی اقتدار کے متاثر ہونے کا اندیشہ تھا۔ اینگار کمیٹی کی سفارشات کے شائع ہونے کے قبل اتحاد المسلمین نے بہادر یار جنگ کی سرکردگی میں جو یادداشت سر اکبر حیدری صدر اعظم باب حکومت کی خدمت میں پیش کی تھی اس سے مسلمانوں کے موقف کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے :۔

(۱) حیدرآباد کی حکومت ایک کامل الاقتدار بادشاہت ہو جس پر ہمیشہ آصفی خاندان کا ایک مسلمان رکن متمکن رہے۔

(۲) ہندوستان کے وفاقی دستور میں حیدرآباد کی شرکت اگر ناگزیر ہو تو حیدرآباد صرف اسی صورت میں مناسب اور شایان شان حصہ لے سکے گا جبکہ اس کا سیاسی اقتدار مالیاتی توازن اور معاشی ترقی کے امکانات متضرر نہ ہوں۔

(۳) اگر ملک کی ترقی کے لئے موجودہ دستور میں کوئی تبدیلی ناگزیر متصور ہو تو مسلمانانِ دکن کسی ایسی تبدیلی کو ہرگز قبول نہ کریں گے جس سے مسلم جماعت کی روایتی سیاسی برتری متاثر ہو جو حیدرآباد کی تاریخ میں اسے صدیوں سے حاصل رہی ہے۔

الف :۔ مقننہ اور ادارہ جات مقامی حکومت خود اختیاری کی ترکیب میں بہرصورت مسلمانوں کو آئینی اکثریت حاصل رہے

ب :۔ مسلم نشستیں جداگانہ انتخاب کے ذریعہ پُر کی جائیں۔

(۴) اردو ہندوستان بھر کی مشترکہ اور حیدرآباد کی سرکاری زبان ہے وہ ہمیشہ حیدرآباد کی سرکاری اور تحتانی جماعتوں کی تعلیمی و جامعاتی زبان رہے۔

(۵) ملازمت مسلمانوں کے لئے نہ صرف تاریخی، سیاسی وقار کا بلکہ ایک معاشی مسئلہ بھی ہے۔

اس لئے فرقہ واری تناسب کا سوال اس مسئلہ میں پیدا ہی نہیں ہوتا اور مسلمان
اس سے محروم ہونے کے لئے کبھی تیار نہ ہوں گے۔

(۶) حیدرآباد میں ہر مذہب و ملت کے لئے جائز آزادی ہمیشہ سے رہی ہے اور
رہیگی لیکن بادشاہ کا مذہب چونکہ اسلام ہے اور رہے گا اس لئے عہدہ
صدرالصدور جس سے خدمات شرعیہ متعلق ہیں اپنی روایاتی خصوصیات کے
ساتھ علیٰ حالہٖ قائم رہے اور مسلم اوقاف اور مسائل مذہبی کے انتظامات سے
متعلق ایک آئینی مسلم ادارہ کو حکومت تسلیم کرے۔

(۷) حیدرآباد میں شہری آزادی ہر شخص کو بلالحاظ مذہب و ملت حاصل رہی ہے
اور رہے گی بشرطیکہ اس کا استعمال ناجائز نہ ہو اور اس کو ملک میں باغیانہ
اور فرقہ وارانہ جذبات کے اشتعال کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

(۸) ملک کے اہم پیشوں تجارت، زراعت اور صنعت میں مسلمانوں کا حصہ نفی
کے برابر ہے جس کی وجہ سے ان کی معاشی حالت پر برا اثر پڑ رہا ہے لہٰذا ایسے
وسائل و اسباب فراہم کئے جائیں جن سے ان کی معاشی مشکلات رفع ہوں
اور وہ ان پیشوں میں شایان شان حصہ لے سکیں۔

(۹) مجلس وضع قوانین میں مسلمانوں کی آئینی اکثریت کے ساتھ یہ مطالبہ بھی کیا گیا
کہ کوئی مسودہ قانون جو کسی مذہب یا تہذیب پر اثر انداز ہو اس وقت تک
قانون نہ بنے گا جب تک کہ اس فرقہ کے ارکان مقننہ کی ⅔ تعداد اس کی
موافقت میں رائے نہ دے۔

یہ مسلمانوں کے بنیادی مطالبات تھے۔ ان سے مسلمانوں پر یہ الزام عاید
ہوتا ہے کہ وہ کتنے رجعت پسند تھے۔ جمہوریت کے مقابلہ میں مطلق العنان بادشاہت کو
ترجیح دیتے تھے اور زمانہ کے مقتضیات کے سمجھنے کی ان میں صلاحیت نہ تھی بہادر یار جنگ

نے مسلمانوں کے اس موقف کی تائید میں اپنی خطابت کی ساری قوتیں صرف کردیں لیکن ہندوؤں کو وہ مطمئن نہ کر سکے جو جمہوریت کا نام لے کر برطانوی ہند سے انگریزی سلطنت کو اور حیدرآباد میں مسلم اقتدار کے ختم کرنے کے درپے تھے۔

آینگار کمیٹی کی سفارشات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی نشستیں دی گئیں تھیں اور غیر مسلموں کے مقابلہ میں مسلمان اقلیتی پوزیشن میں آجاتے تھے۔ یہ چیز مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول تھی۔ چنانچہ اتحاد المسلمین نے اصلاحات کے خلاف سخت مورچہ قائم کیا۔ سر اکبر حیدری کی حکومت پریشان ہو گئی۔ بالآخر قائد اعظم کو مدعو کر کے مسلمانوں کو مقننہ میں بمقابلہ غیر مسلم مساوات کا تیقن دلایا گیا۔ مسلمانوں کے ساتھ اس ترجیحی سلوک کرنے کی وجہ سے ہندوؤں نے بھی اصلاحات کو قبول نہیں کیا۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر جنگ چھڑنے کی وجہ سے اصلاحات کی پوری اسکیم ہی کو حکومت نے التوا میں ڈالدیا۔

اس کامیابی سے مسلمانوں کے حوصلے بہت بلند ہوگئے۔ اور بہادر یار جنگ کی عظمت کا سکہ مسلمانوں کے دلوں پر بیٹھ گیا۔ دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو چکی تھی۔ ایک ریاست ہونے کی وجہ سے حیدرآباد کے لئے امداد جنگ میں شایان شان حصہ لینا ضروری تھا۔ حیدرآباد نے کبھی اس سے دریغ نہیں کیا۔ بہادر یار جنگ نے حکومت حیدرآباد کی تائید کرتے ہوئے امداد جنگ کے بہانے مسلمانوں کو عسکری حیثیت سے منظم کرنے کی بڑی کوشش کی۔ ان کی اس زمانہ کی تقاریر ان کے ان جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ علاوہ ازیں دوران جنگ جب برطانوی حکومت نے ہندوستان کو نوآبادی مرتبہ دینے کا اعلان کیا تو بہادر یار جنگ کے سمند ناز کو ایک اور تازیانہ لگا۔ انھوں نے بیرا موشی کے تار و پود بکھیرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ علاقہ جات مفوضہ کی واپسی کے مطالبہ میں شدت پیدا کی گئی۔ ایک تقریر کا اقتباس ملاحظہ ہو:-

"گزشتہ جنگ کے مقاصد اور آج کی لڑائی کے مقاصد میں بہت بڑا فرق ہے۔

آج کی لڑائی حق وصداقت کے لئے لڑی جارہی ہے ۔ برطانیہ کے ارباب حل وعقد نے ایک سے زائد مرتبہ اعلان کیا ہے کہ وہ معاہدات کا احترام کرانے کے لئے لڑ رہے ہیں ۔ ان واضح اور صاف مقاصد جنگ کی موجودگی میں ہماری یہ امداد سابقہ امداد کی طرح رائیگاں نہیں جاسکتی ۔ جنگ کے دو ہی نتائج ہوسکتے ہیں فتح یا شکست ۔ ہم کو فتح کا یقین ہے ۔ برطانیہ کی فتح ہماری زندگی ہے اور اسکی شکست ہماری تباہی ۔ اگر فتح یقینی ہے تو اس کے نتائج کیا ہوں گے ؟ سب سے پہلی چیز جو ہوگی وہ یہ ہے کہ حسب وعدہ حکومت برطانیہ ہندوستان کو قانون ویسٹ منسٹر کے مطابق مقبوضاتی مرتبہ عطا کردیگی جس کے یہ معنی ہیں کہ اب ہمارے اطراف راست برطانوی حکومت کی بجائے ہندوستانی حکومت کارفرما ہوگی اور یہ امر مسلم ہے کہ ہمارے تمام معاہدات تاج برطانیہ کے ساتھ ہیں ۔ مقبوضاتی مرتبہ کے ساتھ ساتھ ہندوستان کو اختیارات مدافعت بھی کاملاً مل جائیں گے اور ہم نے اپنی مدافعت کے اختیارات اپنی رضامندی سے تاج برطانیہ کے تفویض کئے تھے ۔ ان تمام حالات کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ چونکہ حکومت برطانیہ راست ہماری مدافعت کے قابل نہ ہوگی اور اس بات کے ہم مجاز ہیں اور رہیں گے کہ جدید ہندوستانی حکومت سے جس قسم کے تعلقات مناسب سمجھیں قائم کریں ۔ اس لئے لازمی طور پر وہ تمام معاہدات منسوخ ہوجائیں گے جو ہم نے مدافعت کے سلسلہ میں تاج برطانیہ سے کئے ہیں اور اس کا دوسرا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ چونکہ اب خود ہم کو اپنی مدافعت کا سامان کرنا ہوگا اس لئے وہ تمام مقبوضات جو ہم نے مدافعتی افواج کے اخراجات کے لئے یا کسی اور طریقہ پر انعاماً وعطاءً تاج برطانیہ کے تفویض کئے تھے ہم کو واپس مل جائیں گے ۔

اگر خدانخواستہ برطانیہ کو شکست ہوئی اور ہندوستان پر اس کی گرفت ڈھیلی ہوگئی ہندوستان میں نراج پیدا ہوگیا اور سارا ملک ان خطرات سے دوچار ہونے لگا ۔

جو آج ہم کو دور نظر آ رہے ہیں تو معاہدات کی روشنی میں جو حکومت برطانیہ نے ہم سے کئے ہیں ہم اس سے کس امداد کی توقع کرسکتے ہیں؟ خصوصاً جبکہ معاہدات کی رو سے حکومت برطانیہ اس وقت ہماری امداد پر مجبور نہیں ہے جبکہ اس کی فوجیں دوسری طرف مشغول ہیں۔ کیا ہم اتنے طاقتور ہیں کہ ایسی طوائف الملوکی کا مقابلہ کریں؟

اس شبہ کو موجودہ امداد سے خارج نہیں تصور کیا جاسکتا کیونکہ ہماری حکومت آج بھی مجبور نہیں ہے کہ اپنی فوجی طاقت میں اضافہ نہ کرے۔ حکومت کو چاہیئے کہ حالت کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے فوراً اپنے یہاں سامان حرب تیار کرنے والے کارخانے قائم کرے۔ اپنے توپ کے سانچے، بندوق سازی کے ٹوٹے ہوئے کارخانوں کو دوبارہ زندہ کرے اور اپنے ملک کو اس قابل بنائے کہ اپنے حلیف کی اس پریشانی میں وہ بوقت ضرورت اپنی آپ حفاظت کرسکے۔ ہم کو یقین ہے اور برطانیہ سے اس یقین کے قائم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ جو آلات حرب ہم تیار نہیں کرسکتے اور جن کی موجودہ زمانہ میں شدید ضرورت ہے مثلاً ہوائی جہاز، مشین گن، دیا بے ہوائی مدافعت کے سامان، اینٹی ایرکرافٹ توپیں وغیرہ وہ ہم کو فراہم کئے جائیں گے بلکہ بعجلت ممکنہ فراہم کئے جائیں کیونکہ زمانہ کی رفتار خطرات کو کچھ زیادہ دور نہیں بتا رہی۔"

امداد جنگ کے سلسلہ میں اتحاد المسلمین نے ایک مبسوط یادداشت بھی حکومت کی خدمت میں پیش کی۔ مطالبات کی معقولیت سے کسی کو انکار کی جراءت نہ ہوسکتی تھی۔ برطانوی رزیڈنٹ اپنی جگہ خاموش حالات کے مطالعہ میں مصروف تھا اور اتحاد المسلمین کے ارکان پوری تندہی سے دفاعی کمیٹیوں میں شریک ہوکر امداد جنگ کے کاموں میں حصہ لے رہے تھے۔ حیدرآباد کے ہندو زعماء بھی ان مطالبات کے خلاف زبان نہیں ہلا سکتے تھے۔ البتہ گاندھی جی نے اخبار ہریجن میں اس کے خلاف آواز اٹھائی اور یہ بتلایا کہ زمانہ کے حالات بدل گئے ہیں۔ مفوضہ علاقہ جات کی حیدرآباد کو واپسی کے قبل ان علاقوں کے لوگوں کی رائے

معلوم کرنی ضروری ہے۔ کانگریس کے ایک سابق صدر پٹابھی سیتارامیا نے اپنے اخبار ہنسن پیلز میں علاقہ جات شمالی سرکار کے استرداد کے خلاف آواز اٹھائی ان دونوں ہندو زعما کا بہادر یار جنگ نے تاریخی حقائق کی روشنی میں مدلل جواب دیا۔ بہادر یار جنگ کا یہ بھی مطالبہ تھا کہ جس طرح دوران جنگ میں انگریزوں نے ہندوستان کو مقبوضاتی حیثیت دینے کا وعدہ کیا ہے اسی طرح حیدرآباد کے مفوضہ علاقہ جات کی واپسی کا بھی اسی زمانہ میں اقرار کیا جائے۔

حیدرآباد کے آزاد سیاسی موقف کی بحالی کے لئے بہادر یار جنگ نے سب سے پہلے جدوجہد شروع کی۔ ان کی کوئی سیاسی تقریر اور خطبہ صدارت ایسا نہیں ہے جن میں حیدرآباد کی آزادی کی بحالی اور پیرامونٹسی کے نظریہ کی مخالفت نہ کی گئی ہو۔ وہ کانگریس کو تاج برطانیہ کا قائم مقام تسلیم کرنے تیار نہ تھے۔ فرماتے ہیں:-

"حیدرآباد اپنی تاریخ کے ہر دور میں ایک آزاد سلطنت رہا ہے اور آئندہ بھی ایک آزاد سلطنت رہے گا۔ اور سلطنت برطانیہ کے ساتھ اس کے دوستانہ اور حلیفانہ تعلقات ایسے نہیں ہیں جو ایک سے دوسروں کے ہاتھوں فروخت یا منتقل کیے جائیں اگر تاج برطانیہ ہندوستان کی سیاست میں کسی تبدیلی کو گوارا کر لیتا ہے جو ہندوستان میں اس کے اقتدار کی قلت کا باعث ہو اور وہ اپنے حلیف یعنی حیدرآباد کے ساتھ کیے ہوئے معاہدات کی تکمیل کے قابل نہ رہے تو اس کا پہلا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ ساری ذمہ داریاں جو حیدرآباد کی طرف سے اس نے اپنے اوپر لی تھیں حیدرآباد کو واپس کر دے .... آج تک ہمارے تعلقات بتوسط وائسرائے راست حکومت برطانیہ سے ہیں۔ حکومت ہند سے ہم بعض مشترکہ مسائل میں اشتراک عمل ضرور کرتے ہیں لیکن کبھی خود ہم نے یا حکومت برطانیہ نے اس کے خلاف کوئی اور خیال کیا کہ ہمارے تعلقات حکومت ہند سے الگ ہیں.... جو لوگ ہمارے تعلقات کو حکومت ہند کے ساتھ قائم تصور کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ حیدرآباد

ایک غلامی سے نجات پاکر دوسری غلامی میں گرفتار ہوجائے اور آنے والی ہندوستانی حکومت برطانیہ کی طرح اقتدار اعلیٰ ہونے کا دعویٰ کرنے لگے ... آئندہ قائم ہونیوالی حکومت ہند سے وہ اپنے تعلقات ضرور قائم کرے گا اور بہت سے ایسے امور ہوں گے جو ہندوستان کے لئے مشترک ہوسکیں گے اور وہ اشتراک عمل کے لئے تیار بھی رہیگا لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ انگریز حکومت اس کی اجازت دے کہ وہ آنے والی حکومت ہند کو اپنے معاہدات کا وارث ٹھہرائے ۔"

بہادر یار جنگ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے موئید تھے، ایک سے زائد مرتبہ انھوں نے ہندوؤں سے مفاہمت کی پُرخلوص کوششیں بھی کیں ذمہ دارانہ حکومت کے سوال پر یہ گفتگو نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی ۔ بہادر یار جنگ ذمہ دارانہ حکومت کو ایک بعید تصور کی حیثیت سے بھی قبول کرنے تیار نہ تھے ۔ ان کے نزدیک ذمہ دارانہ حکومت مسلمانوں کی سیاسی موت کے مرادف تھی ۔ فرماتے ہیں :-

"جمہوریت کے لئے سب سے ضروری چیز ان عوام کا جن پر حکومت مشتمل ہوگی ایک رابطۂ خیال میں منسلک ہونا ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان اور خصوصاً حیدرآباد میں بسنے والے باشندوں کے زاویہ ہائے نظر، طریقہ ہائے فکر اتنے مختلف ہیں کہ ان کو کسی طرح ایک قوم نہیں کہا جا سکتا۔ ... میں حیدرآباد کی بجائے کسی اور ملک میں ہوتا تو شاید میں بھی ذمہ دارانہ حکومت اور جمہوریت کے سب سے بڑے مدعیوں میں سے ہوتا۔ اگر دساتیر کا انحصار ماحول پر ہے اور حیدرآباد کا ماحول وہی ہے جو میں نے بیان کیا ہے تو مجھ سے یا اس جماعت سے جس کی میں نمائندگی کر رہا ہوں قطعاً توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی اور طریق حکومت کا تصور بھی کرے گی جس کا لازمی نتیجہ السلطنت کے اقتدار شاہی کا کم یا دوسری طرف منتقل ہو جانا ہے۔ حیدرآباد میں مسلمان کسی ایسے جمہوری اصول، اس کے مطالبہ یا اس کے خیال کو بھی برداشت نہیں کر سکتے

جو جمہوریت کا نام لے کر ہندو اکثریت کے اقتدار کو بڑھانے کا باعث ہو۔ وہ کسی
ایسے ادارہ سے تو اشتراک عمل پر غور کر سکتے ہیں جس میں ان کی آواز کو پوری
قوت حاصل ہو اور جو یہاں کی مسلم حکومت کو ایماندارانہ مشورہ دینے، رعایا
کے جذبات سے صحیح طور پر واقف کرنے اور اس کی ضروریات کو ظاہر کرنے کا کام
دے لیکن کسی ایسے ادارہ کا قبول نہیں کر سکتے جو وزراء کی ذمہ داریوں کو مسلم
بادشاہ کے سوا غیر مسلم اکثریت کی طرف منتقل کر دے "۔

حیدرآباد کے مسلمانوں پر ایک الزام ملوکیت پرستی کا بھی لگایا جاتا ہے جس میں سب سے
پیش پیش بہادر یار جنگ نظر آتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمان بجز تخت و تاج
آصفی سے وابستگی کے کسی اور طرح اپنے وجود سیاسی کو برقرار ہی نہیں رکھ سکتے تھے۔
بادشاہ ان کے سیاسی اور تمدنی اقتدار کا مظہر تھا جس کو کامل الاقتدار رکھکر مسلمان
سیاسی حیثیت سے حیدرآباد میں زندہ رہ سکتے تھے۔ تخت و تاج آصفی سے مسلمانوں
کی عقیدت و وابستگی میں بہادر یار جنگ نے کچھ غلو سے کام لیا اور اس کو ایک سیاسی کلمہ
کی شکل دیدی :-

"ہم دکن کے بادشاہ ہیں، اعلیٰحضرت بندگان عالی کا تخت و تاج ہمارے سیاسی
اور تمدنی اقتدار کا مظہر ہے۔ اعلیٰحضرت ہماری بادشاہت کی روح ہیں اور ہم ان
کی بادشاہت کا جسم، اگر وہ نہیں تو ہم نہیں اور ہم نہیں تو وہ نہیں "۔

بہادر یار جنگ اپنی شاہ پرستی کی کس طرح توجیہ کرتے ہیں وہ بھی سن لیجئے :-

" یہ نہ سمجھنا کہ میں شاہ دکن کی خاطر مر رہا ہوں اور جان دے رہا ہوں۔ میں
عبدالملک نہیں عبداللہ ہوں اور دنیا کا کوئی صاحب ایمان عبداللہ کے سوا اور
کچھ نہیں ہوتا۔ میں تخت و تاج آصفی پر اس لئے قربان نہ ہوں گا کہ وہ جلالت الملک
میر عثمان علی خاں کا تخت و تاج ہے.... میں تخت و تاج آصفی اور اقتدار شاہان آصفیہ

پر اس لئے قربان ہونا چاہتا ہوں کہ میں اس اقتدار کو ملت اسلامیہ کا اقتدار اور اس تخت و تاج آصفی کو ملت اسلامیہ کے اقتدار کا مظہر تصور کرتا ہوں۔"

بہادر یار جنگ کے ان خیالات اور سیاسی معتقدات میں انتہا پسندی کے غالب عنصر کے باوجود حیدر آباد کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات میں کوئی خلیج حائل نہ تھی۔ ہندوؤں کے مطالبات میں توازن قائم کرنے کے لئے ان خیالات کے اشاعت کی ضرورت بھی تھی۔ علاوہ ازیں اس امر کو بھی ذہن نشین رکھنے کی ضرورت ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی، ہندوستان کو متبوضاتی درجہ عطا کرنے کے برطانوی وعدہ کو تکمیل ہونے کے لئے ابھی وقت درکار تھا، اس کی بھی کوئی پیش قیاسی نہیں کیجا سکتی تھی کہ انگریز ہندوستان کو تقسیم کر کے دامن جھٹک کر رفو چکر ہو جائیں گے، اسی طرح اور بہت سے ایسے عوامل تھے جن کے پیش نظر حیدر آباد کے مسلمانوں کے مطالبات میں شدت برتی جانی ضروری تھی۔ علاوہ ازیں سیاست میں انتہا پسندی بطور پالسی بھی اختیار کی جاتی ہے تاکہ فریق مخالف سے مفاہمت کی راہ ہموار کرنے کے لئے سودے بازی کی بھی گنجائش باقی رہے۔ ماہ جون ۱۹۴۴ء میں بہادر یار جنگ کا انتقال ہوا اور اگست ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کی سیاست میں جو انقلاب انگیز تبدیلیاں پیدا ہوئیں وہ ایک دور بیں اور دور رس نگاہ رکھنے والے قائد کو چونکا دینے کے لئے کافی تھیں۔ جدید حالات اور وقت کے مقتضیات کے لحاظ سے حیدر آباد کے موقف کو بھی متعین کیا جا سکتا تھا۔

بہادر یار جنگ اگر زندہ ہوتے اور انھیں حیدر آباد کے مسئلہ کو سلجھانے کا موقع رہتا تو وہ ان حالات میں کیا کرتے؟ میرا تو ایقان ہے کہ بہادر یار جنگ کبھی حیدر آباد کو اس طرح تباہ نہ ہونے دیتے۔ حالات اور واقعات کے اعتبار سے ممکن ہے حیدر آباد میں مسلمانوں کا روایتی موقف باقی نہ رہتا لیکن انھیں ایک باعزت زندگی بسر کرنے

اور معاشی و اقتصادی حیثیت سے اپنے اندر استحکام پیدا کرنے کے مواقع حاصل ہوجاتے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں قاسم رضوی کی اشتعال انگیز تقاریر سے جو منافرت کے جذبات پیدا ہوئے لاکھوں مسلمان انتقام کے بھینٹ چڑھے، اربوں روپے کی جائیداد تباہ ہوئی اور عورتیں بے آبرو کی گئیں۔ یہ چیزیں کبھی نہ ہوتیں۔ اس کا بھی قوی امکان تھا کہ بہادر یار جنگ کی مساعی جمیلہ سے ہندو اور مسلمان مل کر حیدر آباد کے مستقبل کی جدید انداز سے تعمیر کرتے جس میں اجارہ دارانہ نظام کا خاتمہ ہوتا اور عامۃ الناس اپنی زندگی میں خوشحالی کے نئے باب کا اضافہ کرتے۔ لیکن مشیت الہٰی کچھ اور تھی اور انسان کو مشیت الہٰی میں دم مارنے کی گنجائش نہیں۔ بہادر یار جنگ کی موت دکن میں مسلمانوں کی حیات سیاسی کی موت ثابت ہوئی۔

۲۳

ابوالحسن سید علی کا دورِ صدارت

اتحادالمسلمین کے صدور میں بہادر جنگ کے بعد جس شخص نے سب سے زیادہ اپنی سیاسی بصیرت، تدبر، اصابت رائے اور بیدار مغزی کا ثبوت بہم پہنچایا وہ ابوالحسن سید علی تھے۔ علیگڈھ کے تعلیم یافتہ، کامیاب ایڈوکیٹ اور ایک اچھے مقرر ہونے کے علاوہ ملک کے واحد ہندو مسلمانوں پر مشتمل سیاسی ادارہ "جمیعت رعایائے نظام" کے صفِ اول کے لیڈروں میں ان کا شمار کیا جاتا تھا۔ یہ ادارہ ابتداءً ملکی تحریک کا علمبردار تھا اور اس کے پیش نظر بلا تفریق مذہب و ملت حیدرآباد کی خدمت تھی۔ اس میں بہادر یار جنگ، سر نظامت جنگ اور دیگر چوٹی کے مسلم زعما بھی شریک تھے لیکن قانون وفاق ہند ۱۹۳۵ء کے بعد جب کانگریس نے ریاستوں میں اپنی عدم مداخلت کی معلنہ پالسی کو ترک کرکے ذمہ دارانہ حکومت کا پرچار شروع کیا تو حیدرآباد کے ہندوؤں میں بھی یہ تحریک شروع ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمیعت رعایائے نظام سے مسلمان ارکان علحدہ ہوگئے اور ان میں اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے علحدہ سیاسی تنظیم قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا جس کے لئے اتحاد المسلمین کو منتخب کیا گیا جو اب تک مسلمانوں کے مذہبی، معاشرتی اور ثقافتی خدمات انجام دے رہی تھی۔۔ ابوالحسن سید علی اتحاد المسلمین کے معتمد منتخب ہوئے دستور کے لحاظ سے اس جماعت میں صدر کا عہدہ ہی نہ تھا اور معتمد ہی پوری جماعت کا محور سمجھا جاتا تھا۔

ابوالحسن سید علی نے اتحاد المسلمین کے معتمد کی حیثیت سے مسلمانوں کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ مجلس کی تنظیم کا بنیادی کام اور اضلاع پر اس کی شاخوں کا قیام ابوالحسن سید علی کی شبانہ روز محنت کا نتیجہ ہے۔ اپنے زمانۂ معتمدی میں انھوں نے جو تقریریں کیں اور خطبات صدارت پیش کئے اُن سے ان کی سیاسی بصیرت اور مسائل پر عبور کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہندوؤں کی فطرت اور ذہنیت سے وہ بخوبی واقف تھے۔ بہادر یار جنگ اور نرسنگ راؤ کی گفتگوئے مفاہمت کی ناکامی کے بعد مجلس کے پلیٹ فارم سے ابوالحسن سید علی نے ہندوؤں سے تعاون کی چار شرائط پیش کی تھیں جن سے نہ صرف ان کی بالغ نظری کا پتہ چلتا ہے بلکہ ہندو عزائم کا پردہ بھی چاک ہوتا ہے۔ ایک خطبہ میں انھوں نے کہا تھا:۔

"(۱) کیا ملک کی ہندو برادری اس بات پر آمادہ ہے کہ وہ اپنے قول و فعل سے مسلمانوں کے اس اندیشہ کو رفع کرے کہ ہندو جماعت بیرونی انقلاب انگیز اداروں سے اپنا تعلق رکھتی ہے اور حیدرآباد میں اس ہندو مسلم ارتباط و اتفاق کی دشمن ہے جو صدیوں سے چند سال پیشتر تک تھا؟

(۲) کیا ہندو جماعت آج اپنی نیک نیتی کے ثبوت کے طور پر یہ عہد کرتی ہے کہ وہ کانگریس کی اس تجویز سے کہ ہندوستان کی تقسیم لسانی بنیادوں پر کر کے مسلم جماعت کی تہذیب و تمدن کو اس سرزمین سے مٹایا جائے قطعی اجتناب کرے گی اور حیدرآباد کے تین ٹکڑے اسی لسانی بنیاد پر کر کے ان تینوں ٹکڑوں کو برطانوی صوبجات سے ملحق کرنے کی سعی سے باز رہے گی؟

(۳) کیا ہندو جماعت آج صحیح مشترک قومیت کے قیام کے لئے مسلمانوں کو اطمینان دلانے کے لئے آمادہ ہے کہ وہ مجالس مقننہ و مقامی مجالس اور ملازمتوں میں ہندو مسلم متناسب نمائندگی پر زور دینے کی بجائے محض حیدرآبادی قومیت کے اشخاص

کو بلا لحاظ تفریق مذہبی فائز دیکھنا چاہتی ہے ؟

۱۲۔ کیا ہندو جماعت اردو کو جو نہ ہندو زبان ہے نہ مسلم زبان بلکہ ہمارے باہمی اشتراک کی پیداوار ہے قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرکے مقامی زبانوں کو اس کے مقابل اہمیت دینے کی سعی سے دستبردار ہوتی ہے ؟

ابوالحسن سید علی ذمہ دارانہ حکومت کے مخالف تھے لیکن حیدرآباد کی مجلس وزراء اس کے اعمال اور طریقۂ انتخاب سے وہ قطعاً مطمئن نہ تھے۔ وزراء کے تقرر میں رزیڈنسی کی ریشہ دوانیوں کو وہ برداشت نہیں کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اس چیز نے کونسل میں بمقابلۂ ذاتِ شاہانہ ایک احساس بے خوفی پیدا کردیا ہے اور وزراء بیرونی اقتدار کی قوت پر اور اس کی خوشنودی کی خاطر اہلِ ملک کے جذبات کی پرواہ نہیں کرتے اور اس کے مغائر عمل کرتے ہیں۔

نظم و نسق کی اصلاح کے نام سے وہ مجلس وزراء میں ایسے ارکان کو فائز دیکھنا چاہتے تھے جو قابلیت اور کردار کے ساتھ ساتھ رائے عامہ کا بھی احترام کرسکیں۔ ملک کی عاملہ کی خوبی کا ایک معیار ان کے نزدیک یہ تھا :-

"اس کی پالسی اہل ملک کی ضروریات اور احتیاجات کو پیش نظر رکھکر اہلِ ملک کے جذبات سے واقف ہونے کے بعد معین کی جائے۔ ایک کروڑ چالیس لاکھ کی آبادی کے ملک میں درجن دو درجن افراد سے بھی کم کی کوئی جماعت ایسی ہو جو ملک کے حالات، اہل ملک کے خیالات، ان کی ضروریات سے ناواقف رہ کر اپنے خیالات اور اپنی عقل و فہم کا رائے عامہ کو پابند کرنا چاہے تو میں نہیں سمجھتا کہ ایسا نظم و نسق کامیابی کے کسی کمترین درجہ پر بھی چلایا جاسکتا ہے۔ میرا منشار اس سے لازماً پارلیمانی طریقہ ہائے حکومت کی طرف لے جانا نہیں ہے۔ میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ اس خیال کا اظہار کردیا ہے کہ مغربی طرز حکومت اور نام نہاد دیموقراطی ادارے ابھی

حکومت کے لئے ضروری نہیں ہیں۔ لیکن مقصود بالذات اچھی حکومت ہے...
جو نظم ونسق عوام کے مطالبات کو بیدردی سے ٹھکرائے وہ کسی طرح دعویٰ نہیں کر سکتا
کہ عوام کی ضروریات کو پیش نظر رکھکر اور ان سے واقفیت تامہ حاصل کر کے عوام
کی فلاح و بہبود کے لئے چلایا جارہا ہے... کیا ان افراد نے جن کے ہاتھوں میں
حسن اتفاق یا سوء اتفاق سے اقتدار آگیا ہے تدبر اور فراست کا ٹھیکہ لے لیا ہے؟"

ابوالحسن سید علی کے ان ترقی پسندانہ خیالات سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زمانہ کے متغیر حالات اور ان کے مقتضیات سے کتنے واقف تھے۔

مجلس اتحاد المسلمین کے جدید دستور کے نفاذ کے بعد بہادر یار جنگ اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ بہادر یار جنگ کی مقبولیت نے انھیں ملک میں قائد ملت بنادیا تھا۔ حیدرآباد سے باہر پورے اقطاع ہند میں بہادر یار جنگ نے شہرت حاصل کر کے سارے مسلمانان ہند کے قلوب کو مسخر کر لیا تھا۔ ابوالحسن سید علی کو حضور نظام نے بہادر یار جنگ کے مدِ مقابل کھڑا کر دیا۔ ان دونوں قائدین کے دلوں میں میل آگیا۔ اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں بہادر یار جنگ ابوالحسن سید علی سے کافی بدظن تھے، اپنی عالم میں انھوں نے ان کو نہیں لیا بلکہ اپنی جانشینی کے لئے فضل حسین مرحوم ایڈوکیٹ صدر مجلس اتحاد المسلمین ضلع ورنگل کو نشان زد کر دیا تھا۔

بہادر یار جنگ کا ۲۷ر جون ۱۹۴۴ء کو اچانک انتقال ہوا اور اسی روز ابوالحسن سید علی کی گوشہ نشینی بھی ختم ہوئی۔ بہادر یار جنگ کی لاش "بیت الامت" کے وسیع دالان میں آخری دیدار کے لئے رکھی ہوئی تھی اور بادشاہِ وقت سے لے کر امراء، عمائدین، ہندو زعماء اور عامۃ الناس کا مرحوم قائد کو آخری خراج عقیدت اور تعزیت پیش کرنے کے لئے تانتا بندھا ہوا تھا۔ ان لوگوں کی پیشوائی ابوالحسن سید علی کے سوا اور کون کر سکتا تھا؟ اس روز انھوں نے اتحاد المسلمین کی نمائندگی کا

پورا حق ادا کیا۔ اگر اپنی جانشینی کے متعلق بہادر یار جنگ کی وصیت نہ ہوتی تو ابوالحسن سید علی کے سوا کسی اور جانب نظر اُٹھانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ مسئلہ جانشینی پر غور کرنے کے لئے دارالسّلام میں ارکانِ شوریٰ کا ایک غیر رسمی جلسہ منعقد ہوا۔ فضل حسین پر سب کا اتفاق ہو بھی جاتا لیکن ارکانِ خمسہ[۵] (کلیم الدین انصاری، احمد عبداللہ المسدوسی، عبدالکریم تماپوری، محمد اعظم، انیس الدین احمد) اور قاسم رضوی نے ابوالحسن سید علی کے نام پر اصرار کیا۔ صدارتی گتھی جب کسی طور پر مجلس کے اندر سلجھتی نظر نہ آئی تو لائق علی اور بابو خان نے جو حیدرآباد کے مشہور صنعت کار اور ابوالحسن سید علی کے ہمدرد تھے ثالث کی حیثیت اختیار کرنے کی کوشش کی جو نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ اتحاد المسلمین کے دستور کے بموجب انتخاب کا اعلان کیا گیا اور کثرت رائے سے ابوالحسن سید علی کا صدارت پر انتخاب عمل میں آگیا۔ اتحاد المسلمین کا یہ پہلا انتخاب تھا جو انتہائی خوشگوار فضا میں منعقد ہوا اور انتخاب کے بعد کسی کے دل میں کوئی میل باقی نہ رہا۔

اتحاد المسلمین کی صدارت پر فائز ہونے کے بعد ابوالحسن سید علی نے بہت جلد اس خلا کو پورا کر دیا جو بہادر یار جنگ کی موت کی وجہ سے ملک میں پیدا ہو گیا تھا۔ اپنی فکر و عمل کو انھوں نے مسلمانوں کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا اعد فیا دستہ کا منصب بھی حاصل کر لیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری عالمگیر جنگ اختتام کے آخری مرحلوں سے گذر رہی تھی، سر اسٹرا فورڈ کرپس کا منصوبہ منظر عام پر آچکا تھا اور ہندوستان قلمروی حیثیت کی دہلیز پر پہنچ گیا تھا۔ تقسیم ہند کے مسئلہ پر کانگریس اور مسلم لیگ کی نبرد آزمائی بھی پوری قوت سے جاری تھی اور پاکستان

---

[۵] مجلس کے اندر پانچ اصحاب کی ایسی جماعت جس کو اپنی فکر و دانش کے متعلق غلط فہمی ہو گئی تھی۔ اس کا مطمح نظر مجلس کے اندر معتمد حیثیت حاصل کرنا اور مجلس سے باہر حکومت سے ربط قائم رکھنا تھا۔ یہ جماعت حکومت کی کرسیوں کی سب سے زیادہ اپنے آپ کو اہل سمجھتی تھی۔

کے قیام کے بھی امکانات روشن تر ہوتے جا رہے تھے۔ مرکزی حکومت میں کانگریس کے اثر و نفوذ کے بڑھنے اور ہندوستان کی زمام حکومت کانگریس کے ہاتھوں میں آنے کے قوی امکان نے دیسی ریاستوں میں ذمہ دارانہ حکومت کی تحریک کو تیز تر کر دیا تھا۔ حالات سرعت سے بدل رہے تھے۔ بہادر یار جنگ کی زندگی میں ہندوستان کے مطلع سیاسی کی جو حالت تھی اس میں اب تغیر پیدا ہو گیا تھا۔ ان حالات کا اقتضاء یہ تھا کہ حیدر آباد میں بھی ترقی کی جانب قدم اُٹھایا جاتا، حکومت کے فرسودہ نظام میں تبدیلی پیدا کی جاتی اور اس کو زمانہ کے ہم آہنگ بنا کر آئینی اصلاحات کو روبہ عمل لانے کی کوشش کی جاتی تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کی کوئی صورت پیدا ہو۔ ابوالحسن سید علی کی نظروں نے مستقبل کے پیش آنے والے واقعات کا جائزہ لیا اور حکومت میں عوامی عنصر کو داخل کرنے کے لئے انھوں نے اسٹیٹ کانگریس کے زعماء سے سالار جنگ پیلس میں بیٹھکر ایک سمجھوتہ کیا۔ اس کی رو سے دو ہندو اور دو مسلم عوامی وزراء کے فوری باب حکومت میں لئے جانے کے مطالبہ کے ساتھ معلنہ اصلاحات میں مفاداتی کی بجائے علاقہ واری طریقۂ انتخاب کے اختیار کرنے اور مقننہ کے اختیارات میں بجٹ کی منظوری کو شامل کرنے کی تجاویز بھی تھیں۔

ابوالحسن سید علی نے نیک نیتی سے اور اس تصور میں کہ منصب قیادت پر فائز ہونے کے بعد ان کی کوئی بات مجلس کے اندر رد نہ ہوگی یہ سمجھوتہ کر لیا تھا اور اتحاد المسلمین کی مجلس عاملہ یا اس کے دو ایک ذمہ دار ارکان تک کو اپنے اعتماد میں نہیں لیا۔ دانستہ انھوں نے ایسا کیا یا یہ ان کی بھول تھی اس کا حال تو اللہ بہتر جانتا ہے۔ لیکن اتحاد المسلمین کی عاملہ میں انھوں نے تھوڑی سیاست سے کام لیا۔ اگر واقعات من و عن بیان کر دیتے تو کوئی بات نہ تھی لیکن اس کی بجائے انھوں نے سمجھوتہ کی شرائط کو چھپا کر ان کی اہمیت اور ضرورت بتلا کر اپنی عاملہ سے ان شرائط کو قبول کروا لیا، اس تحریک کے

خلاف عاملہ میں راقم الحروف کی صرف ایک آواز تھی جس کے اختلاف کو روئداد میں نوٹ کر کے تحریک منظور کرلی گئی۔ میرا استدلال یہ تھا کہ اس تحریک سے ذمہ دارانہ حکومت کا دروازہ کھلتا ہے اس لئے رواروی میں تصفیہ نہ کیا جائے بلکہ شوریٰ سے منظوری حاصل کی جائے۔ مجلس عاملہ کی منظوری کے بعد اجلاس سالانہ کی مجلس موضوعات اور جلسہ عام سالانہ نے اس تحریک کو منظور کرلیا۔ مؤخرالذکر دونوں اجلاسوں میں اس قرارداد کے محرک سید محمد قاسم رضوی اور مؤید بشیر احمد علوی تھے۔

یہ قرارداد جہاں مسلم مفادات کی جڑوں پر ضرب کاری لگاتی تھی وہاں ارکانِ بابِ حکومت کے لئے موت کی گھنٹی کا بھی حکم رکھتی تھی۔ متمدین اور اعلیٰ حکام کے لئے جن کی زندگی کا مطمح نظر وزارتی کرسی حاصل کرنا ہوتا تھا، باب حکومت کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو رہے تھے اور جو اس وقت کرسیوں پر متمکن تھے وہ بھی اپنے آپ کو متزلزل محسوس کرنے لگے تھے۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ اقتدار شاہی پر زد پڑنے والی تھی۔ یہ ساری قوتیں بیک وقت اس قرارداد اور اس کے بانی ابوالحسن سید علی کے خلاف صف آرا ہوگئیں، حکومت کے خزانوں کے مُنہ کھل گئے اور اخبارات میں ایک ہنگامہ برپا کیا گیا۔ چند با اثر ارکان عاملہ دربار نظام میں باریاب بھی کئے گئے۔ اس ساری ہڑبونگ کا یہ نتیجہ نکلا کہ مجلس کے معتمد، خازن اور ان کے ساتھ چند ارکان عاملہ نے صدر کے پاس مجلس عاملہ سے اپنا استعفا پیش کردیا۔ ابوالحسن تنہا رہ گئے۔ اپنے پبلک پوزیشن کو بچانے کے لئے ان کے پاس صرف ایک صورت باقی رہ گئی تھی کہ مجلسِ شوریٰ کا اعتماد حاصل کریں۔ پارلیمانی اداروں میں بجٹ کی منظوری یا قرارداد مذمت کے پیش ہونے پر اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ اتحاد المسلمین ایک جمہوری ادارہ ضرور تھا لیکن اس میں اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کی یہ روایت قائم نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے یہ تدبیر کی گئی کہ صدر اپنا استعفا شوریٰ کی منظوری کے

لئے پیش کرے اور اگر شوریٰ استعفا نامنظور کر دے تو یہ متصور ہوگا کہ شوریٰ نے صدر پر
اعتماد کیا۔ چنانچہ ابوالحسن سید علی کے ہواخواہ ارکان شوریٰ کو استعفا کے خلاف ہموار کرنے
کے لئے ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اگر شوریٰ میں بحث مباحثہ ہوتا اور رائے شماری کی نوبت آتی
تو استعفا کے نامنظور ہونے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ اس نوبت پر نواب اکبر یار جنگ سابق
جج ہائی کورٹ نے جو ملک میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اپنے دولت کدہ
پر "اکابرین قوم" کا ایک اجتماع طلب کیا جس میں علی نواز جنگ، عبدالباسط خاں،
بابو خان اور چند لوگ شریک تھے۔ ابوالحسن سید علی کو بھی بطور خاص مدعو کیا گیا تھا
مسئلہ کے سارے پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اکابرین نے مسلمانوں کو انتشار سے بچانے
کے لئے ابوالحسن سید علی کو اپنے استعفا پر قائم رہنے کا مشورہ دیا جس کو انھوں نے
قبول کر لیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ خود ابوالحسن سید علی کی ایما پر یہ اجلاس طلب
ہوا تھا۔ ابوالحسن سید علی نے شوریٰ کے اجلاس میں ایک مطبوعہ پمفلٹ تقسیم کیا جس میں
قرارداد مصالحت کی پوری تفصیلات پیش کی گئی تھیں۔ ارکانِ عاملہ (بجز راقم الحروف)
کے استعفوں پر بڑی چوٹیں کی تھیں کہ ابتدا میں ان لوگوں نے تائید کی تھی لیکن بعد میں
اغراض کے تحت انحراف کیا۔ اس پمفلٹ میں ہندوستان کے سرعت پذیر سیاسی
حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بتلایا گیا تھا کہ اگر مسلمان ترقی پذیر خیالات کا ساتھ نہ
دیں گے تو تباہ ہو جائیں گے۔ اس کتابچہ کا ایک جملہ مجھے اب تک یاد ہے جس کا یہ مفہوم
تھا کہ قوموں کی رہبری کے لئے ایسی دور رس نظروں کی ضرورت ہوتی ہے جو آئندہ پچاس
سال میں پیش آنے والے واقعات کی پیش قیاسی کر کے قوم کو صحیح راہ پر گامزن کرے۔
اس میں شک نہیں کہ ابوالحسن سید علی نے صحیح وقت پر قوم کو آنے والے خطرہ سے آگاہ
کیا تھا اور اگر ان کی تجاویز پر عمل کر لیا جاتا تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق
کی ایک اساس پیدا ہو جاتی اور یکجہتی اور یگانگی کی فضا میں حیدرآباد کے مستقبل کا

کوئی اچھا نقشہ مرتب ہوتا حقیقت یہ ہے کہ اگر اتحاد المسلمین میں صدارت کے متعلق یہ ہنگامہ آرائی نہ ہوتی اور آزادی ہند اور ہندوستان سے گفت وشنید کے زمانہ میں ابوالحسن سید علی کو رہنمائی کا موقع ملتا تو بہتر نتائج برآمد ہوتے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتنی زبردست خلیج حائل نہ ہوتی اور حیدر آباد میں وہ کشت وخون اور لوٹ وغارت گری کا بازار گرم نہ ہوتا جس نے نہ صرف مسلم اقتدار کو ختم کیا بلکہ معاشی اور اقتصادی حیثیت سے بھی مسلمان کو تباہ وبرباد کر دیا۔

ابوالحسن سید علی کی سب سے بڑی کمزوری ان کی جاہ طلبی اور اقتدار کی ہوس تھی۔ وہ کسی طرح باب حکومت میں مسلم نمائندہ کی حیثیت سے داخل ہونا چاہتے تھے۔ اسی کی پیش رفت میں انھوں نے یہ خفیہ معاہدہ کیا تھا ورنہ اگر وہ سیدھے سادے طریقے سے مسلمانوں کے سامنے سارے واقعات رکھتے، اپنی عاملہ اور شوریٰ کے چند ذی اثر ارکان کو قبل از قبل اعتماد میں لیتے تو بہت ممکن تھا کہ قرار داد مصالحت کے خلاف دربار نظام اور حکومت کو سازش کرنے کا موقع نہ ملتا۔ ابوالحسن سید علی کو اپنی خود رائی کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ بالفاظ دیگر اتحاد المسلمین کی عدالت سے قرار داد مصالحت کے بانی کو مجلس سے "جلاوطن" اور اس قرار داد کے محرک (قاسم رضوی) کو حیدر آباد اور مسلمانوں کی قسمتوں سے کھیلنے کے لئے مجلس کے اندر آزاد چھوڑ دیا گیا۔

اتحاد المسلمین کی صدارت سے استعفاء دینے کی وجہ سے ابوالحسن سید علی کے پبلک وقار اور ذاتی وجاہت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ یہ پہلے ہی سے متلون مزاج تھے، ان واقعات نے ان کے دل میں مجلس کے خلاف جذبۂ انتقام پیدا کر دیا۔ اب بھی وہ اپنی جماعت کے قائد تھے اور ان کی قیام گاہ اضلاع اور بلدہ کے ارکان شوریٰ کی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ اپنی جماعت کو منظم کرنے اور مجلس کے اندر اس کو مقتدر حیثیت میں لانے کے لئے وہ اپنی دولت بے دریغ خرچ کر رہے تھے۔ ملک کا کوئی اخبار

اس جماعت کو منہ لگانے کے لئے تیار نہ تھا اس لئے پمفلٹ بازی شروع کی گئی اور مجلس کے برسراقتدار گروہ کے خلاف ایسی گندگی اچھالنے کی کوشش کی گئی جس کی نظیر حیدرآباد کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔ اس جماعت کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ شکست خوردہ سپہ سالار کے ساتھ صرف سپاہیوں کی جماعت تھی۔ سپہ سالار کی جگہ لینے والا کوئی نہ تھا۔ طوعاً و کرھاً قرار داد کے محرک سید محمد قاسم رضوی کو ابوالحسن سید علی کا جانشین منتخب کیا گیا۔ اس جماعت میں اب ابوالحسن سید علی کی وہی حیثیت تھی جو کانگریس میں گاندھی جی کی تھی کہ اصطلاحاً وہ ممبر کے رکن بھی نہیں تھے لیکن کانگریس کے کرتادھرتا تھے۔ قاسم رضوی کو اپنی زندگی کا یہ سنہری موقع ملا تھا اور انھوں نے پوری تندہی اور جوش سے مجلس کے برسراقتدار گروہ کے خلاف اپنی جماعت کو منظم اور اس کی تعداد میں اضافہ کرنے کی مہم شروع کی۔ ابوالحسن سید علی کا اثر ارکان شوریٰ کو اپنی طرف کھینچنے میں کام آتا رہا جس سے انھیں اطمینان ہوگیا تھا کہ اتحاد المسلمین پر پھر ان کا اقتدار قائم ہو جائے گا۔ چنانچہ مولانا مظہر علی کامل کے ایک سالہ دور کے بعد جب مجلس کا صدارتی انتخاب عمل میں آیا تو ابوالحسن سید علی کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور ان کا ایک نائب اور ان کی پیش کردہ قرار داد کا محرک اتحاد المسلمین کا صدر منتخب ہوگیا۔ لیکن ابوالحسن سید علی یہ فراموش کر گئے تھے کہ دنیا میں لوگ جس زینہ پر چڑھکر ترقی کرتے ہیں پہلے وہ اسی زینہ کو ٹھوکر مار کر گرا دیتے ہیں۔ صدارت کے انتخاب کے بعد قاسم رضوی نے سب سے پہلے ابوالحسن سید علی کے جوئے کو اپنی گردن سے اتار پھینکا اور اس احسان فراموشی کے خلاف ابوالحسن سید علی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ جماعت کے ارکان بھی ایک ایک کرکے قاسم رضوی کے ہمنوا ہوتے گئے۔

اتحاد المسلمین کے صدور میں ابوالحسن سید علی میں فراست و تدبر کے علاوہ فکر کی گہرائی تھی۔ سیاست کے نشیب و فراز سے نہ صرف وہ واقف تھے بلکہ وقت کی

نزاکت کا بھی انھیں احساس تھا۔ تحریر و تقریر میں افراط و تفریط سے انھوں نے کبھی کام نہیں لیا۔ سنجیدگی، بردباری اور خودداری ان کی زندگی کے اصل اصول تھے جن پر وہ آخر وقت تک قائم رہے۔

سقوطِ حیدرآباد کے بعد جب مسلمانوں کی تباہی سے متعلق ان کی پیش گوئیاں ایک ایک کر کے صحیح ثابت ہونے لگی تھیں مسلمانوں کو ان کی اصابت رائے کا احساس ہوا۔ قاسم رضوی نے ان کے ساتھ جو محسن کشی کی تھی اس کو بھی ابوالحسن سید علی نے اپنے دل سے نکال دیا تھا۔ نظام نے ملٹری حکومت کے قیام کے قبل جس مجلس مشاورۃ کا اعلان کیا تھا اس کے ایک رکن یہ بھی تھے اور اس حیثیت میں انھیں پھر ایکبار مسلمانوں کی خدمت کا موقع ملا تھا۔ شہر حیدرآباد میں اتحاد المسلمین کی جملہ شاخوں کے صدور و معتمدین کی گرفتاری کا جو فیصلہ کیا گیا تھا اس کے خلاف ابوالحسن سید علی نے مجلس مشاورۃ میں آواز اُٹھائی تھی جس کے بعد صرف اُن کارکنانِ مجلس کو گرفتار کیا جانے لگا۔ جن کے خلاف الزامات تھے۔ ملٹری گورنمنٹ کے قیام کے بعد مجلس مشاورۃ باقی نہ رہی لیکن اونچے حلقوں میں ان کی آواز کی قدر کی جاتی تھی اور اپنی زندگی کے آخری ایام تک وہ مسلمانوں کی خاموش خدمت کرتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں ان کا بمقام حیدرآباد انتقال ہوا۔

۲۴

مولانا مظہر علی کامل کا دورِ صدارت

مولانا مظہر علی کامل ایک عالم باعمل کی حیثیت سے مسلمانانِ دکن میں ایک ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ دارالقضا بلدہ کے کامیاب ایڈوکیٹ، مجالس سیرت کے ولولہ انگیز مقرر اور اخلاق و کردار کا ایسا نمونہ کہ جنھیں دیکھکر قرنِ اول کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ مجلس کے احیاءِ جدید سے وہ اس کی عاملہ کے رکن اور بہادر یار جنگ کے رفیق خاص اور معتمد علیہ تھے۔ مولانا کے دل میں نہ کبھی عہدہ کی تمنا پیدا ہوئی اور نہ اقتدار کی ہوس۔ وہ ہمیشہ ان چیزوں سے دور بھاگتے تھے لیکن تضاد قدر نے ان کے لئے مجلس کی صدارت مقدر کردی تھی۔

قرار داد مصالحت نے مجلس کے اندر ایک طوفان بدتمیزی پیدا کردیا تھا اور ارکانِ مجلس افتراق و انشقاق میں مبتلا ہوکر ایسے دو کیمپوں میں منقسم ہوچکے تھے کہ مجلس اور مسلمانوں کا مستقبل تاریک ہوگیا تھا۔ ارکانِ شوریٰ میں بجز مولانا کے کوئی بھی شخصیت ایسی نہیں تھی جو اس نفاق و اختلاف کو مٹا سکے۔ علاوہ ازیں اس قرارداد کی ہڑبونگ کے زمانہ میں مولانا علیل اور صاحبِ فراش تھے، ویسے بھی بلحاظ کردار و عمل مولانا کسی جماعت بندی کی تائید میں نہ تھے۔ اپنے بسترِ علالت پر صدارت کی امیدواری کے لئے مولانا محض اس وجہ سے آمادہ ہوئے کہ انھوں نے اچھی طرح محسوس کرلیا تھا کہ اگر وہ آگے نہیں بڑھتے تو مجلس کی تنظیم پارہ پارہ ہوکر رہ جائے گی۔ مولانا کی آمادگی کے

بعد توقع تھی کہ ابوالحسن سید علی کی جماعت عہدۂ صدارت کو مابہ النزاع نہیں بنائے گی اور مولانا مظہر باتفاق آرا صدر منتخب ہو جائیں گے۔ لیکن ابوالحسن سید علی کی جماعت اس کے لیے تیار نہ ہوئی۔ استعفیٰ کے بعد ابوالحسن سید علی پس پردہ ہو چکے تھے اور قرارداد مصالحت کے محرک قاسم رضوی ان کی جانشینی کا فرض انجام دے رہے تھے۔ مجلس کے کارکنوں اور حیدرآباد کے اہل الرائے دونوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب پہلی مرتبہ مجلس اتحاد المسلمین کی صدارت کی امیدواری پر قاسم رضوی کے نام کا اعلان ہوا۔ بہرکیف مجلس کے دستور کے لحاظ سے انتخابات کا انعقاد کیا گیا اور مولانا مظہر علی کامل بغلبۂ آرا مجلس اتحاد المسلمین کے صدر منتخب ہو گئے۔ دونوں امیدواروں کو جو ووٹ ملے اس سے یہ اندازہ ہو گیا کہ ابوالحسن سید علی کی تائید میں ارکان شوریٰ کی ایک معتدبہ تعداد ہے جس نے قاسم رضوی کو ووٹ دے کر ابوالحسن سید علی کی حمایت کی تھی۔

مولانا کے صدارتی انتخاب کے بعد ابوالحسن سید علی کی جماعت کا یہ اخلاقی فرض تھا کہ وہ اختلاف کو بالائے طاق رکھکر مجلس میں استحکام اور مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا کرتی خصوصاً جبکہ مولانا نے انتہائی فراخدلی سے اپنی عاملہ میں قاسم رضوی اور ان کے چند ساتھیوں کو بھی جگہ دی تھی۔ جو جماعت انتشار کی پیداوار ہو اور جس کے نزدیک مجلس اور مسلمانوں کی خدمت سے زیادہ مقدس کام ابوالحسن سید علی کا انتقام لینا ہو بھلا وہ کس طرح مفاہمت کے لئے تیار ہو سکتی تھی؟ چنانچہ اس شکست کے بعد قاسم رضوی کے آئندہ انتخاب میں کامیابی حاصل کرنے تک سال ڈیڑھ سال کی پوری مدت ابوالحسن سید علی کی جماعت نے قاسم رضوی کی سرکردگی میں مولانا مظہر اور ان کے ساتھیوں پر کیچڑ اچھال کر اپنی جماعتی استحکام کو مضبوط کرنے میں صرف کیا۔ اضلاع کے ارکان میں یہ جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ مرکزی مجلس کی صدارت شہر حیدرآباد کے ارکان کا اجارہ نہیں ہے اور اضلاع کے ارکان میں بھی صلاحیت اور اہلیت کے جوہر

موجود ہیں۔ اس جماعت کو ایک باقاعدہ حزب اختلاف کی صورت دے کر شوریٰ کے ہر اجلاس میں عاملہ کی قراردادوں کے تار و پود بکھیرنے اور عاملہ کے فیصلوں کو چیلنج کر کے اپنے جماعتی عدم تعاون کا اظہار کرنے کی ہمیشہ کوشش کی جاتی رہی۔ چونکہ اخبارات اس جماعت کو منہ نہیں لگاتے تھے اس لئے پمفلٹ بازی شروع کی گئی اور چھوٹے بے اثر اخبارات کو ابوالحسن سید علی کی دولت سے خریدا جانے لگا۔ حد ہوگئی کہ قائد اعظم کی آمد کے موقع پر اس جماعت نے مجلس کے مقابلہ میں ایک علیٰحدہ مجلس استقبالیہ ترتیب دی اور مرزا اسمٰعیل کے صدارتِ عظمیٰ پر لائے جانے کے لئے ایک پمفلٹ شائع کیا۔ یہ ساری چیزیں ابوالحسن سید علی کے ایما اور سرپرستی ہی میں انجام پا رہی تھیں۔ قائد اعظم کی تشریف آوری پر اس جماعت نے ابوالحسن سید علی کی قیادت میں برسرِ اقتدار جماعت کے خلاف شکایات کا ایک طومار پیش کیا لیکن قائد اعظم نے اس جماعت کی علیٰحدہ پسند پالیسی کی سخت مذمت کرتے ہوئے انھیں عاملہ کے فیصلوں پر غیر مشروط طور پر سرِ تسلیم خم کرنے کی تاکید فرمائی۔ اس کے بعد اس جماعت کے طرزِ عمل میں کچھ تبدیلی پیدا ہوئی لیکن دلوں کا چور باقی رہا۔

مولانا کے دورِ صدارت میں شاہ منزل کا حادثہ بڑے دوررس نتائج کا حامل ہے کہ کس طرح مجلس نے اپنے ایک مطالبہ کو منوانے کے لئے وزیر اعظم کی کوٹھی شاہ منزل کو جو ان کی سرکاری رہائش گاہ تھی آگ لگا کر نہ صرف حکومت کی اس اعلیٰ ترین شخصیت کو بے آبرو کیا بلکہ انگریز رکن باب حکومت مسٹر گرگسن کے بنگلہ کو بھی جلا کر خاکستر کر دیا۔ اس کے واقعات یہ ہیں کہ ضلع نظام آباد کے موضع ڈچپلی میں عیسائی مشنریوں کا ایک جذامیوں کا دواخانہ تھا جس کے کپونڈ کے ایک حصہ میں مسلمان مریض ایک چبوترہ بنا کر اس پر نماز پڑھنے لگے تھے۔ بعد میں اس پر چھپر ڈال کر مسجد کی صورت دے دی گئی تھی۔ ارباب مشن کو جب اس کا علم ہوا تو انھوں نے اس کو منہدم کرا دیا۔

جب یہ واقعہ اخبار میں شائع ہوا تو مسلمان ناراض ہو گئے۔ مجلس کے ایک وفد نے موقع کا معائنہ کر کے حکومت سے مسجد کی بحالی کا مطالبہ کیا۔ عیسائی مشن کو انگریز صدر المہام کی پشت پناہی حاصل تھی۔ نواب چھتاری اور ارباب حکومت کے دیگر ارکان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ انگریز صدر المہام پر زور ڈالتے۔ معاملہ لیت و لعل میں پڑ تا گیا۔ ادھر مسلمانوں میں اشتعال بڑھتا گیا تا اینکہ زمرد محل تھیٹر میں حکومت کی نرم اور کمزور پالیسی کے خلاف بیزارگی کے اظہار کے لئے ایک جلسہ عام طلب کیا گیا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ابوالحسن سید علی کی جماعت نے مسجد کے اس مسئلہ سے بالکلیہ علیحدگی اختیار کی تھی لیکن جلسۂ عام کے اعلان کے ساتھ ہی وہ نہ صرف متحرک ہو گئی بلکہ عملاً جلوسوں اور جلسوں میں حصہ لینے لگی۔ مقررہ تاریخ پر جب جلسہ عام کی کارروائی شروع ہوئی اور گرما گرم تقاریر ہونے لگیں تو عین اس موقع پر ارباب حکومت سے ایک ٹیلیفون وصول ہوا کہ صدر اعظم چند سرکردہ مسلمانوں سے گفتگو کر کے اس مسئلہ کی یکسوئی کرنا چاہتے ہیں چنانچہ اجلاس کو جاری رکھکر عبدالرحمٰن رئیس مدیر وقت، محمود علی الہاشمی، مولانا افتخاری اور راقم الحروف ایک وفد کی صورت میں شاہ منزل روانہ ہوئے اور مجمع "شاہ منزل چلو" کے نعروں کے ساتھ منتشر ہو گیا۔ اس اثناء میں وفد نے مسلمانوں کی ساری شرائط حکومت سے منوالی تھیں اور وہ واپس ہونے والا ہی تھا کہ مجمع شاہ منزل کے کمپونڈ میں گھس کر تخریبی کارروائیوں میں مبتلا ہو گیا۔ ایک ایک رکن وفد نے منت کی کہ حسب دلخواہ تصفیہ ہو گیا ہے لیکن ان کو ماننے والا کون تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کونسل ہال اور شاہ منزل کو نذر آتش کر دیا گیا، صدر اعظم کی بے حرمتی کی گئی اور مسٹر گرگسن کے بنگلہ کو آگ لگائی گئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ایک سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے تحت تاخت و تاراجی کا منصوبہ تکمیل پایا اور جاہل عوام چند ناعاقبت اندیشوں کا آلۂ کار بن گئے۔ دوسرے روز اخبارات میں ابوالحسن سید علی اور قاسم رضوی

ان واقعات کی مذمت میں پیش پیش تھے۔ اس واقعہ نے جہاں مجلس کے بعض مخلص کارکنوں کو دار و گیر میں مبتلا کر کے جیلوں میں نظر بند کرایا وہاں مخالف جماعت کو اپنی انتخابی مہم کو کامیاب بنانے کے لئے ایک اچھا حربہ عطا کیا جس کے لئے اس نے یہ سارا کھیل کھیلا تھا۔

مولانا کے زمانہ میں برطانوی کابینی مشن کی آمد کی وجہ سے ہندوستان کے آئینی مستقبل کی گتھیاں سلجھ کر پاکستان کے قیام کے امکانات روشن ہو گئے تھے۔ مولانا کی سرکردگی میں مجلس کا ایک وفد قائد اعظم اور مسلم لیگی زعماء سے تبادلۂ خیالات کے لئے دہلی گیا۔ حیدرآباد اور ریاستوں کے متعلق امید و بیم کی کیفیت طاری تھی۔ نواب چھتاری شاہ منزل کے واقعہ کے بعد حضور نظام کی نظروں سے اتر چکے تھے اور ویسے خود بھی اپنے عہدہ سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے اس لئے حیدرآباد میں ایک جدید صدر اعظم کی تلاش شروع ہو گئی تھی اور درباری سازشوں کی وجہ سے سر مرزا کے تقرر کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ قائد اعظم سر مرزا کی کانگریسی ذہنیت کی وجہ سے اس تقرر کے مخالف تھے۔ چنانچہ اپنے نقطۂ نظر کو نظام پر واضح کرنے کے لئے ایک سابقہ دعوت کی بنا پر وہ حیدرآباد سرکاری مہمان کی حیثیت سے تشریف لائے۔ اس کے قبل بھی قائد اعظم پیشہ ورانہ اور قائدانہ حیثیت سے حیدرآباد آتے رہے لیکن اس مرتبہ ان کی مورد بانی پاکستان کی حیثیت سے تھی۔ عظمت و مرتبت میں وہ نظام سے کہیں بلند تھے۔ برصغیر کے سارے مسلمانوں کے قلوب پر ان کی حکومت قائم تھی۔ لیکن نظام اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ سر مرزا ہی ان کے اقتدار اور ان کے خاندان کی بقا کا وسیلہ ہو سکتے ہیں۔ دربار بھی اسی خیال کو ہوا دے رہا تھا۔ اسی کی سازشوں سے قائد اعظم اور نظام کی ملاقات ناکام ہو گئی۔ قائد اعظم کے دوران ملاقات سگریٹ یا سگار پینے کو گفتگو کے ٹوٹنے کا سبب بتایا گیا لیکن یہ بات نہ قرین قیاس ہو سکتی ہے اور نہ قابل قبول۔ نظام

کی کشیدگی کا سبب اگر کچھ ہوسکتا تھا تو یہ تھا کہ سر مرزا کے خلاف نظام کچھ سننے آمادہ نہ تھے

نواب چھتاری کی مراجعت اور سر مرزا کے تقرر کے درمیانی وقفہ میں سر عقیل جنگ کے ہاتھ میں عارضی طور پر زمام صدارت عظمیٰ رہی۔ اسی زمانہ میں حکومت نے اصلاحات کو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا جس کو مسلمانوں نے قائد اعظم کے مشورہ کی بنا پر قبول کرلیا تھا۔ اسکیم اصلاحات پر اس کتاب میں علٰحدہ بحث کی گئی ہے۔

سر مرزا کا تقرر اگست ۱۹۴۶ء میں ہوا جس کے قبل ہی اعلیٰ حضرت نے ۱۱ جون ۱۹۴۷ء کو حیدرآباد کی آزادی کا اعلان ایک فرمان کے ذریعہ کردیا تھا جس سے بظاہر سر مرزا متفق نہیں تھے۔ اس لئے انھوں نے اس فرمان کی نفی میں ہندو نوازی کے دوسرے طریقے اختیار کئے۔ جدید اصلاحات کے تحت مقننہ کے انتخابات کا انعقاد عمل میں آیا اور حکومت کی جانب سے مقننہ کی افتتاح کی تیاریاں ہونے لگیں۔

مولانا مظہر علی کا دور صدارت اختتام کی آخری منزلوں سے گذر رہا تھا تاہم مولانا اور ان کی عاملہ نے جدید صدر اعظم کی ہندو نواز پالسیوں کو بے نقاب کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں رکھا۔ بجز شاہ منزل کے ناخوشگوار واقعہ کے مولانا کا دورِ صدارت بہادر یار جنگ کے زمانہ کی روایات کا بڑی حد تک حامل رہا۔ ہندو مسلم تعلقات میں بھی کوئی ایسا فرق پیدا نہیں ہوا۔ گو مولانا مظہر علی میں بہادر یار جنگ کی قائدانہ اور اجتہادانہ شان نہ تھی لیکن وہ کوئی چیز عاملہ کی مرضی کے بغیر نہیں کرتے تھے۔ مولانا کی اس جمہوری طرز اور اعتدال پسندی سے اصحاب خمسہ فائدہ اٹھاتے تھے۔ مولانا کی شرافت اور بے نفسی حزب اختلاف کے رکیک حرکات اور خود اپنی عاملہ کے اندر اصحاب خمسہ کی ہوس پرستی کو برداشت نہیں کرسکتی تھی ورنہ اگر ایک سال اور وہ صدارت پر

رہنا گوارا کر لیتے تو ممکن تھا کہ دکن کی تاریخ کا کوئی اور ہی باب لکھا جاتا لیکن مشیت کو کچھ اور منظور تھا۔ ہر کام کی نوعیت کے لحاظ سے قدرت اشخاص کا انتخاب کرتی ہے۔

۲۵
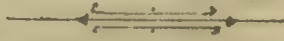
قاسم رضوی کا دورِ صدارت

مولانا مظہر علی کامل کی صدارت سے سبکدوش ہونے کے بعد مجلس کے اندر
اقتدار کی ایسی جنگ شروع ہوئی جس نے نہ صرف مجلس کی اینٹ سے اینٹ
بجا دی بلکہ جس نے دکن میں مسلمانوں کے اقتدار کا جنازہ بھی نکال دیا۔ مولانا کے بعد
مجلس کے اندر ایک بھی ایسی شخصیت باقی نہیں تھی جس کی سرکردگی میں مجلس کے
اندرونی اختلافات کو مٹایا جا سکتا۔ مجلس دو گروہ میں منقسم ہو چکی تھی۔ ایک
ابو الحسن سید علی کے موئیدین تھے اور دوسرے ان کے مخالفین۔ مؤخر الذکر میں
مجلس کے بہترین دماغ تھے جنھیں نہ صرف بہادر یار جنگ کی رفاقت حاصل تھی
بلکہ جو ابتداء سے مجلس کی پالسیوں کو کنٹرول کر رہے تھے۔ لیکن بدبختی یہ تھی کہ اصحابِ
خمسہ کی خود غرضیوں کی وجہ سے یہ جماعت بھی آپس میں منقسم تھی اور اصحابِ
خمسہ یہ سمجھتے تھے کہ صدارت کے اب وہی مستحق ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ضلع بیڑ
کے صدر مجلس انیس الدین احمد کو اپنا امیدوار نامزد کیا۔ جو لوگ ابو الحسن سید علی
کی مخالفت کے باوجود اصحاب خمسہ سے اختلاف رکھتے تھے ان کے امیدوار
عبد الرحمٰن رئیس مدیر روزنامۂ وقت تھے۔ ابو الحسن سید علی کے گروپ کے نمائندہ
قاسم رضوی تھے۔ ان تینوں امیدواران صدارت کی صلاحیتوں کا تجزیہ کیا جائے
تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیس الدین احمد سب میں سنجیدہ اور بردبار تھے۔ رئیس میں
سیاسی انداز فکر سب سے زیادہ تھا لیکن ساتھ ہی ان کی خود رائی بے اصولی اور

انتہا پسندی ان کی راہ میں حائل تھی۔ قاسم رضوی محض ایک جذباتی انسان تھے البتہ انتخابات
میں کامیابی کا گر انھیں خوب یاد تھا جس کی ابتدائی مشقیں علیگڈھ کے زمانۂ طالب علمی میں
انھوں نے حاصل کی تھی اگر تکونہ مقابلہ نہ ہوتا اور رضوی کو کسی ایک مد مقابل سے سابقہ
پڑتا تو انھیں کبھی کامیابی حاصل نہ ہوتی لیکن ان کی انتخابی فرزانگی کی وجہ سے آخر
وقت تک میدان میں تین امیدوار ڈٹے رہے جس نے ان کے لئے کامیابی کی صورت
پیدا کردی۔

قاسم رضوی ضلع عثمان آباد کے ایک تعلقہ لاتور کے صدر تھے۔ یہ مقام ایک تجارتی
مرکز تھا اور شولاپور سے قریب ہونے کی وجہ سے یہاں کے ہندوؤں میں فرقہ واری
جراثیم زیادہ سرایت کئے ہوئے تھے۔ یہاں کی سیاست میں قاسم رضوی نے اپنا
ایک مقام پیدا کرلیا تھا۔ ابتداء سے یہ بڑے جوشیلے اور جذباتی تھے۔ ان کے اس
کردار کی وجہ سے خود لاتور میں مسلمانوں کی ایک جماعت ان کی مخالف ہوگئی تھی۔ اور
ایک مرتبہ بہادر یار جنگ نے لاتور کا دورہ کرکے دونوں جماعتوں میں مفاہمت بھی کرائی
تھی۔

یہ بھی مشہور تھا کہ لاتور کے بعض شوریدہ پشت مسلم عناصر کی قاسم رضوی سرپرستی کرتے
تھے اور ایک کامیاب فوجداری وکیل کی حیثیت سے وہ مسلمان ملزموں کو ندامت سے
بری کرالیتے تھے اس لئے ضلع کے عہدہ داروں میں بھی وہ مقبول نہیں تھے۔ بہادر یار جنگ
کی زندگی کے آخری دنوں میں حادثۂ لاتور وقوع پذیر ہوا جس میں پولیس کی فائرنگ سے
سات مسلمان شہید ہوگئے جن کا قاسم رضوی کی جماعت سے تعلق بیان کیا جاتا ہے۔ اتفاق
سے واقعہ کے روز قاسم رضوی لاتور سے باہر تھے۔ اتحاد المسلمین کے مطالبہ پر حکومت
نے اس واقعہ کی تحقیقات کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا تھا جس کے ممبر [illegible] اور
آر سود آینگار اور عبدالحمید خان ارکان تھے کمیشن کی یہ رپورٹ حکومت نے شائع نہیں کی

نہ ہوتی۔ قرار داد مصالحت جہاں ابوالحسن سید علی کی سیاسی زندگی کے لئے پروانۂ موت ثابت ہوتی۔ وہاں قرار داد کے محرک (قاسم رضوی) کے لئے نوید حیات بن گئی۔ صدارت پر قاسم رضوی کا انتخاب دراصل ابوالحسن سید علی کی کامیابی تھی جس کے لئے انھوں نے تن من دھن سب ہی کی بازی لگا دی تھی۔ لیکن قرار داد مصالحت کی وجہ سے ابوالحسن سید علی اتنے بدنام ہو گئے تھے کہ قائدِ اعظم کے پاس بھی ان کا کوئی مقام باقی نہ تھا۔ اس قرار داد کے محرک کی حیثیت سے قاسم رضوی کی پیشانی پر بھی کلنک کا ٹیکہ لگا ہوا تھا جس کو وہ کسی طرح دور کرنا چاہتے تھے اور اس کی ایک ہی صورت تھی کہ ابوالحسن سید علی کی قیادت کے جوئے کو اتار پھینک دیں۔ قاسم رضوی نے بھی یہی کیا۔ جن تمناؤں اور آرزوؤں سے ابوالحسن سید علی قاسم رضوی کو صدارت پر لائے تھے وہ سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ ابوالحسن سید علی سے ٹوٹنے کے بعد قاسم رضوی کی خود پسندیوں پر کوئی تحدید باقی نہ رہی۔

قاسم رضوی کو اچھی طرح اس امر کا احساس تھا کہ مجلس کے اندرونی خلفشار، انتخابی ہتھکنڈوں اور ابوالحسن سید علی کی تائید نے انھیں صدارت پر فائز تو کر دیا لیکن اس کا نبھانا مشکل ہے کیونکہ ان کے ساتھ جو ارکانِ شوریٰ تھے ان میں سیاسی مسائل کو سمجھنے کی پوری صلاحیت نہ تھی۔ مجلس کے سارے قدیم کارکن ان سے بدظن اور ان کے مخالف تھے۔ البتہ نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت ان کے ساتھ ہو گئی تھی جنھیں یہ باور کرایا گیا تھا کہ مجلس کے سارے قدیم خادم بڑے کاہل، بے عمل، موقع پرست اور ملک کے دشمن ہیں۔ قاسم رضوی نے قدیم کارکنوں کو ان کے عہدوں سے ہٹانے کے لئے تطہیر مجلس کی ایک اسکیم نافذ کی جس کی رو سے مجلس کے ہر وارڈ اور ضلع میں انتخابات مرکزی مجلس کی نگرانی میں منعقد ہونے لگے۔ یہ نگرانکار صدر کی جماعت کے ایسے ارکان ہوتے تھے جو تطہیر کے مقصد سے آگاہ تھے۔ اس اسکیم نے مجلس کے اندر ہنگامہ و فساد کی صورتیں پیدا کر دیں۔ ہر ضلع میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے گروپ بندیاں شروع ہوئیں اور

مسلمان آپس میں بٹتے گئے۔ گو یہ اسکیم پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی لیکن اس سے مجلس
کے اندر ایسے نوجوان ضرور داخل ہو گئے جو قاسم رضوی کو ملک کا نجات دہندہ اور اپنا
ہیرو سمجھنے لگے تھے۔ ساتھ ہی اس اسکیم نے مجلس کے بعض قدیم کارکنوں کو جن کے فکر و
دانش کی ایسے ہنگامہ خیز زمانہ میں شدید ضرورت تھی، ان کے مقامات سے ہٹا دیا
مثال کے طور پر مجلس کے آخری سال پارلیمانی بورڈ کے سابق معتمد احمد عبداللہ المسدوسی
کسی وارڈ سے رکن شوریٰ منتخب نہ ہو سکے ہر انتخاب کے بعد مجلس شوریٰ کو اپنے پہلے
اجلاس میں پانچ ارکان شوریٰ نامزد کرنے کا اختیار حاصل تھا تاکہ ایسے اہل الرائے
لوگ جو کسی وجہ سے منتخب ہونے سے رہ گئے ہوں یا جنہوں نے انتخاب میں حصہ نہ لیا
ہو مجلس شوریٰ کے رکن بن سکیں۔ شوریٰ کی اکثریت عبداللہ المسدوسی کی نامزدگی
پر مائل تھی لیکن چونکہ پانچ سے زائد نام پیش ہوئے تھے اور رائے شماری کی نوبت
آ گئی تھی اس لئے اکرام اللہ کی تحریک پر شوریٰ نے اپنا اختیار نامزدگی صدر کو سونپ
دیا۔ ارکانِ شوریٰ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جبکہ صدر نے شوریٰ کے اعتماد کو بری طرح
ٹھیس پہنچائی۔ نام کی مماثلت سے ایک ایسے نیم تعلیم یافتہ رکن کو نامزد کیا گیا جس کی
جوتوں کی دکان تھی۔ ستم ظریفی یہ کی گئی کہ نام کے پہلے جزو کا اس طرح اعلان کیا جیسے
شوریٰ کی تمناؤں کو پورا کیا جا رہا ہے لیکن جب نام کے دوسرے جزو "المسدوسی" کا اعلان
نہیں ہوا تو شوریٰ پر اوس سی پڑ گئی۔ مجلس کے صدر کا اپنے مخالفین کے ساتھ یہ عمل تھا۔
تطہیر کے باوجود صدر مجلس کو اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں اخبارات اور پلیٹ فارم
پر ان کی مخالفت میں آواز نہ بلند ہو اس کے لئے انھوں نے یہ پابندی لگا دی کہ مملکتی
مجلس کی قبل از قبل منظوری کے بغیر کسی رکن مجلس اتحاد المسلمین کا کوئی بیان یا مضمون
کسی اخبار میں شائع نہیں ہو سکتا اور نہ کسی جلسہ میں تقریر کرنے کی کسی کو اجازت ہوگی۔
آزادیٔ تحریر و تقریر کو سلب کر کے صدر نے اپنی مخالفت میں اُٹھنے والی ہر آواز کو

نے ان دونوں میں عارضی صلح کرادی۔

دستور کے لحاظ سے صدر کو اپنی عاملہ یا ورکنگ کمیٹی نامزد کرنے کا اختیار تھا۔ چنانچہ قاسم رضوی نے اپنی عاملہ میں ایسے ناتجربہ کار لوگوں کو نامزد کیا جنھیں نہ مسائل سے کبھی تعلق تھا اور نہ جن کی زبان شوریٰ کے کسی اجلاس میں کھلی تھی۔ مجلس کے قدیم کارکن جو برسوں سے عاملہ میں رہ کر مجلس کی پالیسیوں کی تشکیل میں حصہ لیتے رہے انھیں عمداً عاملہ سے باہر رکھا گیا تھا اور جگہ دی گئی بھی تو بعض ایسے ارکان کو جو سیاسیات کی ابجد سے بھی واقف نہ تھے۔ چند ایک قدیم ارکان بھی ساتھ تھے جن کے پیش نظر وزارت کی کرسیاں تھیں اور جن کی غرض وہ صدر کی ہر بے راہ روی کو برداشت کرنے تیار تھے۔

حیدرآباد کی سیاست انتہائی سرعت سے اس نقطۂ عروج پر پہنچ رہی تھی جس کے بعد دو بڑے ہی قدم پر دولت کی کھائی تھی۔ اس لئے مجلس کے صدر کی اہمیت بھی فرمانروائے ملک کی قوت و اقتدار سے کسی طرح کم نہ تھی۔ ان کے چشم و ابرو کے اشاروں پر وزارتیں، نئی عہدے اور خدمات کی تقسیم شروع ہو گئی تھی۔ اعلیٰ عہدہ دار شاہ منزل کو چھوڑ کر دارالسلام کا طواف کرنے لگے تھے۔ ملک کے حالات کا اقتضا بھی یہی تھا کہ مجلس کے صدر کو زیادہ سے زیادہ طاقت بہم پہنچائی جاتی۔ مجلس عاملہ میں ایک بھی رکن آزادی سے رائے ظاہر کرنے والا موجود نہ تھا۔ کچھ وزارتوں کے امید وار تھے اور کچھ ایسے نو وارد جنھیں پہلی مرتبہ عاملہ میں جگہ ملی تھی اور جو سیاست کے نشیب و فراز کو سمجھنے کی قطعاً اہلیت نہ رکھتے تھے۔

قاسم رضوی کے اطراف موقع پرستوں کا ہجوم تھا جو تند مزاجوں کی بدخوئی کی سرکشی صدر کا قرب حاصل کرتے جاتے تھے۔ قاسم رضوی میں ان خوشامدیوں کو پہچاننے کی صلاحیت

نہ تھی۔ ان میں نہ معلوم کتنے ہندوستانی ایجنٹ جنرل کے جاسوس تھے کیونکہ یہ منشی

نے اپنی کتاب[۱] میں شاستری نامی ایک ہندو صحافی کو غیر معمولی خراج تحسین پیش کیا ہے کہ کس طرح اتحاد المسلمین کے کیمپ میں رہ کر اور قاسم رضوی کا تقرب حاصل کر کے مجلس کی کارروائیوں کو ایجنٹ جنرل تک پہنچاتا تھا۔ مدہو گئی کہ اس شخص کو ہندو یونین کا مخالف سمجھ کر خطیر رقومات حکومت کے پروپیگنڈے فنڈ سے دلائی گئی ہیں بات یہ تھی کہ شاستری ایک انگریزی ہفتہ وار "رین لو" کا ایڈیٹر تھا۔ یہ پرچہ بڑی قلیل تعداد میں سکندرآباد میں چھپ کر صرف دارالسّلام اور حکومت کے محکمہ اطلاعات میں تقسیم ہوتا تھا۔

قاسم رضوی کو مفاد پرستوں اور خوشامدیوں نے اتنا چڑھا دیا تھا کہ کوئی انھیں ان کے منہ پر حضرت عمر فاروق سے تشبیہ دیتا تھا اور کوئی انھیں "جنوبی پاکستان" کا قائد اعظم ثانی سمجھتا تھا۔ خود قاسم رضوی اپنے آپ کو والئی ملک سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے اور حقیقت بھی یہ تھی کہ وزارت گری جو ایک شاہی اختیار ہے کنگ کوٹھی سے نکل کر دارالسّلام منتقل ہو چکی تھی۔

رضاکار تنظیم ابتداء سے مجلس کا جزو لاینفک رہی لیکن یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس میں عسکریت کی روح قاسم رضوی نے پھونکی۔ ملک کے حالات کا اقتضا یہی تھا، اور آزادی کے عزم کے بعد تو مسلمانوں میں ایثار اور قربانی کا جذبہ اتنا بیدار ہو گیا تھا، کہ نوجوان تو کجا بوڑھے، بچے اور عورتیں تک شمع آزادی پر پروانہ وار فدا تھیں۔ قاسم رضوی نے اس تنظیم کو ایک خود مختار ادارہ بنا کر عام مجلس سے علٰحدہ کر دیا لیکن اس کی باگ ڈور ایسے ہاتھوں میں دی جو شخصیت اور کردار کے اعتبار سے اس بارِ گراں کو اُٹھانے کے قابل نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تنظیم پر مرکز کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اور تنظیم میں غنڈہ عناصر کو شامل ہونے کا موقع مل گیا جس نے رضاکار کے نام سے

---

[۱] The End of an Era

دہ اودھم مچائی کہ انڈیا یونین نے اس بہانہ سے حیدرآباد پر حملہ کا جواز تلاش کیا۔

حیدرآباد کی ایک ذیلی مجلس نے قاسم رضوی کو "فیلڈ مارشل" کا خطاب دے کر ان کی عسکری صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔ اس کے بعد قاسم رضوی کی زندگی بالکل فوجی انداز کی ہوگئی۔ خلوت و جلوت میں ہر جگہ ان کے پیچھے فوجی لباس میں ایک اے ڈی سی رہنے لگا۔ اس کے علاوہ فیلڈ مارشل کی حفاظت کے لئے ایک باڈی گارڈ کی بھی تشکیل ضروری ہوگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ پوری رضاکارانہ تنظیم میں یہ دستہ فوجی نظم ونسق، یونیفارم، اسلحہ اور وجاہت کے اعتبار سے ایک مثالی اہمیت کا حامل تھا۔ ہر دورہ اور پبلک اجتماع میں یہ صدر کے ہمرکاب رہتا تھا۔ نجی اوقات میں یہی دستہ صدر سے خوش گپیوں میں مصروف رہتا اور ان کے لئے دل جوئی کے سامان بہم پہنچاتا تھا تاکہ قومی خدمات میں انہماک کی وجہ سے ان کے اعصاب کے بار کو ہلکا کیا جاسکے۔ ایک اور جدت جو پیدا کی گئی یہ تھی کہ ایک باوردی اسٹنو صدر کے ساتھ تعینات کیا گیا جو صدر کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور تقریر کو شارٹ ہینڈ میں نوٹ کرلیتا تھا تاکہ بعد میں صدر کے فرمودات میں افراط و تفریط کا شائبہ باقی نہ رہے۔ چنانچہ ان ہی یادداشتوں سے اخبارات کو بیانات اور تقاریر کے نوٹ روانہ کئے جاتے تھے۔

بہادر یار جنگ نے اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں ایک پرائیویٹ سکریٹری کو مامور کیا تھا جس کی ان کے دو جانشینوں نے ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ قاسم رضوی کے پوزیشن کے لئے پرائیویٹ سکریٹری ناگزیر تھا۔ اس پر انھوں نے اپنے اعتماد کے ایک ایسے شخص کو مامور کیا جو لاتور کے ایک مڈل اسکول کا سابق ڈرائنگ ماسٹر تھا۔ اس پرائیویٹ سکریٹری کے تفویض اضلاع اور بلدہ کی مجالس کو اسلحہ سپلائی کرنے کا بھی کام دیا گیا تھا۔ معمولی سی معمولی بھرمار بندوق

اور ریوالور بغیر قیمت کے فروخت نہیں ہوتی تھی اور اچھے ساخت کے ہتیار دو دو تین تین ہزار میں فروخت ہوتے تھے حالانکہ حکومت نے پولس کی مزل لوڈ بندوقوں کی ایک بڑی تعداد سرحدی اضلاع کے رضاکاروں کو مسلح کرنے کے لئے مجلس کو مفت دی تھی۔ مجلس کے فنڈ سے اسلحہ کی خرید و فروخت کے حسابات کا کوئی تعلق نہ تھا۔ پرائیویٹ سکریٹری صرف صدر کے سامنے ذمہ دار تھا۔ آج تک کسی کو علم نہیں کہ اس مد میں کتنی رقم جمع ہوئی تھی اور وہ کیا ہوئی؟

قاسم رضوی ابتداء سے ایک جذباتی انسان تھے، وہ ایک اچھے مقرر ضرور تھے لیکن الفاظ پر انھیں قابو نہ تھا۔ ان کی جذبات انگیز تقریریں اور بیانات نے انڈیا یونین کے جذبۂ انتقام کو تیز تر کر دیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو خلیج تھی وہ وسیع سے وسیع تر ہوگئی۔ ہندوستان کی طاقت و قوت اور حیدرآباد کی فوجی بے بضاعتی کا انھیں بخوبی علم تھا۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انڈیا یونین کی فوج کو بزدل قرار دیا۔ یہ کہا کہ اس نے چوڑیاں پہن لی ہیں اور حیدرآباد پر حملہ کرنے کی اس میں ہمت نہیں ہے۔ ایسے الفاظ ہیں جو اتحادالمسلمین جیسی وقیع جماعت کے صدر کی زبان سے ادا نہ ہونا چاہیئے تھا۔ یہ ان کے لئے شایانِ شان نہ تھے۔ قاسم رضوی کو قطعاً اس امر کا احساس نہ تھا کہ ان کی لایعنی، بے تکی اور اشتعال انگیز باتوں کا انڈیا یونین پر جس کی حربی قوت حیدرآباد سے کئی گنا زیادہ تھی اور ہندوؤں پر جو مسلمانوں سے تعداد میں سات گنا زیادہ تھے، کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ نہ صرف صدر بلکہ ان کے حواریین کی زبانیں بھی اسی طرح بے لگام تھیں اور وہ انڈیا یونین کے خلاف دشنام طرازی سے باز نہ آتے تھے۔ ان سب کا کچھ نہ بگڑا لیکن جب انتقام کا وقت آیا تو حیدرآباد

کی آزادی کے ساتھ مسلم تہذیب وثقافت، عفت وعصمت، امارت و
دولت، ہر چیز اُجڑ کر رہ گئی اور لاکھوں معصوم زندگیاں اور خاندان تباہ
ہوگئے۔

مجلس کے اندر حزب اختلاف کے اُبھرنے کے سارے امکانات کو
ختم کرنے اور رضاکارانہ تنظیم کو پوری قوت سے پروان چڑھانے کے بعد
صدر کی پوری صلاحیتیں وزارت گری اور انڈیا یونین سے گفت وشنید
کے مسائل پر مرکوز ہوگئیں۔ اس میدان میں صدر نے جو گل کھلائے اُن کی
تفصیلات گذر چکی ہیں۔

اپنی ساری کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود قاسم رضوی کے پہلو میں ایک
تڑپتا ہوا دل اور مسلمانوں کی خدمت کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا لیکن ان کی
انتہا پسندی نے انہیں نتائج و عواقب سے بے بہرہ کر دیا تھا۔ ان کا حاشیہ غلط اور
ان کے اطراف چھوٹے اور کم فہم لوگ جمع تھے۔ ان کے اعمال و افعال پر پابندی
عائد کرنے والا ایک بھی ان کے قریب نہ تھا۔ لوگوں کی بیجا تعریف اور خوشامد
نے ان کے اندر عجیب نرگسیت پیدا کر دی تھی۔ اپنی عقل و دانش کو وہ عام سطح سے
بہت زیادہ بلند و برتر سمجھنے لگے تھے حالانکہ مجلس کے اندر انہوں نے کبھی اپنی فہم و
فراست کو اپنے ہمعصر ساتھیوں کے مقابلہ میں بہتر ثابت نہیں کیا تھا۔ ملکی مجلس
کی صدارت اور تعلقہ لاتور کی مجلس کی صدارت ان کے نزدیک برابر تھی۔ لاتور کے
تجربات کو انہوں نے مرکزی مجلس میں دہرا لیا۔ وہاں کا نقطۂ عروج حادثہ لاتور تھا اور
یہاں کا نام نہاد پولیس ایکشن جس نے حیدرآباد میں مسلم اقتدار کے سفینہ کو ہمیشہ کے
لئے قعر مذلت میں ڈبو دیا۔

۲۶

مجلسؔ کے وزراء

قائدِ اعظم کے مشورہ کی بناء پر مجلس اتحاد المسلمین نے اصلاحات میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیا جنھیں اینگار کمیٹی کی سفارشات کی بناء پر حکومت حیدر آباد نے ۱۹۳۸ء میں منظور کیا تھا اور جنھیں ۱۹۴۷ء میں نافذ کیا گیا[1] اس زمانہ میں مولانا مظہر علی کامل اتحاد المسلمین کے صدر تھے۔ مجلس عاملہ نے تین ارکان پر مشتمل ایک پارلیمانی بورڈ کی تشکیل دی تھی جس کے ذمہ مقننہ کی نشستوں پر امیدواروں کے انتخاب کا کام کیا گیا تھا اور یہ بھی شرط لگائی گئی تھی کہ ارکان بورڈ مقننہ کے انتخابات میں اس کی تحلیل تک حصّہ نہ لے سکیں گے۔ مجلس عاملہ میں اصحاب خمسہ کا گروپ کافی مؤثر تھا اور وزارتی کرسیوں پر ابتداء سے ان کی نظریں لگی ہوئی تھیں۔ اتحاد المسلمین سے ابوالحسن سیّد علی کے مستعفی ہونے کے بعد ان کی جماعت نے قاسم رضوی کو اپنا سرگروہ بناکر صدارتی انتخاب میں مولانا مظہر علی کامل کے مقابلہ میں حصہ لیا تھا اور شکست اُٹھانے کے بعد ان لوگوں نے مولانا مظہر سے کسی قسم کا تعاون نہیں کیا۔ مجلس عاملہ میں اس جماعت کے جن ارکان کو مولانا مظہر نے نامزد کیا تھا انھوں نے متفقہ طور پر عاملہ کا بائیکاٹ کیا۔ اتحاد المسلمین کی مجلس شوریٰ میں اس جماعت نے

---

[1] قائدِ اعظم سے اسکیم اصلاحات کے متعلق ہدایات حاصل کرنے اتحاد المسلمین کا ایک وفد بمبئی روانہ کیا گیا تھا جس میں مصنف کتاب ہذا بھی شریک تھے۔

حزب اختلاف کی حیثیت حاصل کر کے مولانا مظہر اور ان کی عاملہ کو ہمیشہ ہدف ملامت بنایا لیکن اسکیم اصلاحات کے نفاذ کے اعلان کے ساتھ ہی اس جماعت نے اپنے سارے اختلافات ختم کر دئے کیونکہ مولانا مظہر سے تعاون اور مجلس عاملہ میں شرکت کے بغیر مقننہ کی نشستوں سے اس کو ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ ابوالحسن سید علی کا اپنی جماعت پر ابھی اثر تھا اور ان کے مشورہ کی بنا، پر اس جماعت نے مولانا مظہر سے اشتراک کا فیصلہ کیا۔ مولانا کسی طرح مجلس کے سارے اندرونی اختلافات کو مٹا کر اصلاحات کی اسکیم کو کامیاب بنانا چاہتے تھے۔ یہ جانتے ہوئے کہ حزب اختلاف کی نیت صاف نہیں ہے مولانا مظہر نے اس جماعت کو سینہ سے لگایا۔ مولانا کے مفاہمانہ طرز عمل سے اس جماعت نے پورا فائدہ اٹھایا اور پارلیمانی بورڈ کی رکنیت پر اپنی جماعت کی نمائندگی کے لئے اصرار کیا۔ مولانا کسی طرح شر سے بچنا چاہتے تھے' انھوں نے اس شرط کو بھی قبول کر لیا۔ چنانچہ اصحاب خمسہ کے سرگرم رکن احمد عبداللہ المسدوسی پارلیمانی بورڈ کے معتمد اور حزب اختلاف سے اکرام اللہ رکن منتخب ہوئے۔ مولانا مظہر اتحاد المسلمین کے صدر کی حیثیت سے اس بورڈ کے بھی صدر تھے لیکن ان کی حیثیت پارلیمانی بورڈ میں صدر سے زیادہ ثالث کی تھی۔ انھیں نہ کسی مقننہ کی نشست کے امیدوار سے دلچسپی تھی اور نہ کسی جماعت کو زیادہ ٹکٹ دلا کر وہ مقننہ میں قوی کرنا چاہتے تھے۔ ارکانِ بورڈ کی ہر متفقہ تجویز کو وہ قبول کر لیتے تھے اور کوئی مابہ النزاع ٹکٹ ہو تو اس کو مفاہمانہ اسپرٹ میں تصفیہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ حیرت کی بات ہے کہ بجز ابوالحسن سید علی کے ٹکٹ کے بورڈ کے سارے تصفیہ متفقہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بورڈ کے دونوں ارکان نے جو دو مختلف گروہوں کے نمائندے تھے ٹکٹوں کی تقسیم کے معاملہ میں آپس

میں سمو اگر لیا تھا اور تجاویز متفقہ صورت میں مولانا کے سامنے پیش ہوتی تھیں۔ اگر کبھی مولانا مظہر نے اتحاد المسلمین کے کسی دیرینہ صفِ اول کے کارکن کے حقوق کو پامال ہوتا محسوس کیا تو دونوں ارکان اختلاف کا اندیشہ بتا کر مولانا مظہر کو خاموش کر دیتے تھے آپس کی اس گٹھ جوڑ کا یہ نتیجہ نکلا کہ مجلس کے بعض انتہائی مخلص اور قدیم آزمودہ کار خادم نظر انداز کر دئے گئے اور بورڈ کی جانب سے بعض ایسے لوگوں کو ٹکٹ دئے گئے جنھیں نہ پبلک لائف سے کبھی کوئی تعلق تھا اور نہ جنھوں نے کبھی مجلس کے اندر قدم رکھا تھا۔ یہ صرف اس منصوبہ کی پیش رفت میں کیا گیا کہ نو واردوں اور غیر مستحقین پر احسان دھر کر ایوان مقننہ میں اپنی اپنی جماعت کے لئے طاقت حاصل کی جائے۔ حد ہو گئی کہ ایک رکن نے بڑی عیاری سے اپنے ایک ہم زلف اور برادر نسبتی کو بھی ٹکٹ دلا دیا قائد اعظم نے پارلیمانی بورڈ کے فیصلوں کی اپیل کے لئے ایک اعلیٰ کمیٹی کے قیام کو نامنظور کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ کیا حیدرآباد میں پارلیمانی بورڈ کے لئے تین ایماندار آدمی نہیں مل سکتے؟ اور یہ تھا ہمارے ارکان کے ایمان کا معیار!

بورڈ کے ارکان میں ابو الحسن سید علی کے ٹکٹ پر اختلاف پیدا ہوا مولانا مظہر کی رائے فیصلہ کن اہمیت کی حامل تھی لیکن مولانا نے دور اندیشی سے کام لیکر دونوں ارکان کو قائد اعظم سے مشورہ کے لئے بمبئی روانہ کر دیا جہاں انھیں نفی میں جواب ملا مولانا نے جنھیں پہلے ہی سے قائد اعظم کے ذہن کا علم تھا بہت خوش اسلوبی سے اس ٹکٹ کے مسئلہ کو ختم کیا ورنہ اس کا تصفیہ حیدرآباد میں ہوتا تو معلوم نہیں اس پر کتنی ہنگامہ آرائی ہوتی۔

ابتدا میں لائق علی نے ٹکٹ کے لئے درخواست نہیں دی تھی لیکن ٹکٹوں کی تقسیم کا اعلان ہونے کے بعد انھیں مقننہ کا ٹکٹ دلانے کی کوشش کی گئی لیکن کوئی ٹکٹ خالی نہ تھا۔ پارلیمانی بورڈ کے معتمد نے ورنگل کے ایک رکن کو جو ان کے فرستادہ تھے

اپنے ٹکٹ سے دستبردار ہوکر لائق علی کو جگہ دلانے کی کوشش کی لیکن یہ رکن ٹکٹ کی واپسی کے لئے تیار نہ ہوئے۔ اس طرح دکن کے آخری وزیر اعظم کا مقننہ کی رکنیت پر انتخاب نہ ہو سکا۔

اتحاد المسلمین کی تنظیم کی یہ خوبی تھی کہ ٹکٹوں کی تقسیم میں ناانصافیوں کے باوجود کسی رکن کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ چند ایک مسلم نشستوں کے لئے مقابلے ہوئے۔ شہر حیدرآباد کی ایک نشست کے لئے عبدالواحد اویسی ایڈوکیٹ (جن کو قاسم رضوی نے اپنے جیل سے رہا ہونے کے بعد اتحاد المسلمین کی صدارت پر نامزد کیا) نے مجلس کے امیدوار کا ناکام مقابلہ کیا۔ کچھ اور غیر معروف لوگوں کا بھی یہی حشر ہوا۔ اتحاد المسلمین نے مقننہ کی صدفی صد نشستیں حاصل کیں۔ ہندوؤں کی مستند جماعتوں نے پہلے ہی سے مقننہ کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ البتہ فرقہ لنگائت نے انفرادی طور پر اور پست اقوام نے جماعتی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لیا۔ کچھ اور ہندو آزادانہ طور پر بھی منتخب ہوئے۔

ادھر مقننہ کے انتخابات ختم ہوئے ادھر مولانا مظہر کا دور صدارت بھی اختتام پذیر ہوا۔ مولانا مجلس کے اندرونی اختلافات سے بڑے دل برداشتہ تھے جو آپس کی کشمکش اور اقتدار کی رسہ کشی کا اکھاڑا بن گئی تھی۔ مولانا کی سنجیدگی اور ان کا زہد تقوی اس رکاکت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ سیاست کے کیاولی ہتھکنڈوں سے وہ قطعی ناواقف تھے اور اگر واقف بھی ہوتے تو اپنی غیر معمولی شرافت اور نیکیوں کے باعث ان پر عمل پیرا نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ ایک فتنہ کو مٹانے کے لئے آئے تھے لیکن جب فتنہ پرداز اپنی حرکات سے باز ہی نہ آتے تھے تو مولانا کو کب صدارت عزیز تھی۔

مولانا مظہر علی کامل کے بعد اتحاد المسلمین کی صدارت پر سید محمد قاسم رضوی

کا انتخاب عمل میں آیا جو مقننہ کے بھی رکن تھے۔ مرکزی مجلس اتحاد المسلمین کے صدر کی حیثیت سے وہ مقننہ کے اتحادی گروپ کے بھی صدر ہوگئے۔ ان دو عہدوں نے مل کر شراب کو دو آتشہ کردیا تھا۔ اصحاب خمسہ نے وزارتیں حاصل کرنے کے لئے جو نقشہ بنایا تھا اور جن خطوط پر اپنے قلعہ کی تعمیر کی تھی وہ اب مسمار ہو چکا تھا۔ ایک نئے قلعہ کی تعمیر شروع ہوگئی تھی۔

مقننہ کے افتتاح کے ساتھ ہی اس کا امکان پیدا ہوگیا تھا کہ فوری طور پر اتحاد المسلمین کے ارکان مقننہ میں سے ایک وزیر نامزد کیا جائے گا۔ حکومت اور مجلس دونوں اس تلاش میں مصروف تھے۔ ارکان مقننہ تین گروہ میں تقسیم تھے۔ (۱) وہ ارکان جو اپنے انتخاب کے لئے اصحاب خمسہ کے مرہونِ منت تھے (۲) قاسم رضوی کی جماعت (۳) وہ ارکان جو محض اپنی قابلیت اور صلاحیتوں کی بناء پر منتخب ہوئے تھے۔ اصحاب خمسہ اور ان کے فرستادہ ارکان قاسم رضوی کی بارگاہ میں مردود ہو چکے تھے اور قاسم رضوی کی مرضی کے بغیر کسی کا انتخاب ممکن بھی نہ تھا۔ قاسم رضوی کی جماعت میں وزارت کی اہلیت کسی ایک میں بھی نہ تھی۔ اس کے باوجود یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک ضلع کے مجلس اتحاد المسلمین کے صدر کا نام پیش کیا تھا جس کو حکومت نے قبول نہیں کیا۔ اب صرف آزاد خیال گروہ میں سے کسی کو منتخب کیا جا سکتا تھا بشرطیکہ کسی رکن میں قابلیت، صلاحیت اور وجاہت کے ساتھ قاسم رضوی کی پشت پناہی بھی حاصل ہو۔ عبدالرحیم میں یہ ساری خصوصیات بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ چونکہ عملی سیاست میں انھوں نے کبھی حصہ نہیں لیا تھا۔ ور نہ کسی پلیٹ فارم پر یا اخباری کالموں میں حکومت پر نکتہ چینی کی تھی اس لئے سر مرزا بھی ان ہی کی جانب مائل تھے بلکہ مجلس سے استمزاج کے بغیر حکومت نے وزارت کی انھیں پیشکش بھی کردی تھی۔ لیکن عبدالرحیم نے انتہائی دانشمندی سے حکومت کو لکھ بھیجا کہ وہ مجلس کے رکن اور اس کے ڈسپلن کے پابند

ہیں تاوقتیکہ مجلس کی جانب سے انھیں قبولیت کا حکم نہ دیا جائے وہ اس پیشکش کو قبول نہیں کرسکتے۔ ان کی یہ ادا قاسم رضوی کو بیحد پسند آئی اور ایک صحیح آدمی کی تلاش کے لئے ان کی ساری سرگردانی ختم ہوگئی۔ جوں ہی حکومت کو مجلس کے صدر کے عندیہ کا علم ہوگیا مجلس کو ایک وزیر کی نامزدگی کی دعوت دی گئی اور اس طرح عبدالرحیم کا نام پیش اور قبول ہوا۔ غرض وزارت کی پہلی کرسی کی تقسیم اس طرح عمل میں آئی۔

مجلس کے حلقوں میں عبدالرحیم کے انتخاب نے ہلچل پیدا کردی۔ مجلس کے قدیم اور دیرینہ خادم جو برسوں سے مجلس کی ٹھوس خدمت انجام دے رہے تھے سخت چراغ پا ہوئے۔ اس میں شک نہیں عبدالرحیم نے مجلس کی کوئی عملی خدمات انجام نہیں دی تھیں۔ لیکن حیدرآباد بنک کے موسس اور منیجنگ ڈائرکٹر کی حیثیت سے مسلمانوں کے اقتصادی اور معاشی استحکام میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ وہ ایک کامیاب وکیل اور انجمن وکلاء کے صدر تھے اور ہائی کورٹ کی ججی کے لئے ان کا نام پیش ہوچکا تھا۔ وکالت اور بنک کاری نے انھیں عامۃ المسلمین سے قریب کردیا تھا ان کے انتخاب نے خود مجلس کو ایک آزمائش میں مبتلا کردیا تھا کہ کس حد تک اس کا نامزد رکن وزارت کے گرانقدر فرائض سے عہدہ برآ ہوتا ہے خصوصاً جبکہ صدیوں کی روایات کے خلاف پہلی مرتبہ ایک عوامی وزیر کو اُن لوگوں کے پہلو بہ پہلو جگہ دی گئی تھی جو خاندانی وجاہت، برطانوی پشت پناہی یا سیول سروس سے ترقی کرتے ہوئے اس عہدۂ گراں پر فائز تھے۔ یہ امتحان قابلیت اور صلاحیت ہی کا نہیں تھا بلکہ اخلاق و عادات اور کردار و اطوار کا بھی تھا اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عبدالرحیم اس آزمائش میں پورے اُترے جس کا اعتراف علی یاور جنگ نے بھی اپنی کتاب[1] میں کیا ہے۔ انھیں تین وزرائے اعظم کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ سرمرزا، نواب چھتاری، لائق علی اور ہر دور صدارت

---

[1] Hyderabad in Retrospect

غلطی میں یہ بکھرتے ہی گئے۔ علاوہ ازیں مجلس کے نمائندہ کی حیثیت سے انھوں نے مجلس کے ڈسپلن کی پوری پابندی کی اور دو موقعوں پر استعفا بھی پیش کیا۔

مولانا مظہر کے صدارت سے ہٹنے کے بعد پارلیمانی بورڈ کی عنان قاسم رضوی کے ہاتھ میں آگئی تھی لیکن بورڈ کے معتمد اور اصحاب خمسہ کے روح رواں (احمد عبداللہ المسدوسی) کا وجود کانٹے کی طرح انھیں کھٹک رہا تھا۔ اس بورڈ کو تحلیل کرنے کی یہ صورت نکالی گئی کہ اپنے جماعتی رکن اکرام اللہ کا استعفیٰ مجلس شوریٰ میں پیش کرایا گیا۔ اس استعفا کی وجہ دراصل یہ تھی کہ اکرام اللہ کو جو صدر مجلس کے ساتھیوں اور گہرے دوستوں میں تھے کسی طرح وزارت پر لایا جائے۔ چنانچہ جب یہ استعفا شوریٰ کی منظوری کے لئے پیش ہوا تو بعض ارکان نے بیباکی سے کام لیتے ہوئے اس امر کا اظہار کیا کہ کہیں یہ استعفا مقننہ میں جانے اور وزارت حاصل کرنے کا پیش خیمہ ثابت نہ ہو، اس لئے استعفاء کو منظور کرتے ہوئے یہ شرط عائد کی جائے کہ اکرام اللہ انتخابات میں حصہ نہیں لے سکیں گے۔ کیونکہ یہ طے شدہ تھا کہ پارلیمانی بورڈ کے ارکان دوسری مقننہ کے انتخاب تک اس کے رکن نہیں بن سکتے تھے۔ لیکن صدر مجلس نے اس اعتراض کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اور اس استعفا کو بلا کسی شرط کے شوریٰ سے منظور کروالیا۔[1]

یہ تو مولانا مظہر کی صلح کل پالیسی تھی کہ پارلیمانی بورڈ میں انھوں نے حزب اختلاف کے ایک رکن کو نامزد کیا تھا لیکن قاسم رضوی کے دور صدارت میں بلا وجہ بورڈ کو تحلیل کر دیا گیا اور پھر اپنی جماعت کے ایسے ارکان کو جدید بورڈ میں نامزد کیا گیا جنھیں شوریٰ کا پوری طرح اعتماد حاصل نہ تھا۔ نئے بورڈ میں عبدالقدوس ہاشمی اور مخدوم علی خاں ارکان منتخب ہوئے اور بلحاظ عہدہ قاسم رضوی اس کے صدر تھے۔ اس بورڈ کی ساری کارروائیاں جماعتی اساس پر انجام پاتی تھیں اور ناانصافیوں اور بدعنوانیوں میں جدید بورڈ قدیم بورڈ سے چند قدم آگے ہی تھا۔

---

[1] شوریٰ کے اجلاس میں یہ اعتراض راقم الحروف نے کیا تھا۔

لائق علی کے وزارت عظمیٰ پر مامور ہونے کے بعد کونسل کی نشستوں کی تعداد ۱۲ مقرر کی گئی جس میں سے چار اتحاد المسلمین، چار عہدہ داران سرکاری اور چار ہندو جماعتوں کے لئے مختص کی گئیں۔ اتحاد المسلمین کی طرف سے عبدالرحیم اپنے سابقہ تجربات اور ریکارڈ کی وجہ سے ناگزیر تھے البتہ تین ارکان کے انتخاب کا مسئلہ قاسم رضوی نے اتحاد المسلمین کی مجلس عاملہ کے سپرد کیا جسے پہلے ہی سے قاسم رضوی کے ذہن کا علم تھا۔ چنانچہ عاملہ نے عبدالرؤف، یامین زبیری اور اکرام اللہ کا انتخاب کیا۔ علاوہ ازیں قاسم رضوی کی جماعت میں ان سے بہتر ارکان تھے بھی نہیں۔ صدر اعظم سے ان ارکان کے انتخاب کے متعلق مشورہ نہیں کیا گیا اور جب انھیں معلوم ہوا تو ایک رکن کے انتخاب پر انھوں نے شدید احتجاج کیا جس کو ان کی تجارتی کمپنیوں سے بالعموم رقمی امداد دی جاتی تھی۔ مجلس عاملہ کے مقابلہ میں صدر اعظم کی رائے کو بارگاہ قیادت میں کوئی اہمیت نہیں دی گئی اور یہ تینوں ارکان وزارت پر مامور کر لئے گئے۔

ابتداءً جب پہلی مرتبہ اتحاد المسلمین کی صدارت پر قاسم رضوی کا انتخاب ہوا تھا تو ان کے مخالفین میں عبدالرؤف اور یامین زبیری کا نام سر فہرست تھا۔ لیکن جب قاسم رضوی کی طاقت و قوت میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا اور مجلس کے قدیم کارکنوں کے مقابلہ میں قاسم رضوی کی حمایت کی وجہ سے عبدالرحیم سب سے پہلے مجلس کی جانب سے وزیر نامزد ہوئے تو عبدالرؤف نے سارے اختلافات ختم کر کے صدر مجلس سے "سمجھوتہ" کر لیا جس کے بعد انھیں قاسم رضوی کا قرب حاصل ہو گیا۔ یامین زبیری مسلسل مجلس کے معتمد رہے ہیں۔ اس طرح مجلس اور حکومت کے سارے تار ان کے ہاتھ میں تھے۔ قاسم رضوی تعلقہ لاتور کے صدر کی حیثیت سے اپنے تعلقہ کی سیاست کا تجربہ رکھتے تھے اور اس طرح وہاں کے کوزہ میں طوفان برپا کرنے کے عادی تھے بلکہ مجلس کے سحر ذخار سے جو پورے ممالک محروسہ پر حاوی تھا، انھیں

سابقہ نہ پڑا تھا۔ یہاں کی سیاست کا تانا بانا دربار کی سازشوں، رزیڈنسی کی ریشہ دوانیو
اور بابِ حکومت کے توڑ جوڑ کے فتنوں سے بُنا ہوا تھا۔ قاسم رضوی کے لئے یہ دنیا بالکل نئی
تھی۔ بخت و اتفاق نے انھیں کنویں سے نکال کر ایک تلاطم خیز سمندر میں ڈال دیا تھا
جس کے تموج اور طوفان خیزیوں سے وہ قطعاً ناآشنا تھے۔ ان کی جماعت میں معتمدی
کے فرائض انجام دینے کی کسی میں صلاحیت نہ تھی۔ یامین زبیری کو چاروناچار انھیں قبول
ہی کرنا پڑا کیونکہ قدیم معتمد کے تعاون کے بغیر قاسم رضوی کی صدارت کی کشتی سیاست
کے طوفان خیز سمندر سے پُرسکون طریقہ پر گذر نہ سکتی تھی۔ اس تعاون کا معاوضہ یامین زبیری
کو بشکل وزارت دیا گیا۔ اکرام اللہ کا انتخاب تو دوست نوازی کی بدترین مثال
تھی جس کے لئے پارلیمانی بورڈ اور مجلس شوریٰ کو فریب میں مبتلا کیا گیا تھا۔

بعد کے تینوں وزراء میں عبدالرؤف کا شمار مجلس کے صف اول کے لوگوں
میں ہوتا تھا لیکن مجلس کے قدیم کارکنوں کے نزدیک انھوں نے قاسم رضوی سے سمجھوتہ
کرکے ایک طرح اپنے وقار کو گرا لیا تھا۔ یامین زبیری اس میں شک نہیں مجلس کے
مسلسل معتمد رہے تھے لیکن ایسے ہنگامی دور میں جب کہ موت و زیست کے مسائل
سے سامنا تھا ان کا اور ان سے زیادہ اکرام اللہ کا انتخاب نہ صرف قبل از وقت بلکہ
نامناسب بھی تھا۔ چنانچہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ لائق علی کے تقرر کے ساتھ ہی جب سابقہ
کونسل تحلیل ہوگئی تھی تو جدید کابینہ میں اپنی شمولیت پر عبدالرحیم نے اعتراض کیا تھا۔ ان
کا بھی یہی نقطۂ نظر تھا کہ حیدرآباد زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ حوادث کے
اس متلاطم سمندر سے حیدرآباد کی کشتیٔ حیات کو ساحلِ مراد تک پہنچانے کے لئے
ایسے ناخداؤں کی ضرورت ہے جنھیں طوفان کی بلاخیزیوں کا تجربہ ہو، جو اس کے
چشم و ابرو کے اشاروں کو پہچانتے ہوں اور اس طرح حیدرآباد کے بہترین دماغ ہوں
لیکن نقارخانہ میں طوطی کی آواز کو کون سنتا ہے؟ بالآخر لائق علی نے انھیں اپنا استعفا

واپس لینے پر مجبور کیا اور اس طرح جدید کابینہ میں عبدالرحیم شریک ہوئے۔

حیدرآباد کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کونسل عوامی ارکان کی اکثریت پر مشتمل تھی اور اُن کا انتخاب ان کی لیاقت، صلاحیت، خاندانی وجاہت، بادشاہ کی نامزدگی یا رزیڈنسی کی ریشہ دوانی سے نہیں بلکہ مقننہ کے ارکان اور عوامی نمائندوں کی حیثیت سے ہوا تھا۔ اس لحاظ سے کونسل میں ایسے بھی لوگ پہنچ گئے جو اس اعزاز کا کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں زندگی کا بہترین موقع ملا تھا جس سے دستبردار ہونے وہ تیار نہ تھے حالانکہ بعض مواقع ایسے آئے تھے کہ قومی مفاد کی خاطر اس کابینہ کو مستعفی ہوجانا چاہیئے تھا۔ لیکن ذاتی مفاد نے اجتماعی مفاد کو قربان کردیا تھا۔ ملک کے مستقبل سے کسی کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہر وزیر یہ سمجھتا تھا کہ ساری ذمہ داری بحیثیت قائد قوم یا تو قاسم رضوی کی ہے یا بحیثیت صدر اعظم لائق علی کی۔ کابینہ کے اجلاسوں کی جو تفصیلات مل سکیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ معزز ارکان بابِ حکومت حیدرآباد کے مستقبل کے اہم ترین مسئلہ کو سلجھانے کی بجائے انتظامی معاملات، عہدہ داروں کی ترقی اور تبادلے، اپنے رشتہ داروں اور احباب کے تقررات، اپنے موٹر الاؤنس، دوروں کے بھتوں کے اضافے، دعوتوں، شان و تمکنت کے مظاہروں اور اس نوع کے دیگر کاموں میں اپنی ذہانت کو زیادہ کام میں لا رہے تھے۔ بعض کی دیانت بھی مشتبہ ہوگئی تھی۔ اغراض سے یہ لوگ اتنے وابستہ ہوگئے تھے کہ اپنی آزاد رائے پیش کرنے کی ان میں ہمت نہ تھی، ویسے ان کی خود کوئی آزاد رائے تھی بھی نہیں۔

آخر زمانہ میں جب حیدرآباد کے سیاسی مطلع پر تاریک بادل چھانے لگے تھے۔ حیدرآباد کے چاروں صوبے اتحاد المسلمین کے چاروں وزراء کی راست نگرانی میں کردئے گئے تھے جنھیں ان علاقوں کے نظم و نسق کا بھی ذمہ دار قرار دیا گیا تھا۔ لیکن حکومت کے انتظام میں جو ابتری پھیل چکی تھی وہ دور نہ ہوسکی۔ ہندوستان کے فوجی حملہ کے

ساتھ ہی بجز عبدالرحیم کے مجلس کے دیگر تین وزراء کو لائق علی نے اپنے اپنے علاقوں کے دورے پر روانہ کیا۔ لیکن اپنی شخصی عاقبت کی خاطر یہ تینوں دو روز کے اندر ہی حیدرآباد واپس ہو گئے۔ سقوط کے ایک روز قبل ۱۶ ستمبر کو جبکہ لائق علی نے استعفا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ۱۷ کی صبح حکومت بھی مستعفی ہو رہی تھی، اکرام اللہ کو معلوم نہیں کس خفیہ مشن پر پاکستان پرواز کرنے کی ضرورت پیش آئی اور اس چیز کو کونسل کے سینیئر وزراء تک سے راز میں رکھا گیا۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۶ کی سہ پہر کو جب لائق علی استعفا سے پیدا ہونے والی صورت حال پر عبدالرحیم سے گفتگو کر رہے تھے تو اکرام اللہ شاہ منزل پہنچے اور لائق علی سے تنہائی میں گفتگو کر کے واپس لوٹ گئے۔ یہ کس مقصد سے آئے تھے اس کا لائق علی نے بھی کوئی تذکرہ اپنے ساتھی کے سامنے نہیں کیا۔ دوسرے روز جب کونسل کا آخری اجلاس منعقد ہوا اور کونسل نے متفقہ طور پر مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا تو اس اجلاس میں بجز اکرام اللہ کے سارے وزراء شریک تھے۔ سب سے پہلے پینگل وینکٹ راما ریڈی نے ان کی کمی کو محسوس کیا تو لائق علی نے جواب دیا کہ وہ پاکستان جانا چاہتے تھے اس لئے انھیں پاکستان جانے کی اجازت دی گئی۔ لیکن یہ کیوں گئے ان کے جانے کی ضرورت کیوں درپیش ہوئی۔ اس کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔ بہرکیف وزراء کے اغراض بھی آپس میں ایک دوسرے سے مختلف تھے اور ہر ایک کے پیش نظر ملک سے زیادہ اپنا شخصی مفاد تھا۔

ہندوستان سے گفت و شنید کی جو شرائط کونسل میں پیش ہوتی تھیں ان پر ارکان کونسل نے کبھی حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے غور نہیں کیا جس کے نتیجہ میں گفت و شنید ہی ناکام ہو کر رہ گئی۔ نظام نے کونسل کی رائے سے کبھی انحراف نہیں کیا چونکہ کونسل ملک کی سب سے مقتدر جماعت تھی اس لئے حیدرآباد کو ہندوستان کے فوجی حملہ کے بعد جن نتائج اور عواقب کا سامنا کرنا پڑا اس کی ذمہ داری حیدرآباد کی کونسل اور تنہا کونسل پر عاید ہوتی ہے۔

ضمیمہ

پیراموئنسی کے مظاہر چند نمونے

یہ ضمیمہ دراصل اس کتاب کے باب دوم "حیدرآباد سے انگریزوں کے تعلقات" کا تتمہ ہے جس سے دیسی ریاستوں پر برطانوی پیراموئنسی اور اس کے دائرہ عمل کے مطالعہ میں بڑی مدد ملتی ہے۔ پیراموئنسی ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی انگریزوں نے اپنے دورِ اقتدار میں کبھی تعریف و تشریح کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور معاہدات اور عہدناموں کے خلاف ریاستوں پر اپنی بالادستی کو اس طرح مسلط کیا کہ کسی ریاست کو دم مارنے کا یارا نہ تھا۔ ہر ریاست کا رزیڈنٹ یا پولیٹکل ایجنٹ نہ صرف اُس ریاست میں برطانوی مفادات کا محافظ اور نگہبان تھا بلکہ برطانوی اقتدار اعلیٰ کے کارندہ کی حیثیت سے والیٔ ملک پر اپنا بے پناہ اثر رکھتا تھا۔ وزراء اور کلیدی خدمات پر اس کی ایما اور مرضی کے بغیر کوئی تقرر نہیں کیا جا سکتا تھا جس کے باعث ریاست کے عہدہ داروں کے لئے والیٔ ریاست سے زیادہ رزیڈنٹ سے اپنی وفاداری کو وابستہ کرنے کی نہ صرف ضرورت پڑتی تھی بلکہ اپنے ذاتی اغراض کے حصول کے لئے ریاست کے مفادات کی پائمالی سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا تھا۔

پیراموئنسی پر ریاستوں میں کس طرح عمل ہوتا تھا، ایک دلچسپ موضوع ہے اور تفصیل طلب بھی ہے۔ ضمیمہ میں جو کچھ مواد پیش کیا جا رہا ہے وہ ۳۵-۱۹۳۸ء کے زمانہ سے متعلق ہے لیکن بیحد دلچسپ اور معلومات آفریں ہے۔ راز کی یہ نایاب چیزیں کہاں

دستیاب ہوتی ہیں۔ لیکن اتفاق سے ایک دوست کے ذریعہ ہمیں یہ کاغذات مل گئے جن کے اصلی ہونے میں ہمیں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہے۔

ان کے مطالعہ سے یہ چیز واضح ہو گی کہ رزیڈنٹ کا حیدرآباد میں کیا عمل تھا۔ نظام کی حرکات و سکنات پر کس طرح نظر رکھی جاتی تھی اور ان کے شاہانہ اختیارات پر کس طرح مختلف طریقوں سے تحدید عاید کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ وزراء ریاست کے تقرر میں کن امور کو پیشِ نظر رکھا جاتا تھا اور رزیڈنٹ کی مرضی کے بغیر ان کی عارضی تعیناتی تک منظور نہیں کی جا سکتی تھی۔ حیدرآباد کے وزراء اعظم میں سر اکبر حیدری کو ایک ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے لیکن وہ بھی رزیڈنسی کے نشان زدہ راستے سے انحراف نہیں کر سکتے تھے۔ وزراء کے تقرر میں شیعہ اور سُنّی اعتقادات کو بھی پیش نظر رکھا جاتا تھا۔"

—— (۱) ——

سر اکبر حیدری کے وزارتِ عظمیٰ پر تقرر کے متعلق رزیڈنٹ کی رپورٹ

موسومہ محکمۂ سیاست حکومتِ ہند۔

ستمبر ۱۹۳۵ء

(۱) کل سر اکبر حیدری سے ملاقات پر انھوں نے کہا کہ ہز اگزالٹیڈ ہائی نس کو ایک اہم معاملہ میں ملک معظم کی حکومت کے اعلان کا شدید انتظار ہے جس کے متعلق اپنی سابقہ رپورٹ میں میں نے واضح کر دیا تھا کہ مناسب موقع پر اس کی اشاعت ہو گی۔ میں نے حیدری کو صحیح صورت حال بتلائی اور کہا کہ اس موضوع پر میں آئندہ ملاقات کے وقت ایچ ای ایچ (نظام) سے گفتگو کروں گا۔ لیکن سر اکبر اس کے لئے تیار نہیں ہیں۔ انھوں نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ ایچ ای ایچ کے سامنے یہ مسئلہ نہ چھیڑا جائے یا اگر اس پر گفتگو کی نوبت آجائے تو کم از کم ان کا (حیدری) کا نام نظام کے سامنے نہ لیا جائے۔

(۲) کونسل کے تقررات کے مسئلہ پر مجھے بحث کرنے کا موقع ملا جب کو اپنی سکریٹری

مراسلت میں تفصیل کے ساتھ پیش کروں گا۔

میری رائے ہے کہ جدید اصلاحات کے نفاذ کے ساتھ کلیدی خدمات کے تقررات پر حکومت ہند کو پورا کنٹرول حاصل ہونا چاہیئے۔ نظام کی یہ خواہش ہوگی کہ ان کے گرد جو خار دار تار نصب ہیں ان سے حیدری کی کوششوں کے ذریعہ نجات حاصل کی جائے۔ خود حیدری اپنا کھیل کھیل رہے ہیں اور اگر موقع ملے تو خود اپنی کابینہ کے ارکان کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں اس امر کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ جہاں تک انحطاط پذیر عمر اور صحت کا تعلق ہے مجھے موجودہ صدر (مہاراجہ کشن پرشاد) اور جدید امیدوار صدارت میں زیادہ فرق نظر نہیں آتا۔ میں نے اس کا تذکرہ ہز اکسلنسی وائسرائے سے بھی اپنی گذشتہ ملاقات پر کیا تھا۔ فرق یہ ہے کہ حیدری اپنے آپ کو زیادہ جفاکش ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ چیز اہم ہے اور ہماری توقعات کے عین مطابق ہے کہ حیدری ہمارے نشان زدہ راستہ سے انحراف نہیں کرسکتے۔ کیونکہ اگر حیدری کا انتخاب ہونا ہی ہے تو یہ زیادہ دیرپا انتظام ہرگز نہ ہوگا۔ دیگر کلیدی تقررات ابھی باقی ہیں اور ان پر اپنے پورے کنٹرول کے نقطۂ نظر سے انتقادات کرائے جائیں گے۔

(۳) نظام کے خاندان میں کچھ بے اطمینانی پیدا ہونے کی اطلاعات ملی ہیں لیکن ابھی تک کوئی قابل ذکر بات ظاہر نہیں ہوئی۔

(۴) ہز اگزالٹیڈ ہائی نس ریاست کے بعض معاملات میں پھر غیر معمولی دلچسپی لینے لگے ہیں اہم تفصیلات کی رپورٹ روانہ کی جائے گی حسب عادت وہ مزید اعزازات حاصل کرنے کے متمنی ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

(۵) نظام کی یہ خواہش کہ سرکاری تقاریب میں جب وہ رزیڈنسی آتے ہیں تو یک یورپین افسر کی کمان میں انھیں گارڈ آف آنر پیش کیا جائے، ناقابل قبول ہے۔

ایک ہندوستانی کمیشن افسر اور یوروپین کمیشن افسر میں اس طرح کا نازیبا امتیاز کرنا قابل عمل نہیں ہو سکتا۔ اب جبکہ فوج کو ہندیایا جا رہا ہے نظام کو موجودہ صورت حال ہی پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ اگر ضرورت محسوس ہو تو نظام کو تفہیم کی جائے گی۔

(۶) میری یہ پیش قیاسی صحیح ثابت ہوئی کہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی چانسلری کے مسئلہ میں محکمہ سیاسیات، یا رزیڈنسی کی مداخلت کا نظام پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ چنانچہ ہز اکسلنسی وائسرائے کے ایک خط نے معاملہ کو سلجھا دیا اور توقعات کے مطابق نظام نے چانسلری قبول کر لی۔ اس کا عام طور پر اور بطور خاص ریاست اور برطانوی ہند کے مسلم عوام پر بڑا اچھا اثر پڑا۔

اس خبر پر اطمینان کا اظہار کیا گیا کہ مرکزی مجلس مقننہ کے مسلم ارکان کے ایک وفد نے جو سر محمد یعقوب، سر اے ایچ غزنوی، سر حاجی ہدایت اللہ اور سر لیس قاسم متھا وغیرہ پر مشتمل تھا، نظام کو علیگڈھ یونیورسٹی کی چانسلری کے عہدہ کو قبول کر دینے کی مساعی پر وائسرائے کا شکریہ ادا کیا۔ اور ہز اکسلنسی کے توسط سے نظام کو اپنے جذبات تشکر پہنچانے کی درخواست کی۔ مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں وائسرائے کی دلچسپی کا اچھا اثر ہوا اور وفد کو مبارکباد دی گئی۔

(۸) حال ہی میں نظام نے کوتوال شہر حیدرآباد کے اختیارات میں مزید توسیع کے لئے جدید قواعد منظور کئے ہیں جن کا مقصد ملک میں فرقہ داری ہم آہنگی کا قیام ہے۔ امن عامہ اور تحفظ عامہ میں خلل اندازیوں کے انسداد کے لئے کوتوال کو مقتدر رو دیا گیا کہ وہ کسی شخص کو کسی پبلک مقام پر داخل ہونے سے روک سکتا ہے اگر یہ باور کرنے کے وجوہ ہوں کہ ایسے داخلہ سے امن میں خلل پیدا ہونے کا امکان ہے۔ علاوہ ازیں بشرط ضرورت کوتوال کسی شخص کو شہر کے کسی خاص علاقہ میں داخل ہونے سے بھی منع کر سکتا ہے۔

— ۲ —

اقتباس نوٹ مرتبہ پولٹیکل سکریٹری حکومت ہند مورخہ ۲۹ر جنوری ۱۹۳۸ء موسومہ سر ڈنکن میکنزی رزیڈنٹ حیدرآباد

آج سر اکبر حیدری سے میری تفصیلی گفتگو ہوئی جو تین امور سے متعلق تھی۔ سر اکبر کے بیان کے مطابق انھوں نے ایک روز قبل ان مسائل پر والسرائے سے بھی گفتگو کی ہے۔

(۱) سکندرآباد کنٹونمنٹ کے اس حصہ کا استرداد جو فوجی اغراض کے لئے درکار نہیں ہے۔

سر اکبر نے کہا کہ نظام اس علاقہ کے استرداد کے بہت کوشاں ہیں اور اگر یہ علاقہ مسترد ہو جائے تو وفاق کے متعلق نظام کی رائے کو متاثر کرنے میں مدد ملے گی۔

حال ہی میں اس مسئلہ پر میں نے رزیڈنٹ سے حیدرآباد میں گفتگو کی جس نے مجھے متعلقہ رقبہ کا نقشہ بتلا کر کہا کہ نہ اُن کو اور نہ مقامی ملٹری کے ارباب کو اس علاقہ کے استرداد پر کسی قسم کا کوئی اعتراض ہے۔ کنٹونمنٹ کے اس علاقہ سے بہت کم آمدنی ہوتی ہے اور اس کے برعکس یہاں کی سڑکوں کی مرمت وغیرہ پر کافی اخراجات ہوتے ہیں۔ اس کے استرداد سے کنٹونمنٹ کو فائدہ ہوگا۔

اس لئے میں نے سر اکبر حیدری سے کہا کہ جہاں تک مجھے علم ہے اس علاقہ کے استرداد میں کوئی مشکلات حائل نہ ہوں گی۔ مجھے یقین تھا کہ رزیڈنٹ کی بھی بعینہٖ یہی رائے تھی جن سے اب سر اکبر حیدری اس مسئلہ میں گفتگو کریں گے۔ لیکن میں نے سر اکبر حیدری کو متنبہ کیا کہ جہاں ہم اس مسئلہ کے بعجلت ممکنہ تصفیہ میں کوشاں ہیں وہاں ان کا اس کو وفاق کی گفت و شنید سے ملانا دانشمندی کے خلاف ہے جس سے اس مسئلہ کا کوئی راست تعلق نہیں ہے۔ اگر وہ ان خطوط پر کام کریں گے تو غرض مند اشخاص یہ معنی پہنائیں گے کہ حیدرآباد کو شرکت وفاق پر آمادہ کرنے کے لئے استرداد کی رشوت

دی گئی۔ اس سے پیچیدگیاں پیدا ہوں گی جیسا کہ دوسرے مقامات پر دیکھا گیا ہے اور اس سے مسئلہ کے تصفیہ میں تاخیر کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔

مسئلہ کے اس پہلو پر جس رائے کا میں نے اظہار کیا ہے سر اکبر حیدری کو اس سے پورا اتفاق ہے اور وہ اپنے طرز عمل میں حسبہٗ ترمیم کریں گے۔

۲۔ جی آئی پی ریلوے کا وہ علاقہ جو ریاست حیدرآباد میں واقع ہے۔

سر اکبر حیدری حیدرآباد ریلوے لائن کے اس علاقہ کو خریدنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے بیان کیا کہ نظام اور ان کی رعایا بھی اس مسئلہ کو بڑی اہمیت دیتی ہے کیونکہ اس علاقہ کے ملنے کے بعد حیدرآباد ریلوے کا انتظام مکمل اور خود مکتفی ہو جائیگا۔ انھوں نے یہ رائے پیش کی کہ اس مسئلہ کو دفاتی گفت و شنید کے جزو بنانے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ انھوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ حکومت ہند کے لئے ریلوے کے اس علاقہ کو فروخت کردینا زیادہ آسان ہے جس کے بعد اس علاقہ کا نظم و نسق مسترد ہو سکتا ہے کیونکہ اس طرح عمل کرنے سے استرداد پر کم سے کم تنقید کا امکان ہے۔

میں نے سر اکبر کو یاد دلایا کہ نظم و نسق کے استرداد پر انھوں نے ابتداء سے بڑی اہمیت دی ہے۔ میں نے انھیں دہلی اور حیدرآباد دونوں مقامات پر بتلایا کہ اس مرتبہ استرداد کے امکانات زیادہ روشن ہیں کیونکہ سابق میں میری رائے موافق نہ تھی میں نے انھیں بتلایا تھا کہ استرداد کا میں کوئی وعدہ نہیں کرتا البتہ اگر چند شرائط قبول کی جائیں تو استرداد قابل عمل بن سکتا ہے اور سر اکبر نے ان شرائط کو مناسب ہونا قرار دیا تھا۔ اب اگر سر اکبر پیچھے ہٹ رہے ہیں اور جی آئی پی ریلوے کی ہوگی رانچور لائن کی خریدی کو وفاق کا سودا قرار دے رہے ہیں تو حکومت ہند کی جانب

سے نظم ونسق کے استرداد کے امکانات کو وہ شدید طور پر متاثر کر دیں گے۔

سر اکبر حیدری نے کہا کہ اپنی بات سے منحرف ہونا یا پیچھے ہٹنے کی ان میں عادت نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی بات پر قائم رہے ہیں۔ انھوں نے ریلوے نظم ونسق کے استرداد پر بہت زور دیا اور یہ محسوس کیا جیسا کہ کچھ دنوں قبل میں نے انھیں بتلایا تھا کہ استرداد سے انھیں وفاق کی مخالفت کو دبانے کا ایک اچھا حربہ ہاتھ آجائے گا۔ جہاں تک ہونگی رائچور ریلوے لائن کی خریدی کا تعلق ہے وہ صرف اس امر کا اطمینان چاہتے ہیں کہ ریاست کی جانب سے اس کی خریدی کی پیشکش پر پوری طور پر غور کیا جائے گا۔ سیاسی وجوہات کی بنا پر حیدرآباد اس لائن کی خریدی کے لئے ایک خطیر رقم پیش کرنے کے لئے تیار ہے لیکن مالیاتی اسباب کی بناء پر اس کو قبول نہیں کیا جائے گا جس کی ریاست کو اچھی طرح تفہیم کردی جائے۔ محکمہ سیاست کی امداد ان معاملات میں رزیڈنسی کو ہمیشہ حاصل رہے گی۔

میں نے سر اکبر سے کہا کہ اگر ریاست باضابطہ طور پر کوئی پیشکش کرتی ہے تو بلاشبہ اس پر غور کیا جائے گا۔ لیکن میں کسی قسم کے اطمینان دلانے کے موقف میں نہیں ہوں آیا اس کو قبول کیا جائے گا یا نہیں۔ یہ تو بالکلیہ ریلوے کے ارباب کا کام ہے کہ پیشکش کو قبول یا رد کریں کیونکہ ریلوے لائن محکمہ سیاسیات کی ملک نہیں ہے۔

سر اکبر نے بادل نخواستہ اس توجیہ کو قبول کیا۔ اس مسئلہ میں پھر مزید گفتگو نہیں ہوئی۔

۳۔ ۱۸۰۲ء کا تجارتی معاہدہ اور ثالثی کا حوالہ

اس مسئلہ پر تفصیل سے میں نے سر اکبر حیدری سے حیدرآباد میں گفتگو کی تھی۔ میں نے انھیں یاد دلایا کہ اپنے مراسلہ میں انھوں نے جو مطالبہ کیا ہے کہ وزیر ہند کو

اپنے احکام کی نظر ثانی کرنی چاہیئے اس سے انھوں نے قطعی طور پر حکومت ہند کو متہم کیا ہے کہ مؤخرالذکر نے اس مسئلہ کے تصفیہ میں ثالثی کی دفعہ کو نافذ کرنے سے گریز کیا ہے جو ۱۹۲۰ء کے رزولیوشن میں مدون کی گئی تھی۔ لیکن حیدرآباد نے تو خود حکومت ہند کے فیصلہ کے خلاف وزیر ہند سے اپیل کر کے ۱۹۲۰ء کے رزولیوشن کی ثالثی دفعہ کو پس پشت ڈالا ہے۔ اگر سراکبر کو اس امر پر اصرار ہو کہ ۱۹۲۰ء کے رزولیوشن کی اتباع کر کے وہ ریاست کے مسائل کا تصفیہ کر سکتے تھے تو ایسا راستہ اختیار نہ کرنے کی پوری ذمہ داری سراکبر اور ان کے مشیروں پر عائد ہوتی ہے جنھوں نے دانستہ طور پر اپنے ان مواقعوں کو نظر انداز کرنا قبول کیا۔

سراکبر نے بیان کیا کہ ان کی نیت حکومت ہند پر حملہ کرنے کی نہیں تھی اور اگر ان سے غلطی سرزد ہوئی تو وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے تیار ہیں۔ انھوں نے ۱۹۲۰ء کے رزولیوشن کو پوری طرح نہیں سمجھا' ان کا یہ خیال تھا کہ رزولیوشن وزیر ہند کے کئے ہوئے فیصلوں سے متعلق ہے۔ اس مسئلہ پر ریاست کا کیا نقطۂ نظر ہے اس کی یادداشت ابھی تک انھیں موصول نہیں ہوئی لیکن مسٹر کرسٹوفر بیرونی سے انھوں نے کچھ مباحث ضرور کئے ہیں جنھوں نے سراکبر کو بتلایا کہ میرا پیش کردہ استدلال لایعنی ہے اور حکومت ہند ثالثی کی دفعہ پر عمل کرنے کی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتی۔

میں نے کہا کہ حکومت ہند اور محکمۂ سیاسیات اس مشورہ کی ذمہ دار نہیں ہے جو حیدرآباد کو اس کے مشیروں نے دیا ہے۔ ۱۹۲۰ء کا رزولیوشن صاف اور صریح تھا۔ جیسا سراکبر حیدری نے اس کا مفہوم پیش کیا اس سے یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ اس کے مضمرات سے وہ واقف تھے اور اس میں وزیر ہند اور کسی ایسی ریاست کے مابین نزاعات کے تصفیہ کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ یہ چیز ناقابل فہم معلوم ہوتی ہے کہ گورنر جنرل کی جانب سے کسی کارروائی کے تصفیہ کے لئے جو ضابطہ مقرر کیا جائے

اس میں کسی ایسے مسئلہ کو جس کا تصفیہ ملک معظم کی حکومت نے بوساطت وزیر ہند کیا ہو، ثالثی کے سپرد کرنے کی گنجائش پیدا کی جائے۔

سر اکبر حیدری نے بتلایا کہ حکومت ہند کو دوستانہ طور پر انھیں یہ اشارہ کرنا چاہیئے تھا کہ ۱۹۲۰ء کے رزولیوشن میں جو طریقۂ کار بتلایا گیا ہے اس سے استفادہ کیا جائے میں نے کہا کہ اس کا فیصلہ تو حیدرآباد کو کرنا چاہیئے تھا کیونکہ حکومت ہند نے ان کے مطالبہ کو رد کر دیا تھا۔ وہ حکومت ہند سے ہرگز اس امر کی توقع نہیں کر سکتے کہ وزیر ہند کا دروازہ کھٹکھٹانے سے انھیں باز رکھا جاتا۔

اس پر سر اکبر حیدری نے کہا کہ حکومت ہند اس مسئلہ کو سپرد ثالثی کرنے کے متعلق وزیر ہند کے پاس تحریک پیش کرے۔ میں نے جواب دیا کہ وزیر ہند نے پہلے ہی اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے البتہ حیدرآباد نے آخر مرتبہ اس مسئلہ پر وزیر ہند کی خدمت میں جو درخواست پیش کی ہے اس پر وزیر ہند کے احکام کا انتظار ہے۔ لیکن حکومت ہند وزیر ہند کو یہ لکھنے سے قاصر ہے کہ ان کے فیصلہ سے حکومت ہند کو اختلاف ہے اور یہ کہ اس کے بہتر اور قابل اطمینان تصفیہ کے لئے اس کو کسی آزاد ٹریبونل کے حوالہ کیا جائے۔

میں نے سر اکبر کو یاد دلایا کہ حیدرآباد میں میں نے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر ان کے سامنے روشنی ڈالی تھی اور انھوں نے اس کے جواب میں مجھ سے کہا تھا کہ حیدرآباد آئندہ نزاعات میں کسی ایسے مسائل میں طریقۂ کار کو اختیار کرنے پر اکتفا کرے گا جو ۱۹۲۰ء کے رزولیوشن میں پیش کیا گیا ہے اس سے سر اکبر حیدری انکار نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کے باوجود وہ بادی النظر میں اس امید میں مبتلا ہیں کہ ۱۸۰۲ء کے معاہدہ کے متعلق حیدرآباد کے مطالبہ کو مکرر زندہ کیا جاسکے گا۔

میں نے سر اکبر کو یہ بھی یاد دلایا کہ خود انھوں نے حیدرآباد میں مجھ سے کہا تھا کہ

اگر مسئلہ ثالثی کے سپرد بھی ہوتا تو حیدر آباد کو اس مسئلہ میں کامیابی کا قطعی امکان نہ تھا۔ میں نے کہا کہ ان کے اس خیال سے میں نے بالکلیہ اتفاق کیا تھا اور بتلایا تھا کہ ایسی صورت میں حیدر آباد کی لاکھ میں ایک حصہ بھی کامیابی کی امید نہیں ہے۔ سرا کبر نے کہا تھا کہ کامیابی کے ایسے بعید امکان کو وہ تسلیم نہیں کرتے۔ اس پر میں نے ان سے پوچھا تھا کہ ان کے حساب سے حیدر آباد کو کامیابی کی کتنی توقع تھی جس پر انھوں نے اس قسم کے حسابی اعمال سے احتراز کرنے کو ترجیح دی تھی۔ اس کے بعد میں نے انھیں یاد دلایا کہ اپنے آخری مراسلہ میں انھوں نے لکھا تھا کہ مسئلہ اگر ثالثی کے سپرد ہوا اور اس میں حیدر آباد کامیاب بھی رہا تو وہ کسی ایسے حل کو قبول کر لیں گے جس سے مادی طور پر فریقین کے موجودہ مفادات اثر انداز نہ ہوتے ہوں۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ ایسی صورت میں ان کے ذہن میں کونسا حل موجود تھا۔ انہوں نے وہی جواب دیا جس کی مجھے توقع تھی کہ ابھی تک اس پر انھوں نے غور نہیں کیا۔ البتہ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ذرعات کے قطع نظر اگر دو اہم مطالبات تسلیم کر لئے جائیں تو حیدر آباد مطمئن ہو جائے گا۔

(۱) حکومت حیدر آباد کے اسٹور اور سامان کی درآمد پر برطانوی ہند کا بحری محصول کروڑگیری عاید نہ کیا جائے۔ لیکن سرا کبر کے ذہن میں جیسا کہ خود انھوں نے بیان کیا اس کی کیا صورت ہوگی، اور اس سے تخمینی طور پر کیا فائدہ حاصل ہوگا اس کا کوئی خاکہ نہیں ہے۔ البتہ ریلوے کی ضروریات اس کا اہم ایٹم ہے۔

(۲) حیدر آباد کے علاقہ میں درآمد ہونے والے مال پر بجائے پانچ فیصد برقیمت محصول عاید کرنے کے جیسا کہ حیدر آباد کے معاہدہ میں درج ہے کسی بھی شرح پر محصول لگانے کا اختیار۔

(شرحد ستخط) بی۔ جے گلانسی)

(۳)

۳ر دسمبر ۱۹۳۸ء — انتہائی راز

مائی ڈیر گلانسی

نظام سے اپنی پہلی ملاقات مورخہ ۲۷ر نومبر کے وقت مجھے یہ دریافت کرنے کا موقع ملا تھا کہ فخر یار جنگ کے رخصت بیماری حاصل کرنے کی صورت میں کونسل کی عارضی نشست کے پُر کرنے کے لئے کونسی تجاویز زیر غور ہیں اس کے جواب میں مجھ سے کہا گیا کہ ممکن ہے فخر یار جنگ کو بجائے رخصت کے پونہ میں آرام کرنے کا موقع دے کر وہیں سے اپنا کام انجام دینے کی سہولت مہیا کی جائے۔ علاوہ ازیں مستقل تقررات کے برخلاف ایسے عارضی انتظام کے لئے رزیڈنٹ کی منظوری کی ضرورت نہ ہونا بتلایا گیا اور اس رائے سے اختلاف کی صورت میں اس مسئلہ پر ہز اکسلنسی وائسرائے سے استمزاج کرنے کا مشورہ دیا گیا۔

نظام کے اس جواب نے مجھے حیرت میں ڈال دیا اور چونکہ مجھے اپنے صحیح موقف کا یقین نہیں تھا اس لئے میں نے اس مسئلہ میں مزید گفتگو کو جاری رکھنا نامناسب سمجھا۔ رزیڈنسی واپس آنے کے بعد مجھے ریکارڈ دیکھنے کے بعد پتہ چلا کہ سابق میں کونسل کے عارضی تقررات کے مسئلہ پر دو مرتبہ نظام نے رزیڈنٹ سے بحث کی تھی۔

پہلی مرتبہ نواب فخر یار جنگ کے عارضی تقرر کا مسئلہ تھا جب نواب لطف الدولہ علاج کی غرض سے یورپ گئے تھے۔ جب میکنزی نے سُنا کہ لطف الدولہ رخصت پر جارہے ہیں تو انھوں نے نظام کو یہ لکھا :-

”میں نے سُنا ہے کہ عنقریب نواب لطف الدولہ طبی مشورہ کی بناء پر انگلستان جارہے ہیں اور یور اگزالٹیڈ ہائی نس بلاشبہ ان کی عدم موجودگی میں دوسرے انتظام پر غور فرما رہے ہوں گے۔ کیا میں یہ توقع کرسکتا ہوں کہ ہماری آئندہ گفتگو کا یہ بھی ایک

موضوع رہے گا۔"

اس استفسار پر نظام نے یہ جواب دیا کہ لطف الدولہ کی جگہ ذوالقدر جنگ کو مقرر کرنا چاہیئے۔ اپنے مراسلہ کے خاتمہ پر انھوں نے تحریر کیا:- "بہرکیف بتاریخ ۲۲ر نومبر آئندہ گفتگو کے موقع پر ہم اس موضوع پر بحث کریں گے۔ اس اثناء میں آپ کے غور کے لئے میں نے یہ تجویز پیش کی ہے۔"

اس گفتگو کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ محکمہ سیاسیات کی ہدایات کی بناء پر لطف الدولہ کی جگہ فخر یار جنگ کو مقرر کیا گیا۔

دوسری مرتبہ نواب لطف الدولہ کے انتقال پر یہ مسئلہ پھر اٹھا تھا۔ اس زمانہ میں رزیڈنٹ کا قیام اوٹی میں تھا جن کو نظام نے حسب ذیل برقی تار روانہ کیا تھا:-

"ابھی ابھی لطف الدولہ کی حالت نازک ہونے کا علم ہوا اور میں سمجھتا ہوں ان کا جہاز بمبئی پہنچنے کے پہلے ہی شاید ان کا انتقال ہوجائے۔ جہاز کی یکم اپریل کو بمبئی پہنچنے کی توقع ہے۔ اگر ان کی موت واقع ہوجائے تو ان کی جگہ میں چیف جسٹس کو ختم سال تک کے لئے وزیر قانون مقرر کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کے رخصت سے واپسی کے بعد میں مستقل انتظام کرسکوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری تجویز کو قبول اور حکومت ہند سے اس کی منظوری بھی حاصل کریں گے۔"

اس کے جواب میں میکنزی نے ذریعہ تار جواب دیا:- "میں حکومت ہند کو مجوزہ انتظام کے متعلق اطلاع دے رہا ہوں جس سے مجھے اتفاق ہے۔"

نظام نے میری پہلی ملاقات پر جو طرز عمل اختیار کیا اس سے اصول کا ایک اہم سوال پیدا ہوگیا ہے اور عارضی تقررات کے مسئلہ میں میں ان کے بیان کو چیلنج کرنا چاہتا ہوں۔ اپنا ریکارڈ دیکھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ نظام نے ایک نئے رزیڈنٹ کو اس کی ناواقفیت کی بناء پر دبوچنے کی کوشش کی ہے اور اگر یہ حرکت دانستہ کی گئی ہے

تو میں اس مسئلہ کا نظام سے قطعی تصفیہ ہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ لیکن اس کے قبل اپنے موقف کو مضبوط کرنے کے لئے میں نے آپ سے استمزاج کرنا مناسب تصور کیا۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ جب کبھی کسی مسئلہ میں مجھ شک ہوتا ہے تو نظام مجھے اس طرح ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ "ہاں یہ بات ایسی ہی تھی اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ رزیڈنٹ سے اس پر بحث بھی ہوئی ہے لیکن بحث کرنے کے لئے پہلی مرتبہ رزیڈنٹ نے تحریک کی تھی اور میں نے اپنی آمادگی کا اظہار کیا تھا لیکن دوسری مرتبہ میں نے اپنے طور پر رزیڈنٹ سے بحث کی تھی۔ مگر اس کا یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ اس قسم کے عارضی تقررات کے لئے میں رزیڈنٹ سے بحث کرنے پر پابند ہوں۔ میں سمجھتا ہوں مجھ پر ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔"

ان حالات کے مدنظر یہ بہت ضروری ہوگیا ہے کہ میں اس بنیاد ہی کو ڈھا دوں جس پر نظام نے عمارت تعمیر کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ میری مشکلات کو محسوس کرکے میرے موقف کو مضبوط کرنے کی آپ سعی کریں گے۔ براہ کرم اس معاملہ میں ہز اکسلنسی کا حکم حاصل فرمایئے۔ آپ کا جواب وصول ہونے کے بعد میں نظام سے کہوں گا کہ میں نے اس مسئلہ میں ہز اکسلنسی سے رولنگ (فیصلہ) حاصل کرلی ہے جس کے بعد پھر مزید ناگوار مباحث کی نوبت نہیں آئے گی۔

میرا یہ بتلانا شاید غیر ضروری ہے کہ اگر کونسل کے عارضی تقررات کے مسئلہ کو بالکلیہ نظام اور ان کی کونسل کے مابین تصفیہ طلب تسلیم کرلیا جائے اور اس میں رزیڈنٹ کی منظوری کی ضرورت محسوس نہ کی جائے تو اس سے ناخوشگوار نتائج برآمد ہوں گے۔ ایسی صورت میں نظام اپنی اغراض کے تحت ان تقررات میں ایسی توسیع کرتے رہیں گے کہ وہ مستقل انتظام کے مساوی بن جائیں گے اور مستقل انتظامات کے لئے منظوری حاصل نہ کرنے کی وجہ موجہ پیدا ہو جائے گی۔ ساتھ ہی نظام کے

مشیر اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایسے شخص کا تقرر منظور کریں گے جو رزیڈنٹ کے لئے قابل قبول نہ ہو اور بعض صورتوں میں کونسل کے لئے بھی جس کی آواز میں رزیڈنٹ کی حمایت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے اعتراض کرنے کی قوت باقی نہیں رہے گی۔

کیا میں اس مسئلہ میں اگر ممکن ہو تار کے ذریعہ آپ کے جواب کا انتظار کروں۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ نظام کی تجویز سے مجھے اتفاق نہیں ہے کہ فخر یار جنگ کو تین ماہ کے لئے پونہ میں آرام کرنے کی اجازت دے کر اُن سے کام لیا جائے۔ یہ انتظام قابل عمل نہیں ہوگا۔

(شرحد دستخط) جی ۔ ایچ گڈنی
(رزیڈنٹ)

پولیٹیکل سکریٹری کا جوابی تار

ہاں تم نے جو لکھا ٹھیک ہے۔ چونکہ نظام نے زبانی اس مسئلہ کو اٹھایا تھا اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی آئندہ ملاقات پر اپنا فیصلہ زبانی ہی سنائیں۔

۴

۳ر جنوری ۱۹۳۹ء　　　　انتہائی راز

گذشتہ ۱۸ر دسمبر کی ملاقات پر میں نے نظام سے اس مسئلہ میں گفتگو کی اور یہ کہتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے کہ ہم کو اس سلسلہ میں سخت قدم اٹھانے کی ضرورت درپیش نہیں ہوئی اور اس مسئلہ کا اطمینان بخش طریقہ سے تصفیہ ہوگیا۔

عارضی تقررات کے مسئلہ میں نظام کے ذہن میں انتشار تھا وہ سمجھتے تھے کہ ایڈمنسٹریشن کا کام بغیر کسی عارضی انتظام کے بھی چل سکتا ہے۔ میں نے بتلایا کہ یہ ناممکن ہے۔ انھوں نے فوراً غلط فہمی کی اصلاح کر لی اور ہمارا آپس میں سمجھوتہ ہوگیا۔ اب یہ طے شدہ ہے کہ

نظام موجودہ انتظام کو برقرار رکھیں گے اور آئندہ اعتراضات نہیں کریں گے۔ انھوں نے اب اس تجویز کو بھی ترک کر دیا ہے کہ فخر یار جنگ کو پونہ میں آرام کا موقع دیا جائے اور ان کی عدم موجودگی میں مہدی یار جنگ وزیر فینانس کا کام انجام دیں گے۔

—— ۵ ——

مورخہ ۳ ر اگست ۱۹۳۸ء — راز

مقدمہ :- حیدر آباد کونسل کے تقررات

مائی ڈیر گلانسی

حوالہ کے لئے براہِ کرم میری نیم سرکاری نشان ۱۳۸۹-سی مورخہ ۳۰ ر نومبر ۱۹۳۷ء ملاحظہ ہو۔ نواب ظہیر الدین خان خلف نواب معین الدولہ کو کونسل کی رکنیت پر مقرر کرنے کے لئے نواب موصوف سے حال ہی میں میری گفتگو ہوئی۔ گذشتہ چند دنوں میں ظہیر الدین سے ملنے کے مجھے متعدد مواقع ملے اور میں ان سے بہت متاثر ہوا۔ ساتھ ہی میری یہ رائے ہے کہ نواب مرزا یار جنگ کی موجودہ توسیع کے ختم ہونے کے بعد اتنی اہم خدمت کے لئے وہ ابھی کچھ نوعمر اور ناتجربہ کار سے ہیں۔ بڑی بدبختی ہو جائے گی کہ کم عمری میں اتنی اعلیٰ خدمت پر مامور ہونے کے بعد اُن سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو زمانۂ آئندہ میں ان کی شہرت متاثر ہو جائے گی۔ نظام کے علم میں بلا شبہ ایسے واقعات ہیں جن میں اس قسم کی صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ ظہیر الدین کو کونسل میں لینے کی بجائے اس سے کمتر خدمت جیسے معتمدی پر ان کو کیوں نہ آزمایا جائے ؟

نظام نے میرے ان خیالات سے اتفاق کیا کہ انھیں ایسی خدمت پر لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس اثنا میں اس مشکل کا کوئی حل دریافت نہ ہو سکا جس پر ہمیشہ بحث ہوتی رہی کہ کونسل کی سُنّی رکن کی خالی نشست پر کس موزوں سُنی رکن کا انتخاب کیا جائے۔

نظام نے اس مسئلہ میں حیدری سے گفتگو کرنے کا مجھے مشورہ دیا اور بہت جلد میں ان سے ملوں گا۔

دو ایک حلقوں سے مجھے یہ رپورٹیں ملی ہیں کہ کونسل کی رکنیت کے لئے ظہیرالدین بہت کم عمر ہیں اور اس کے لئے انھیں مزید تین چار سال انتظار کرنا چاہئے۔ میری بھی یہی رائے ہے۔

(شرح دستخط) ڈی جی میکنزی
(رزیڈنٹ)

— ۶ —

مائی ڈیر گلانسی

میری رازکی نیم سرکاری مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۳۸ء کے ملاحظہ سے ظاہر ہوگا کہ راجہ شام راج کو ابتداءً تین سال کے لئے کونسل کی رکنیت پر مقرر کیا گیا تھا۔ نظام نے گذشتہ ملاقات پر بتلایا کہ وہ راجہ کے کام سے بالکل مطمئن ہیں اور ان کو مزید دو سال کے لئے رکھنے کی تجویز ہے۔

چونکہ نظام اور مجھ کو اس مسئلہ پر اتفاق ہے اس لئے اس توسیع ملازمت کے لئے ہز اکسلنسی (وائسرائے) سے رسمی منظوری حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اطلاعاً یہ چیز عرض ہے۔

(شرح دستخط) ڈی جی میکنزی
(رزیڈنٹ)

اشاریہ

الف

ب

گ

ل

م

ن

و

ہ

کتابیہ

١۔ قائد ملت (بہادر یار جنگ) از غلام محمد
٢۔ سیاسی تقاریر بہادر یار جنگ
٣۔ دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ کے تعلقات از سید ابو الاعلیٰ مودودی
٤۔ تاریخ اتحاد المسلمین از عبدالقدوس ہاشمی
٥۔ حیدرآباد کے آئینی اصلاحات از احمد عارف
٦۔ مشاہدات از ہوش بلگرامی۔
٧۔ سیاسی کہانی از غلام پنجتن
٨۔ اتحاد المسلمین کے قائدین از مرزا امام بیگ رونق
٩۔ حیدرآباد میں آریہ سماجی تحریک شائع کردہ حکومت حیدرآباد
١٠۔ رئیس سے راج پرکھ از تارا پور
١١۔ رسائل اور اخبارات

1. The Case of Hyderabad in UNO
   By Moin Nawaz Jung.
2. The Integration of Indian States by V.P. Menon.
3. The End of an Era by K. M. Munshi.
4. Hyderabad in Retrospect by Ali Yawar Jung.
5. Mission with Mountbatten by Campbell Johnson.
6. Kingdoms of Yesterday by Sir Arthur Lothian.
7. My Public Life by Sir Mirza Ismail.
8. Fabulous Moghul by D.F. Karaka.
9. The Indian States by C.K. Nair.
10. Hindus in Hyderabad by Syed Mohd. Ahsan.
11. Tragedy of Hyderabad by Mir Laik Ali.

مصنف جامعہ عثمانیہ کے
فارغ التحصیل اور حیدرآباد
کی سیاست میں ایک ممتاز
حیثیت کے حامل رہے ہیں -
"قائد ملت (بہادریار
جنگ رح) آپ ک
اتحادالمسلمین میں
بلاک کا لیڈر تصور فرماتے
تھے - نوجوانوں کا نقطہ نظر
آپ ہمیشہ مجلس کے آگے پیش
کرتے رہے ہیں - - - -
اصلاح نظم و نسق کے سلسلہ
میں آپ قائد ملت کے زبردست
معاون رہے ہیں - اپنے
بے لاگ کردار کے باعث
عثمانی برادری میں "ننگی
تلوار" کے نام سے بھی مشہور
ہیں - - - - -"
"س از " اتحادی "

ملنے کے پتے :-

(۱) اردو اکیڈمی سندھ

مولوی مسافرخانہ ۔ بندر روڈ کراچی

(۲) گلڈ انجمن کتاب گھر

صدر کوآپریٹو مارکیٹ ۔ کراچی

(۳) بک کارپوریشن

آرام باغ روڈ ۔ کراچی

(۴) اقبال بک ڈپو

سمرسٹ اسٹریٹ صدر ۔ کراچی